''چہارسُو''

..... راہ نمائے سخن .....

اپنی اُجلی اور دلکش شخصیت کی مانند ڈاکٹر ریاض احمد صاحب کی تخلیقی وتصوراتی اُٹھان نہایت نقدی، شفاف اور ایسی بل کھاتی ندی کی طرح رواں دواں جس کی تہہ میں پڑے کنکر اور چھوٹے چھوٹے سنگ ریزے بھی پوری آب وتاب کے ساتھ فطرت کی کاریگری سے پردہ سرکا کر انسان کو محوِ حیرت کرتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب چونکہ میڈیکل سائنس کے طالب علم ہیں لہٰذا کارخانہ قدرت کے بھیدوں کو تحقیق وجستجو کے نشتر سے کریدنا اُن کو خاصہ مرغوب ہے۔ اسی لیے موصوف نے روایتی شاعری سے ہٹ کر نئی راہوں، نئی منزلوں کی سرگردانی اختیار کی اور بڑے راسخ عزم وحوصلے، خلوص اور ذاتی مشاہدات ومطالعہ کو بروئے کار لاتے ہوئے نت نئے موضوعات و عنوانات کے تحت اپنے پاکیزہ ومنزّہ خیالات کو قلمی مہارت کے ذریعے قرطاس پر منتقل کر کے قارئین کے سامنے پیش کیا۔ عشق ومحبت، وصل وفراق، مسرت وغم ان سب کا تعلق انسانی کیفیات سے ہے جو ہماری روایتی شاعری کا جزو لازم ہیں لیکن بگ بینگ، جنت کی حقیقت وطلب، پیکرِ خاکی کی تجسیم، روح کی ماہیت، تخلیقِ کائنات جیسے پیچیدہ گنجلک موضوعات پر قلم اُٹھانا ان کا منفرد وممتاز کارنامہ ہے۔ محبت ایک آفاقی حقیقت ہے۔ انسانی رشتوں کے بغیر یہ خاکی وجود سراسر ناممکن ہے۔ یہی انمول بندھن سماج کی تشکیل کے لیے اساس مہیا کرتا ہے۔ اخلاقیات اکیلے شخص سے لے کر پوری قوم کی تہذیبی، تمدنی اور روحانی زندگی کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ ان اہم ایشوز پر ڈاکٹر صاحب نے سیر حاصل اور پُر اثر طور پر قلم چلایا ہے۔ علاوہ ازیں فلکیات، سماجیات، مابعد از طبیعیات اور کہکشاؤں پر فکری وتصوراتی کمندیں ڈال کر علامہ اقبالؒ کے اُن جوانوں سے تعلق کا ثبوت فراہم کیا ہے جن سے اُن کو بے حد محبت تھی۔ ڈاکٹر ریاض احمد صاحب نے بڑی کامیابی اور کمال بصیرت سے ان ثقیل اور غور طلب گتھیوں کی کھوج میں قدم بڑھایا ہے۔ محبت بارے رقم طراز ہیں:

شمع جلتی ہے تو پروانے کھنچے آتے ہیں — پَر جلاتے ہیں وہ مرجاتے ہیں بعد کڑاہیں
جو داستانِ محبت تھی، آج ختم ہوئی — آ و ذرا، کہ حالِ محبت تمہیں سنائیں

نظم ''روح کا سفر'' کا انتہائی فکر انگیز شعر:

وہ نفس جس کا حکمراں ہو ضمیر! ہر فلاح اس کے ہاتھ آئی ہے

ڈاکٹر ریاض احمد طبعًا رومانٹک شخص ہیں۔ عشق ومحبت کی باتیں بھی بڑے سلیقے اور شائستگی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ نظم ''دل کی دنیا'' میں فرماتے ہیں:

دل کی دنیا بسی تیرے دم سے — تو جو روٹھے تو دَم نکل جائے!
تیری چاہت میں ہم رہے گرداں — دل تیرا جانے کب پگھل جائے!

احمد فراز کے آہنگ میں ''حسرتِ دل'' بڑی عمدہ نظم ہے:

جذبہ ایثار ومحبت ہے سکوں کا زم زم! — ہائے اس راز کو پالیتے وہ، جاتے جاتے
بے وفا چھوڑ گئے یادیں حسیں لمحوں کی — حمد اک چاہیے ان یادوں کو جاتے جاتے

مرزا غالب کے رنگ میں رنگی ''داستانِ حسرت'' کا پہلا خوبصورت شعر ہے کہ:

میرا حالِ دل نہ پوچھو کہ مناؤں کیسے ہمدم!
نہ گلے اُنہیں لگاتے، نہ ہی دل فگار ہوتا

مجموعی طور پر ''راہ نمائے سخن'' معاصر اردو شاعری میں تازہ ہوا کے جھونکے کی مانند وارد ہوئی یہ کتاب اردو ادب میں دلچسپ وبامقصد اضافہ ہے۔ اپنی جدّت، سادگیِ اسلوب اور بے ساختگی قاری کو سرشار وسرمست کرنے میں معاون ہیں۔ اُمید کے ساتھ دعا گو ہوں کہ تشنگانِ ادب دل ودماغ کو سیراب کریں گے اور رب العزت سچی لگن سے تحریر کردہ اس ادب پارے کو پذیرائی عطا فرمائیں گے۔

..... نیّر اقبال علوی

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۳۰،شمارہ:ستمبر اکتوبر ۲۰۲۱ء

بانی مدیراعلیٰ

سید ضمیر جعفری

مدیرمسؤل

گلزار جاوید

○☆○

مدیرانِ معاون

بینا جاوید

فاری شا

محمد انعام الحق

عروب شاہد

آمنہ علی

مجلسِ مشاورت

○☆○

قارئینِ چہارسُو

○☆○

زرِسالانہ

○☆○

دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ

رابطہ:537/D-1‘ گلی نمبر18، ویسٹریج-III‘ راولپنڈی،46000، پاکستان۔

فون:(+92)-51-8730633-8730433

موبائل:(+92)-336-0558618

ای۔میل:chaharsu@gmail.com

۔ ویب سائٹ ۔

http://chaharsu.wordpress.com

پرنٹر: فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

متاعِ چہارسو

سرِ ورق، پسِ ورق ------- شعیب حیدر زیدی
تزئین ---------------- عظمیٰ رشید
کمپوزنگ ---------------- تنویر الحق

قرطاسِ اعزاز ۵

خدوخالِ بقا ------------ محمد انعام الحق ۶
مقامِ شکر -------------- یاسمین حمید ۸
طرزِ احساس کی تبدیلیاں -------- یاسمین حمید ۹
براہِ راست -------------- گلزار جاوید ۱۶
شرارِ عشق -------------- عطیہ سکندر علی ۲۴
پسِ ابلاغ -------------- احمد ندیم قاسمی ۲۸
خلاّقیت سے معمور شاعری --- شمس الرحمٰن فاروقی ۳۰
حصارِ بے درودیوار ----------- شہزاد احمد ۳۱
خوشیوں کا گھر --------- پروفیسر سحر انصاری ۳۲
ماورائے درودیوار ---------- امجد اسلام امجد ۳۳
ہم دو زمانوں میں پیدا ہوئے --- ابوالکلام قاسمی ۳۴
ہجر کا التزام ------------- عذرا عباس ۳۶
نرم ہَوا کی دستک ----------- آفتاب حسین ۳۷
وحشت کا کنارا ----------- ڈاکٹر نجیبہ عارف ۳۹
بے ثمر پیڑوں کی خواہش --------- زاہد حسن ۴۳
دکھ کے علاقے کی تقسیم --------- مبین مرزا ۴۷
حقیقتوں کے سامنے ---------- محمد حمید شاہد ۴۹
گمنام لوگوں کی باتیں ---------- ارفعہ افتخار ۵۱

افسانے

حسن لاج ------------ شہناز خانم عابدی ۵۶
فتح کے ٹوٹتے کنارے -------- جمیل احمد عدیل ۶۰
زندہ آتما ------------- ڈاکٹر ذاکر فیضی ۶۴
نئی صدی کا کربلا -------- ڈاکٹر صوفیہ شیریں ۶۷
نئی کھڑکی --------------- رعنا کوثر ۶۹

قربِ قیامت

خمار بارہ بنکوی، عبداللہ جاوید، نواز دیوبندی، سلیمان خمار، جاوید زیدی، آفتاب مضطر، بشیر احمد بشیر، عبد القادر تاباں، اشرف جاوید، فیصل عظیم۔ ۷۱

افسانے

ایک پلیٹ بریانی اور ایک کپ کوفی --- امجد طفیل ۷۶
دخمہ کے گدھ -------------- ایم مبین ۷۸
اوس میں بھیگتی لڑکی ---------- رومانہ رومی ۸۱
فاصلے اور دُوریاں ---------- شاہینہ یوسف ۸۲
افسانچے --------------- نعیمہ جعفری ۸۴

دائمی نقش نگار

ڈاکٹر ریاض احمد، احمد سراج فاروقی، انیس الرحمٰن، جاناں ملک، ذکی طارق، انجم جاوید، ملک زادہ جاوید، ارشد سعید، اشفاق اساتھی، احمد سوز، ارشد مرشد، اوصاف شیخ، نبیل احمد نبیل، احسان گھمن، رئیس صدیقی۔ ۸۵

ناول

خاکِ شفا ------------ پیرزادہ آلِ انوار ۹۰

سفرنامہ

برطانیہ سے جاپان --------- یعقوب نظامی ۹۴

خانانِ خان، یوسف خان

مشیر طالب، پروین شیر، یوگیندر بہل تشنہ، پرویز مظفر، جاوید زیدی، نوید سروش، پروفیسر طرزی۔ ۹۸

دنیا میرے آگے

ہارمونز -------------- تابش خانزادہ ۱۰۳
عالم بدحواسی --------- ڈاکٹر رئیس فاضل ۱۰۴

آئینۂ فن

اچھوتا موضوع انوکھا ناول ------ رؤف خیر ۱۰۶
تیری غزلوں کا سکّہ ---------- تصور اقبال ۱۰۸

نشانِ راہ

جن کے سینوں میں آگ جلتی ہے --- کامل احمر ۱۱۰

ایک صدی کا قصہ

کامنی کوشل ------------ دیپک کنول ۱۱۲

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین --------- وجیہہ الوقار ۱۱۶

☆

قرطاسِ

اعزاز

محترمہ

یاسمین

حمید

کے

نام

اتفاقاتِ زمانہ ہیں طلب کچھ بھی نہیں
یہاں ملنے کا بچھڑنے کا سبب کچھ بھی نہیں

ایک کیفیتِ دل ہے جو بدل جاتی ہے
پہلے اس کا بھی کوئی نام تھا اب کچھ بھی نہیں

شہرِ نو طرز میں جذبے کی علامات نئی
غم کی تہذیب نہ آثارِ طرب کچھ بھی نہیں

وقت کا کون سا قریہ ہے جہاں پر میں ہوں
دن کی تفہیم نہ اندازۂ شب کچھ بھی نہیں

آنکھ پھر شائبۂ اصل میں کیا ڈھونڈتی ہے
آنکھ کیا دیکھنے میں محو ہے جب کچھ بھی نہیں

دل گرفتہ ہیں مگر اس کا سبب پوچھیں تو
یک زباں ہو کے یہی کہتے ہیں سب کچھ بھی نہیں

(یاسمین حمید)

خدوخالِ بقا

محمد انعام الحق

(اسلام آباد)

یاسمین حمید کا ادب، فنون اور تعلیم و تدریس کے شعبوں میں ۳۵ سال سے زیادہ کا تجربہ ہے۔ وہ لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز (LUMS) کے سوشل سائنسز کے شعبے میں گرمانی مرکزِ زبان وادب کی بانی ڈائریکٹر تھیں۔ شعبۂ ادب میں ان کی بنیادی پہچان ان کی اُردو شاعری کے پانچ مجموعے ہیں جو ۱۹۸۸، ۱۹۹۱، ۱۹۹۶، ۲۰۰۱ اور ۲۰۱۲ میں شائع ہوئے۔ انھوں نے عصری اُردو شاعری کے انگریزی تراجم کیے جو ۲۰۱۰ میں کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ انھوں نے اکادمی ادبیات پاکستان سے انگریزی میں شائع ہونے والے پاکستانی ادب کے مجلّے کی ادارت بھی کی ہے۔ حکومتِ پاکستان کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والے کلچرل، فیشن شوز کے لیے اُردو اور انگریزی زبانوں میں سکرپٹ تحریر کیے ہیں اور ڈان اخبار کے ہفتہ وار صفحات 'بکس اینڈ آتھرز' میں ترجمے پر مبنی ماہانہ کالم بھی لکھا۔ ڈی ایچ اے لاہور میں لاہور ایلما اسکول قائم کیا۔ مزید برآں انھوں نے پاکستان ٹیلی ویژن پر متعدد نامور پاکستانی ادبی شخصیات کے انٹرویو کیے اور قومی اور بین الاقوامی سطح پر کانفرنسوں اور مشاعروں میں وسیع پیمانے پر شرکت کی ہے۔

تعلیم:

ایم ایس سی۔ نیوٹریشن: ہوم اکنامکس کالج، پنجاب یونیورسٹی لاہور (۱۹۷۲)

بی ایس سی: ہوم اکنامکس کالج لاہور (۱۹۷۰)

تحقیق:

گندم کے آٹے کی دیسی پروٹین وسائل کے ذریعے غذائیت میں بہتری اور اضافے کے امکانات پر کیمیائی تجزیے اور جانوروں پر تجربات کی مدد سے تحقیق اور نئی تیار شدہ غذا کی جانچ۔ یہ تحقیق پی سی ایس آئی آر (PCSIR) لیبارٹریز لاہور میں کی گئی۔

ایم ایس سی میں لیے گئے دیگر مضامین:

Educational Psychology

Human Development

Methods of Research

Textiles

تعلیمی امتیازات:

ایم ایس سی کے امتحان میں اوّل پوزیشن (۱۹۷۲)

پنجاب یونیورسٹی لاہور سے گولڈ میڈل (۱۹۷۲)

کالج کی طرف سے Roll of Honour (۱۹۷۲)

بی ایس سی میں دوسری پوزیشن (۱۹۷۰)

بہترین آل راؤنڈ سٹوڈنٹ ایوارڈ (۱۹۷۰)

قومی سطح پر ہونے والے مباحثوں اور موسیقی کے مقابلوں میں شمولیت اور انعامات۔

مغربی اور مشرقی پاکستان کے مابین ۱۹۶۹ کے Student Exchange Programme کے لیے منتخب کیا گیا۔

پیشہ ورانہ تجربہ:

اگست ۲۰۰۷ میں لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز (LUMS) میں بطور Writer in residence (اُردو ادب) شمولیت اختیار کی۔ وہ گرمانی مرکزِ زبان وادب کی بانی ڈائریکٹر بھی تھیں جسے LUMS کے School of Humanities and Social Sciences میں ۲۰۱۰ء میں قائم کیا گیا۔ انھوں نے مرکز کا تدریسی پروگرام وضع کیا اور اس کی نگرانی کی۔ مزید یہ کہ کانفرنسوں، سیمناروں، ورکشاپ، لیکچر اور علمی و ادبی نشستوں کا اہتمام کیا، جن کا مقصد LUMS میں اور یونیورسٹی کے باہر بھی جنوبی ایشیائی زبانوں، خصوصاً اُردو کو فروغ دینا تھا۔ انھوں نے اُردو کے تحقیقی مجلّے 'بنیاد' کی اشاعت کی نگرانی کی اور گرمانی مرکز کی مزید اشاعتوں کی بھی نگران رہیں۔ انھوں نے بی ایس سی کے طلبا کے لیے اُردو ادب کے کورس وضع کیے اور انھیں پڑھایا بھی۔ وہ اگست ۲۰۱۶ تک (۹ برس) LUMS سے وابستہ رہیں۔

۱۹۸۶ میں ڈی ایچ اے لاہور میں The Lahore Alma School قائم کیا۔ تاحال اس کی مالک اور ڈائریکٹر ہیں۔ یہ ایک جدید اسکول سسٹم ہے جس میں ۳ برس سے لے کر ۱۸ برس کی عمر کے بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ 'O' اور 'A' لیول کے لیے یہ اسکول کیمرج یونیورسٹی (برطانیہ) کے ساتھ منسلک ہے۔ اسکول میں تقریباً ۸۰۰ طالب علم تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

ویب سائٹ

https//www.yasmeenhameed.com

تصانیف:

۱۔	پسِ آئینہ (اُردو شاعری)	۱۹۸۸
۲۔	حصارِ بے در و دیوار (اُردو شاعری)	۱۹۹۱
۳۔	آدھا دن اور آدھی رات (اُردو شاعری)	۱۹۹۶
۴۔	فنا بھی ایک سراب (اُردو شاعری)	۲۰۰۱
۵۔	دوسری زندگی (شاعری: چار کتابوں کا مجموعہ)	۲۰۰۷
۶۔	بے ثمر پیڑوں کی خواہش (اُردو شاعری)	۲۰۱۲
۷۔	ہم دو زمانوں میں پیدا ہوئے (شعری: انتخاب)	۲۰۱۸
۸۔	An Anthology Pakistani Urdu Verse (انگریزی ترجمہ جدید نظم)	۲۰۱۰
۹۔	Daybreak: Writings on Faiz (انگریزی: مرتبہ)	۲۰۱۳
۱۰۔	نیا اُردو افسانہ (مرتبہ)	۲۰۱۰

یاسمین حمید کی شاعری کے تراجم:

۱۔ Granta 112 Special Isssue: Pakistan ۲۰۱۰
(London UK)انگریزی ترجمہ: وقاص خواجہ

۲۔ Modern Poetry of Pakistan (USA) ۲۰۱۰
انگریزی ترجمہ: وقاص خواجہ

۳۔ tlanta Review Pakistan (USA) ۲۰۱۴
انگریزی ترجمہ

۴۔ ThreeContemporaryArtists(PU Lahore) ۲۰۱۹
انگریزی ترجمہ: عفت سعید

۵۔ Still we Sing - An Anthology of Poetry: ۲۰۲۰
South Asian Women انگریزی ترجمہ

۶۔ Poetry at Sangam انگریزی ترجمہ ۲۰۲۱ء

یاسمین حمید بطور مترجم:

۱۔ اکادمی ادبیات کے Pakistani Literature کے شماروں کے لیے اُردو شاعری اور فکشن کا ترجمہ

۲۔ عذرا عباس کی طویل نظم نیند کی مسافتیں ں کا انگریزی ترجمہ۔اشاعت ۱۹۹۸

۳۔ انگریزی شاعری کے اُردو میں تراجم۔خواتین خاص شمارہ اکادمی ادبیات پاکستان ۲۰۰۲

۴۔ افتخار عارف کی نو(۹) نظمیں Written in the Season of Fear اشاعت ۲۰۰۳

۵۔ فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، شبنم شکیل اور پروین شاکر کی گیارہ(۱۱) نظمیں

۶۔ Modern Poetry of Pakistan USA اشاعت ۲۰۱۰

ادارت:

مہمان مدیر Pakistani Literature (انگریزی) اکادمی ادبیات پاکستان

شمارہ ۳(۲)	۱۹۹۴	(۳۲۷ صفحات)
شمارہ ۷(۲)	۲۰۰۲	(۶۴۹ صفحات)
شمارہ ۸(۲)	۲۰۰۴	(۳۰۵ صفحات)
شمارہ ۹(۲) شمارہ ۱۰(۱) شمارہ ۱۰(۲)	۲۰۰۵	(۷۸۰ صفحات)
خاص شمارہ (خواتین) ۱۲۔۰۸۱۳۔	۲۰۰۷	(۵۸۰ صفحات)

بنیاد (LUMS) ۲۰۱۰

شریک مدیر۔ ن م راشد نمبر (شمارہ ۱) ۲۰۱۵

نگران شمارہ ۴۔۲۰۱۳، شمارہ ۵۔۲۰۱۴، شمارہ ۶۔ ۲۰۱۷

شریک مدیر شمارہ ۸۔

شعری کالم Poetic Justice

دسمبر ۲۰۰۴ سے جون ۲۰۰۷ تک روزنامہ ڈان کے Books & Authors میں ماہانہ کالم جس کے ذریعے اُردو نظم نگاروں کا ترجمہ اور تعارف شائع ہوا۔

اسکرپٹ:

وزیراعظم بے نظیر بھٹو کے سرکاری دورے کے دوران حکومتِ پاکستان کے زیر اہتمام ثقافتی / فیشن شو کے انگریزیمیں سکرپٹ تحریر کیے جنھیں ۱۹۹۵ میں Symphony of Seasons کے نام سے لندن اور واشنگٹن میں پیش کیا گیا۔

پاکستان میں ورلڈ کپ ۱۹۹۶ کرکٹ فیسٹیول کے دوران ثقافتی پرفارمنس کے لیے سکرپٹ اور شاعری قومی پی ٹی وی ایوارڈ اسلام آباد ۲۰۰۴ کی تقریب میں ٹیبلو کے لیے سکرپٹ اور شاعری ۲

ادبی ایوارڈ کے مصنفین کے پینل کی رکن:

قومی پطرس بخاری ایوارڈ

قومی محمد حسن عسکری ایوارڈ

نیشنل بینک آف پاکستان ادبی ایوارڈ

PEN پاکستان سنٹر (PENPC) ادبی ایوارڈ

ٹیلی ویژن پروگرام:

پاکستان ٹیلی ویژن کے ۱۹۹۳ میں موسیقی کے پروگرام بلسلہ 'فن اور فن کار' کی میزبانی۔

پاکستان ٹیلی ویژن کے پروگرام 'مخزن' کے لیے ممتاز مفتی، احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین، اشفاق احمد اور ضمیر جعفری کے انٹرویو۔

مشاعروں اور ادبی پروگرامز میں شرکت:

قومی اور بین الاقوامی سطح پر مشاعروں میں شرکت

قومی اور بین الاقوامی سطح پر کانفرنسوں اور سیمناروں میں شرکت

ادبی پروگراموں اور ٹاک شوز میں شرکت

اعزازات:

تمغۂ امتیاز برائے ادبیات	(۲۰۰۸)
فاطمہ جناح میڈل برائے ادبیات	(۲۰۰۶)
قومی ڈاکٹر علامہ محمد اقبال ایوارڈ برائے شاعری	(۱۹۹۶)
احمد ندیم قاسمی ایوارڈ برائے شاعری	(۲۰۰۱)
یو بی ایل / جنگ لٹریری ایکسلنس ایوارڈ	(۲۰۱۲)
بیسٹ ویمن نیشنل ایوارڈ (Federal Union of Columnists)	(۲۰۱۸)

زیرِ ترتیب کتب:

چھٹا شعری مجموعہ

جنوبی ایشیائی شاعری کے اُردو تراجم

تنقیدی مضامین کا مجموعہ

غالب کے منتخب اشعار کا انگریزی ترجمہ

☆

"مقامِ شکر"

(بصد عجز وانکسار)

یاسمین حمید

حمدیہ

وہی سوال کا مرکز وہی جواب میں بھی
وہی زبان پہ جاری وہی کتاب میں بھی

مقامِ شکر پر اُس نے شکایتیں بھی سنیں
اُسی نے صبر دیا سخت اضطراب میں بھی

اُسی نے راہ کو مشکل کیا جزا کے لیے
اُس نے خیر کو جاری کیا عذاب میں بھی

جو میں نے مانگا نہیں تھا مجھے وہ اُس نے دیا
پھر اس کو رکھا مرے اپنے انتخاب میں بھی

اِسی سے عجز کے سب راستے نکلتے ہیں
یہ شہر کیسا مکمل ہے آب و تاب میں بھی

○

نعتیہ

غیب سے کوئی بلاتا ہے مدینے کی طرف
مجھے کیا کیا نظر آتا ہے مدینے کی طرف

مرے سرکار کو آئین رسالت دے کر
رب کعبہ لیے جاتا ہے مدینے کی طرف

روکنے والے کھڑے دیکھتے رہ جاتے ہیں
لانے والا انھیں لاتا ہے مدینے کی طرف

ایک اک رنگ میں وہ خود نظر آنے والا
اک سوا رنگ دکھاتا ہے مدینے کی طرف

سوچتی رہتی ہوں تا دیر کسی رستے کو
پھر وہ رستہ چلا جاتا ہے مدینے کی طرف

ایک ہی شہر کی گلیوں میں پھرا کرتا ہے
دل مدینے سے بلاتا ہے مدینے کی طرف

○

طرزِ احساس کی تبدیلیاں

یاسمین حمید

اس موضوع پر کسی قسم کی تجزیاتی گفتگو سے پہلے یہ طے کر لینا ضروری ہے کہ ہم یہاں اردو زبان کی جس نظم کو جدید کہہ رہے ہیں وہ کس زمانے کو محیط ہے۔ یہ لفظ یعنی 'جدید' پچھلے تقریباً ڈیڑھ سو برس میں نظم کے لیے بارہا استعمال ہوا ہے اور ہر بار نظم کی نئی شکل کے لیے۔ سب سے پہلے سرسید، آزاد اور حالی کی تحریک کے زیرِ اثر جب اُردو شاعری میں نئے موضوعات کو ترجیح دینے کی ترغیب دی گئی اور اسے اصلاحی مقاصد کے لیے بہتر سمجھا گیا اور اس کے ساتھ ہیئتی تجربوں کا بھی آغاز ہوا تو بعض لوگوں نے اس تحریک کو جدید نظم کی تحریک کہا۔(۱) یہ تحریک آگے چل کر اپنے مقصدی عناصر کے سبب ترقی پسند تحریک سے زیادہ قریب معلوم ہوتی ہے اور ترقی پسند شاعری کو اس کا high-point سمجھیں تو ایسا غلط نہ ہوگا۔ آزاد اور حالی اور اکبرالہٰ آبادی کے بعد اقبال کی منفرد آواز میں ان تینوں آوازوں کا synthesis اور اس کے بعد جوش ملیح آبادی کے مخصوص مضامین اور اسلوب' ترقی پسند شاعری کے لیے راستہ ہموار کر چکے تھے۔ ترقی پسند نظریے کو جس کی بنیاد مارکس کا فلسفہ ٹھہرا یہ لب ولہجہ راس آیا۔ اب' موجودہ زمانے سے جب پلٹ کر پیچھے کی طرف دیکھتے ہیں تو آزاد اور حالی کی تحریک کے لیے 'جدید' سے زیادہ 'اصلاحی' کا لفظ موزوں لگتا ہے۔ اسی زمانے میں اصلاحی اور مقصدی شاعری کے عین متوازی رومانوی تحریک کا بھی چرچا اس وقت کے قاری اور شاعر پر اثر انداز ہوا اور اختر شیرانی کے لہجے کی نرمی اور حلاوت سے بعد میں آنے والے شاعر بچ نہ سکے جن میں بعض اہم ترقی پسند شاعر بھی شامل ہیں۔ گویا ایک نسبت سے رومانوی شعری تحریک کا high-point بھی ترقی پسند شاعری کو کہا جا سکتا ہے۔ یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ اقبال کی شعری کائنات کے لیے نہ تو اصلاحی ایسا موزوں لفظ ہے' نہ جدید۔ اقبال روایت اور جدیدیت کے درمیانی علاقے میں divider کی طرح موجود ہیں۔ اقبال کے بعد اقبال کے اسلوب کی کسی نے پیروی نہیں کی لیکن اقبال کے بعد روایتی اسلوب کی طرف غزل میں بھی اور نظم میں بھی' پلٹ کر جانا ممکن نہیں رہا۔ اُردو شاعری نئے موسم کی آمد کے لیے تیار تھی۔

اسی زمانے میں ترقی پسندوں کے علاوہ ایک اور گروہ بھی شعر کہہ رہا تھا جس نے ۱۹۳۹ میں حلقہء ارباب ذوق (جس کا اولین نام بزمِ داستاں گویاں تھا) قائم کیا۔(۲) اس گروہ نے کامیاب ہیئتی تجربے کیے اور مضامین اور ان کے treatment کی صورت میں بھی اُردو نظم کے لیے ایک نیا راستہ دریافت کیا۔ یہ گروہ اپنے آپ کو جدیدیت پسند اور اپنی شاعری کی جدید کہتا تھا۔ اگر یہاں سے پلٹ کر دیکھیں تو آج بھی اُس گروہ کے لیے لفظ 'جدید' مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اُردو نظم میں طرزِ احساس کی فطری تبدیلی کا آغاز یہیں سے ہوا۔

جدیدیت کے اس میلان کا آغاز دراصل ہیئتی تجربے سے ہوا۔ اس تجربے کی ابتدا تصدق حسین خالد نے کی، جب ۱۹۲۶ میں پہلی مرتبہ انھوں نے فیروز پور کے ایک مشاعرے میں آزاد نظمیں پڑھیں۔(۳) یہاں ایک اہم سوال ذہن میں آتا ہے اور وہ یہ کہ کیا ہیئت طرزِ احساس پر اثر انداز ہوتی ہے یا یہ کہ کیا کسی مخصوص طرزِ احساس کو اظہار کے لیے کسی مخصوص ہیئت کی ضرورت ہوتی ہے جس کے بغیر اس کا بیان اور ترسیل پوری طرح ممکن نہیں؟ اس سوال کی طرف بعد میں آئیں گے۔ اس سے پہلے چند اور باتیں۔

میں نے کہا ہے کہ اُردو نظم میں طرزِ احساس کی تبدیلی کا آغاز ۱۹۳۹ کے جدیدت پسند حلقے نے کیا۔ آزاد اور حالی کی تحریک نے بھی ایک نیا راستہ اختیار کیا تھا لیکن پہلی بات یہ کہ وہ acquired یا مصنوعی تھا اور دوسری یہ کہ اجتماعی بھی تھا۔ بالکل اسی طرح ترقی پسندی کا راستہ بھی شعوری اور خارجی سطح پر بنایا ہوا اور اجتماعی فکر و عمل کا حامل تھا۔ یہ طرزِ احساس کی فطری تبدیلی نہیں تھی بلکہ شعوری طور پر تخلیق کو ایک نئے راستے سے متعارف کرنے کا عمل' جس کا ایک خاص مقصد تھا۔ ان دونوں تحریکوں میں انفرادی آزادی کو مرکزیت حاصل نہیں تھی جبکہ طرزِ احساس کی تبدیلی تخلیق میں انفرادی آزادی کے بغیر میرے خیال میں ممکن نہیں۔

طرزِ احساس کیا ہے؟ کسی بھی داخلی یا خارجی صورت حال کی تفہیم اور انجذاب کے بعد پیدا ہونے والا ردِعمل۔ زندگی اور انسان کا ذہن جتنے سادہ ہونگے یہ ردِعمل اتنا ہی سادہ اور اکہرا ہوگا۔ زندگی اور انسان یا تخلیق کار کا ذہن جس قدر پیچیدہ ہونگے یہ ردِعمل اور اس کا بیان بھی اتنا ہی پیچیدہ ہوگا۔ تخلیق میں انفرادی آزادی کے تصور کے بعد طرزِ احساس کی تبدیلیوں کا مطالعہ بھی پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ جتنے تخلیق کار اتنی تخلیقی دنیائیں جن کا اجتماعی نظریہ ایک نہیں ہے' جنھیں اظہار کی آزادی ہے۔ صدیوں سے قائم انسانی اقدار کی شکست و ریخت' زندگی کرنے کے طے شدہ راستوں کے نو زائیدہ اور نئے نئے رخ، رشتوں کے نئے مفاہیم۔ ہر انسان یا ہر تخلیق کار اپنی ذات، اپنے ذہن میں دوسرے سے مختلف' انفرادی آزادی کے بعد اس جنگل سے کیا برآمد کرتا ہے اس کا تعین بھی پیچیدہ ہے۔

ترقی پسندی اور اصلاح پسندی کا دور برصغیر کی تقسیم کے بعد آہستہ آہستہ اپنی شدت میں کم ہوتا جاتا ہے۔ گو اجتماعیت پسند تخلیق کار (اور اہم تخلیق کار) لکھتے بھی رہے اور مقبول بھی ہوئے لیکن عمومی سطح پر جدیدیت پسندی تخلیق پر حاوی ہوتی گئی اور اکیسویں صدی میں تخلیق کار اپنی اسی انفرادی آزادی کے ساتھ داخل ہوا ہے جس کا آغاز ۱۹۳۹ کے حلقہء ارباب ذوق کے گروہ نے کیا تھا۔

ان دونوں زمانوں کے درمیان بھی بہت کچھ ہوا۔ ۱۹۶۰ کے لگ بھگ نئی لسانی تشکیلات کی تحریک اور پھر نثری نظم کی طرف میلان نے تخلیق میں ایک نئے اسلوب اور احساس و اظہار کی سطح پر نظم کے لیے نیا رخ متعین کیا۔ یہاں

اُس سوال کی طرف دوبارہ جاتے ہیں کہ کیا ہیئت کا طرزِ احساس سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے؟ میرے خیال میں ہیئت کا طرزِ احساس اور اس کے اظہار سے گہرا تعلق ہے۔ اردو میں آزاد نظم بیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں متعارف ہوئی۔ اس کی پہلی اشاعت ۱۹۳۲ میں ہوئی اور ۱۹۴۰ تک آتے آتے بعض اہم شعرا نے اسے اظہار کے لیے باقاعدہ استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اردو کے ابتدائی زمانے ہی سے نظم تو لکھی جا رہی تھی۔ قصیدہ، ہجو، مرثیہ، شہر آشوب وغیرہ یہ سب نظم ہی کی مختلف صورتیں ہیں اور پھر نظیر اکبر آبادی کی نظم جو اپنے وقت کے لحاظ سے اردو نظم میں ایک بڑی اور انقلابی تبدیلی تھی جس کا اپنے زمانے میں کم اور بعد میں زیادہ اعتراف کیا گیا۔ اولین زمانے سے لے کر ترقی پسند زمانے تک نظم کے اظہار میں پھیلاؤ ہے، کسی بھی موضوع کے تمام یا بے شمار پہلوؤں کو تفصیل سے پیش کرنے کا عمل۔ اس میں بعض باتیں دہرائی جاتی ہیں' کچھ پابند ہیئت کی مجبوری کے سبب اور کچھ بات کو طول دینے یا تفصیلی بیان وضع کرنے کے سبب۔ پابند ہیئت کے سبب غیر ضروری الفاظ بھی نظم میں استعمال ہوتے چلے جاتے ہیں۔ عموماً نظم کسی داخلی واردات کو بھی خارجی اور verbose بیانیہ بنا دیتی ہے۔ اس طرح کی نظمیں عموماً ایک جگہ پر جامد و ساکت رہتی ہیں۔ بیسویں صدی میں اس کی بہترین مثال جوش ملیح آبادی کی نظمیں ہیں جو کمال مہارت کا نمونہ ہیں' جن سے پڑھنے والا (یا نیا پڑھنے والا) مرعوب تو ہوتا ہے لیکن اپنے آپ کو داخلی سطح پر ان سے مرتبط (connect) نہیں کر پاتا۔

میرے خیال میں اگر اردو نظم کے لیے پہلے غیر مقفیٰ یا معریٰ اور بعد میں آزاد ہیئت کا تجربہ نہ کیا جاتا تو نئے طرزِ احساس کو اظہار کا مناسب میڈیم نہ ملتا۔ اُس وقت ایک مخصوص حسیت مناسب اظہار کے لیے پابندی سے باہر نکلنا چاہتی تھی اور جس طرح دریا کی شوریدہ سری چٹانوں کو کاٹ کر اپنے لیے راستہ بنا لیتی ہے' اس نے پابند نظم کے سانچے کو توڑ کر آزاد ہیئت کا انتخاب کر لیا۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے ن م راشد کے پہلے شعری مجموعے ''ماورا'' کی مثال دی جا سکتی ہے۔ ''ماورا'' میں کل سینتیس (۳۷) نظمیں ہیں۔ ان میں پہلی سولھاں (۱۶) نظمیں پابند ہیئت میں ہیں۔ کسی کسی نظم کے بعض ٹکڑے غیر مقفیٰ ہیں اور پابندی کو شعوری طور پر قائم کرنے کی کوشش محسوس ہوتی ہے۔ 'جرأت پرواز' سے آزاد نظموں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ (یہ غالباً راشد کی پہلی آزاد نظم ہے جو ۱۹۳۲ میں لکھی گئی)۔ (۴) جونہی آزاد نظموں کا آغاز ہوتا ہے، راشد کا شعری تشخص تبدیل ہو جاتا ہے اور 'بیکراں رات کے سناٹے' اور 'خود کشی' تک آتے آتے شاعر اپنے حقیقی وجود کا اثبات کرتا ہے اور اظہار کی روانی میں ایک گونہ سہولت (comfort) کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ میں یہ بات کسی قدر یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ راشد کے طرزِ احساس کو اگر آزاد ہیئت میسر نہ آتی تو اردو ادب کی تاریخ انھیں بھلا دیتی۔

یہاں پر میں ہیئت ہی کے سلسلے میں ایک بات کا ذکر ضروری سمجھتی ہوں۔ گو آزاد ہیئت کی ایجاد کو عام طور پر میراجی اور راشد سے منسوب کیا جاتا ہے اور تصدق حسین خالد کا نام سرسری طور پر ہی لیا جاتا ہے، لیکن ان کا ایک کارنامہ ایسا ہے جو بالکل منفرد ہے اور ہیئت کی ایجاد کے ضمن میں بہت اہم ہے۔ معلوم نہیں کہ اس کا ذکر کسی نے کہیں کیا ہے یا اس کی اہمیت پہ توجہ دی ہے یا نہیں۔ ممکن ہے کیا ہو لیکن میں نے نہیں پڑھا سوائے تصدق حسین خالد کے ''سرودِ نو'' کے لیے لکھے ہوئے تعارفی مضمون میں۔ اردو شاعری میں آزاد ہیئت گو انگریزی کی free verse یا فرانسیسی کی vers libre سے مستعار لی گئی ہے لیکن اِس کی ایک انفرادی خصوصیت ہے جسے تصدق حسین خالد نے شعوری طور پر وضع کیا اور قائم کیا۔ اردو شاعری میں آزاد ہیئت قافیہ ردیف اور مصرعوں میں ارکان کی طے شدہ تعداد سے تو آزاد ہے لیکن بحر اور وزن سے قطعاً آزاد نہیں اور یہاں یہ انگریزی کی free verse سے یکسر مختلف ہو جاتی ہے جو بحر یا metre کی پابند نہیں ہے۔ تصدق حسین خالد لکھتے ہیں:

''میں نے ..... فرانسیسی اور انگریزی آزاد شعرا کے صرف ان پہلوؤں کو اپنایا ہے جو اردو شاعری کی روایات سے متناقض نہیں اور جو ہمارے فنِ عروض سے بآسانی ہم آہنگ ہو سکتے ہیں۔ میں نے اردو شاعری کے مروجہ اوزان و بحور کو استعمال کیا ہے لیکن ان کے ارکان کی یکسانیت کو ترک کرتے ہوئے انہیں شعر کے تحت کر دیا ہے اور شعر کو ان کے استبداد سے آزاد کر دیا ہے۔ اس جدت کے خلاف عام اعتراض کیا جاتا ہے کہ ایک نظم میں کوئی مصرع بہت لمبا ہوتا ہے اور کوئی بہت چھوٹا۔ یہ اعتراض درخورِ اعتنا نہیں کیونکہ شعر کا تعلق کان سے ہوتا ہے نہ کہ آنکھ سے۔ پھر چونکہ بحور میں ایک نظم یا غزل میں جملہ مصرعے ہم مقدار ہوتے ہیں، اس لیے ہر مصرع ایک متعین جگہ پر آ کر ختم ہو جاتا ہے جہاں سے دوسرا مصرع شروع ہوتا ہے۔ میں اس کے خلاف ہوں اور enjambment کو جائز قرار دیتا ہوں۔ یعنی یہ کہ ایک مصرعے کے الفاظ اور معانی دونوں کا بہاؤ، آنے والے مصرعے میں اس طرح ہو کہ وہ اس کا اہم جزو ہو جائے اور دوسرے مصرعے کے کسی حصے میں تکمیلِ معنی کے بعد ختم ہو سکے۔'' (۵)

یعنی اردو کی آزاد نظم کلی طور پر انگریزی سے مستعار نہیں لی گئی بلکہ اس میں بحر کو قائم رکھنے کی اختراع نے اسے ایک منفرد حیثیت بھی دی ہے۔ اس زمانے میں جب خالد، راشد اور میراجی لکھ رہے تھے، آزاد نظم میں بحر کا مترنم آہنگ اس لیے بہت اہم ہو جاتا ہے کیونکہ اس طرح ایک طرف تو شاعر وہ آزادی حاصل کر لیتا ہے جو جدید طرزِ احساس کے اظہار کے لیے زیادہ موزوں ہے اور دوسری طرف اس مترنم آہنگ کو بھی قائم رکھ سکتا ہے جو اسے خود بھی پسند ہے اور جو اس کے قاری اور سامع کے لیے آزاد ہیئت کو قابلِ قبول بنانے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ غالباً نثری آہنگ کے لیے اس وقت ہمارا شاعر بھی اور قاری بھی پوری طرح تیار نہیں تھے اور اس وقت ایسا تجربہ شاید اتنا کامیاب نہ ہوتا جتنا بحر میں اور اوزان کی پابندی میں لکھی ہوئی آزاد ہیئت کا تجربہ کامیاب ہوا۔

نظم میں ہیئت کا دوسرا بڑا تجربہ ۱۹۶۰ کی دہائی میں نثری نظم کے آغاز

سے ہوا۔اس تجربے کی داستان آزاد ہیئت کے تجربے سے مختلف ہے کیونکہ اسے قبولیت کی سند حاصل کرنے میں بہت طویل عرصہ لگا ہے اور آج بھی کہیں کہیں اس کے لیے ناگواری کے کلمات سننے میں آجاتے ہیں۔نثری نظم اوزان و بحور سے خارج ہے۔نثری نظم کا آہنگ اس کے الفاظ اور تحریر کے اسلوب میں تلاش کیا جاتا ہے۔آزاد نظم کی طرح اردو کی نثری نظم بھی انگریزی کی prose poem سے مختلف ہے۔انگریزی کی نثری نظم پیراگراف کی صورت میں لکھی جاتی ہے اور اس میں نثر کی طرح جملے لکھے جاتے ہیں۔یعنی کاغذ پر دیکھنے میں وہ اردو کی نثری نظم سے مختلف نظر آتی ہے جبکہ اس میں بھی شعریت اس کی زبان اور مضمون کے آہنگ میں موجود ہوتی ہے۔اس طرح سے کچھ نظمیں اردو میں بھی لکھی گئی ہیں لیکن تعداد میں کم ہیں۔اردو میں نثری نظم لکھنے والے آغاز میں نظر انداز کیے گئے لیکن ان کی مستقل مزاجی اور آہستہ آہستہ قافلے میں شامل ہونے والے دوسرے شاعر آخر کار نثری نظم کو استحکام دینے میں کامیاب ہوئے۔کہا جاتا ہے کہ نثری نظم کو آغاز میں ایسے شاعر نہیں ملے جو اس ہیئت کو اعتبار دیتے۔یہ بات میرے خیال میں کلّی طور پر درست نہیں ہے کیونکہ اب وہی آغاز میں لکھنے والے شاعر نثری نظم کے اہم شاعر جانے جاتے ہیں جن میں سرِ فہرست قمر جمیل، مبارک احمد، احمد ہمیش اور عبدالرشید کا نام ہے۔عبدالرشید کا نثری نظم کا پہلا مجموعہ ''اپنے لیے اور دوستوں کے لیے نظمیں'' ۱۹۷۴ میں شائع ہوا۔یہ اردو میں نثری نظم کا بھی پہلا مجموعہ ہے۔(۶)

جب سے نثری نظم کے شاعروں کو اس کی قبولیت کا اعتماد حاصل ہوا ہے، اردو نظم میں وسعت اور تنوع کا احساس بڑھ گیا ہے۔یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ جس قسم کے طرزِ احساس کا اظہار اس ہیئت میں ہو رہا ہے اس کے لیے کیا آزاد نظم موزوں نہیں تھی؟ اس کا جواب مشکل ہے لیکن غالباً اس ضمن میں دو باتیں کہی جا سکتی ہیں۔ایک تو وہی کہ ہر خیال اپنے لیے ہیئت کا انتخاب خود کرتا ہے اور جب تک وہ ہیئت دریافت نہیں ہوتی اس خیال کے لیے شعری اظہار کے راستے پوری طرح نہیں کھلتے۔دوسرے یہ کہ آزاد نظم بحر اور اوزان کے استعمال کی وجہ سے مترنم بھی ہوتی ہے اور شاعر یہاں چاہے تو قافیے کا استعمال کر سکتا جس سے وہ روایتی سطح پر آج بھی کافی مرعوب ہے اور سننے اور پڑھنے والے کو بھی پسند ہے۔مزید پیچیدہ ہوتی دنیا اور مزید گنجلک مضامین کے اظہار کے لیے غالباً یہ ہیئت بھی ناکافی تھی یا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہر شاعر کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں تھی۔

سو یہ طے ہوا ہے کہ اردو شاعری میں جدید طرزِ احساس کا سفر بیسویں صدی کی تیسری اچوتھی دہائی سے شروع ہوا' جو روایتی طرزِ احساس اور طرزِ اظہار سے مختلف ہے۔اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انیسویں اور اٹھارویں صدی پر جدیدیت کے تصور کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔ہر عہد میں جدیدیت کے عناصر موجود ہوتے ہیں اور ہر زمانے میں بعض شاعر اپنے طرزِ احساس میں انفرادیت کی بنیاد پر جدید ہوتے ہیں اور ان کا اظہار آنے والے وقتوں کے لیے حیران کن حد تک بامعنی رہتا ہے۔ولی، میر اور غالب کا شمار انہیں شاعروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے اپنے زمانوں میں اپنے طرزِ احساس کی بنیاد پر آئندہ کے زمانے میں اپنے لیے جگہ بنائی۔ہمارا موضوع کیونکہ 'جدید نظم میں طرزِ احساس کی تبدیلیاں' ہے اس لیے ہم نے اپنے لیے کچھ حدود وضع کر لی ہیں۔

آج سے لے کر جدید نظم کے آغاز کے زمانے تک تقریباً اسّی (۸۰) سے نوّے (۹۰) برس بنتے ہیں جو ایک صدی کے قریب کا زمانہ ہے۔اب پہلی بات جو میرے لیے حیران کن ہے وہ یہ ہے کہ راشد اور میراجی اور اس زمانے کے بعض دوسرے نئے شاعروں کی حسیّت ہمیں آج بھی معنویت سے بھرپور لگتی ہے۔وہ ہمارے لیے اجنبی یا غیر متعلق نہیں ہیں۔تو کیا اسّی نوّے برس پہلے کا ذہن جو ابھی مابعد جدید زندگی کے انتشار سے دوچار نہیں ہوا تھا، ایک صدی بعد کے انسان سے اپنے طرزِ احساس میں یکساں ہے؟ گزری ہوئی پوری صدی، مادی اور غیر مادی' ہر سطح پر رونما ہونے والی تیز تر اور abrupt تبدیلیوں سے عبارت ہے۔ٹیکنولوجی کی نئی نئی ایجادات نے مرتکز ذہنوں کو انتشار کا شکار کیا ہے، خاندان کی اکائی بکھر گئی ہے' نئے انسان کا سفر تنہائی اور بے یقینی سے شروع ہوتا ہے اور ختم نہیں ہوتا، جاری رہتا ہے، مادہ پرستی، زیادہ سے زیادہ اشیاء کے حصول کی خواہش میں زندگیوں کا زیاں، آدھی دنیا میں سیاسی کہرام، انسانی زندگیوں کی بے وقعتی، لمحے لمحے کی خبر، وقت کا فقدان وغیرہ وغیرہ، ذہنی اور قلبی ہیجان کے لیے وافر سامان موجود ہے۔ایسی صورت میں نظم اپنے مضامین ہی میں نہیں، طرزِ اظہار میں بھی پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہو گئی ہے۔

۔جدید ذہن کسی بھی کیفیت، کسی بھی صورتِ حال' خوشی' غم' محبت' نفرت' غصہ وغیرہ وغیرہ کا صرف ایک رخ نہیں دیکھتا اور بہت سے رخ دیکھنے کے بعد کسی ایک نتیجے پر بھی نہیں پہنچتا۔یہی بات اس کی شاعری کو تہہ دار اور پیچیدہ بناتی ہے۔

بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ جدید ذہن پوری تصویر یا بیانیے میں دلچسپی نہیں رکھتا۔ایسا بیانیہ داخلی یا خارجی کسی نوعیت کا بھی ہو سکتا ہے۔جدید ذہن بات کے اُس حصے کو flash کرتا ہے جو اسے متاثر کرے۔اس لیے جدید احساس کی تخلیق کردہ نظم اپنے اظہار میں کسی اور کے اظہار کی نقل نہیں ہوتی۔

۔جدید ذہن بات کے گم شدہ گوشوں تک رسائی کی خواہش کرتا ہے۔اس کریدمیں کچھ باتیں مکمل طور پر واضح ہوتی ہیں لیکن اکثر پوری واضح نہیں ہوتیں۔یہ بات نظم میں ابہام کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔

۔جدید ذہن خارجی واقعات کی commentary نہیں کرتا بلکہ خارجی واقعات کے انسانوں پر اثرات کی تفہیم کی کوشش کرتا ہے۔اس لیے وہ خارجی واقعات کو internalize کر لیتا ہے۔

۔جدید ذہن کے لیے ذاتی واردات ایک انکشاف کی حیثیت رکھتی ہے جس کی ایک ایک تہہ کو وہ آہستہ آہستہ کھولتا ہے' اس لیے پوری واردات ایک ہی نظم یا ایک ہی شکل میں بیان نہیں ہوتی۔وہ اظہار کی ایک سے زیادہ صورتوں میں ظہور کرتی ہے۔بعض اوقات پڑھنے والے کے لیے سرا تلاش کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

۔جدید تخلیقی ذہن کا مسئلہ مادی دنیا سے زیادہ اس کے وجود کا اسرار (mystery) ہے۔اپنی تلاش اور اپنے آپ کو سمجھنے' منکشف کرنے کی سعی۔

۔جدید ذہن بیک وقت ایک سے زیادہ نظریات پر غور وفکر کرتا ہے اور پابندی کی نفی کرتا ہے۔

۔جدید دور نئے مضامین کا دور ہے یعنی یہ چند مروجہ مضامین کے اظہار تک محدود نہیں۔اسی سبب سے نیا ذہن اپنے آپ کو contradict بھی کرسکتا ہے۔

۔جدید ذہن کا تصورِ عشق خواب گوں نہیں' حقیقت پسندانہ ہے' بعض اوقات سفاک ہونے کی حد تک۔مگر یہ حقیقت اکہری نہیں ہے۔اس کے ایک سے زیادہ رخ ہیں۔

۔جدید طرزِ احساس پرانے استعاروں کو رد کرتا ہے یا ان کے استعمال کو نئے زاویے دیتا ہے۔پرانے استعارے اس کی دنیا سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔جدید نظم میں تخلیقی استعارہ ہی قابل قبول ہے۔

۔جدید انسان اپنی تنہائی کا نوحہ بھی لکھتا ہے اور اسے guard بھی کرتا ہے۔جدید ذہن اس رائگانی کا نوحہ بھی لکھتا ہے جس کے آگے وہ ہتھیار نہیں ڈالنا چاہتا۔

۔نیا شاعر اکثر کسی اور کی بجائے اپنے آپ سے مخاطب ہوتا ہے۔

جدید نظم کا سفر تقریباً اسی سے نوے برس کا ہے۔اس عرصے میں اولین زمانے سے لے کر آج تک نظم کے بہت سے شاعر نمایاں ہوئے۔بیسویں صدی میں نظم نگاری پہلے کی نسبت زیادہ مقبول ہوئی۔قابلِ ذکر نظم نگاروں کی تعداد بھی کافی ہے۔البتہ یہاں ایک ایسی نظم کا حوالہ دیا جاسکتا ہے جو میری رائے میں اس پورے زمانے کی نمائندگی کرتی ہے۔ن م راشد کی نظم 'حسن کوزہ گر'، جو ایک طویل نظم ہے اور چار حصوں میں لکھی گئی، بلا مبالغہ بیسویں صدی کی بڑی اور اہم نظم ہے۔اس کا پہلا حصہ آفتاب احمد خان کے مطابق ۱۹۵۵ میں لکھا گیا۔(۷) یہ پہلا حصہ راشد کی کتاب ''لا=انسان'' میں موجود ہے جو ۱۹۶۹ میں شائع ہوئی اور باقی تینوں حصے ان کے انتقال کے بعد ۱۹۷۶ میں شائع ہونے والی کتاب ''گماں کا ممکن'' میں موجود ہیں۔گو راشد کی اولین نظموں میں بھی طرزِ احساس کی سطح پر ایک جدید انسان ہی سے تعارف ہوتا ہے:

نیند آغازِ زمستاں کے پرندے کی طرح
خوف دل میں کسی موہوم شکاری کا لیے
اپنے پر تولتی ہے چیختی ہے
بے کراں رات کے سناٹے میں!
تیرے بستر پہ مری جان کبھی
آرزوئیں تیرے سینے کے کہستانوں میں
ظلم سہتے ہوئے حبشی کی طرح رینگتی ہیں!
'بے کراں رات کے سناٹے میں'(۸)

تشبیہات اور تصویری پیکر' تخلیقیت سے بھرپور۔تخلیقی استعارے کے بارے میں محمد حسن عسکری نے لکھا ہے:

''یہ استعارہ اوپر سے عائد نہیں کیا جاتا' مضمون کے ساتھ پیدا ہوتا ہے بلکہ اس استعارے کے بغیر شاید شاعر کو اس مخصوص احساس کا درک ہی حاصل نہ ہوتا۔یہ استعارہ شعری سہولت نہیں بلکہ شعور کی سیاحی کا ذریعہ ہے۔اُردو نظم کے غالب حصے میں ابھی تک تخیل کی کارفرمائی رہی ہے لیکن اب تخیل کو اپنی جگہ ملتی جا رہی ہے۔تخلیقی استعارہ وتشبیہ کیا ہوتے ہیں انھیں پہچاننے کے لیے راشد کی نظم 'بے کراں رات کے سناٹے میں' پڑھیے۔'' (۹)

'حسن کوزہ گر' کے چاروں حصے ایک moving image کی طرح ہیں۔ان میں 'میرِ افسانہ' (یہ لفظ راشد نے خود استعمال کیا ہے) جو نظم کی واحد آواز ہے اور جس کے ذریعے دوسرے کردار unfold ہوتے ہیں، اپنے بیان میں احساس کی بے شمار پیچیدہ منزلوں سے گزرتا ہے جس کو conceive بھی ایک نیا ذہن کرسکتا ہے اور جس کا اظہار بھی اسی کا حصہ ہے۔میرے خیال میں یہ ایک نظم پچھلے اسّی برس کی حسیت کی نمائندگی کرتی ہے۔اس میں طرزِ احساس کی تقریباً وہ سب منزلیں ہیں جن کا مندرجہ بالا سطور میں اظہار کر چکی ہوں۔یہ بات دلچسپ ہے کہ پہلی نظم بعد کی تینوں نظموں سے تھوڑی سی مختلف ہے۔یہ ایک طرح سے prologue ہے۔بعد کے تینوں حصوں میں یہ نظم پیچیدہ ہوتی چلی جاتی ہے اور نئے انسان کے داخلی اور خارجی وجود کی نت نئی الجھنوں کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہے۔پہلی نظم کا آخری بند ہے:

تمنا کی وسعت کی کس کو خبر ہے جہاں زاد لیکن
تو چاہے تو میں پھر پلٹ جاؤں ان اپنے مہجور کوزوں کی جانب
گِل ولا کے سوکھے تغاروں کی جانب
معیشت کے اظہارِ فن کے سہاروں کی جانب
کہ میں اس گِل ولا سے اس رنگ وروغن
سے پھر وہ شرارے نکالوں
کہ جن سے دلوں کے خرابے ہوں روشن
'حسن کوزہ گر' (۱۰)

نظم کا آغاز کہانی کے درمیان سے ہوتا ہے جب نو برس گزر چکے ہیں۔جہاں زاد کا عشق حسن کو دنیا سے ایک سطح پر لاتعلق تو کرتا ہے مگر روایتی دیوانگی کی منزل میں نہیں لے جاتا۔وہ 'سوختہ بخت' کی موجودگی سے آگاہ ہے، اپنے مہجور کوزوں کے لیے بے چین ہے، وہ جہاں زاد کی طرف شاید پلٹ کر بھی اس لیے آتا ہے کہ اس کی وساطت سے وہ دوبارہ زندگی کی طرف پلٹ جائے۔یہی وہ نیا طرزِ احساس ہے جو بیسویں صدی کے ذہن کی نمائندگی کرتا ہے۔

فیض احمد فیض کے دو مصرعے بھی قابلِ غور ہیں۔

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

لیکن ایک ترقی پسند شاعر اور جدید شاعر میں فرق ہے۔ ترقی پسندی کا ایجنڈا شاعر کو ایک طے شدہ راستے پر لے جاتا ہے:

ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخواب میں بنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
لوٹ جاتی ھے اُدھر کو بھی نظر کیا کیجیے(۱۱)

جدید ذہن ایسی پابندیوں سے آزاد ہے۔ جدید شاعر بھی 'حرفِ ناگفتہ' 'زندگی اک پیرہ زن' اور 'اندھا کباڑی' جیسی نظمیں لکھتا ہے لیکن اس کے محرکات اس کی اپنی ذات سے وابستہ ہیں کسی تحریک کی اجتماعیت سے نہیں۔

'حسن کوزہ گر'۲ سے چند حصے:

اے جہاں زاد،
نشاط اس شبِ بے راہ روی کی
مجھے پھر لائے گی؟
وقت کیا چیز ہے تو جانتی ہے؟
وقت اک ایسا پتنگا ہے
جو دیواروں پہ آئینوں پہ
پیمانوں پہ شیشوں پہ
مرے جام و سبو میرے تغاروں پہ
سدا رینگتا ہے

'حسن کوزہ گر'۲ (۱۲)

کھیل اک سادہ محبت کا
شب و روز کے اس بڑھتے ہوئے کھوکھلے پن میں جو کبھی کھیلتے ہیں
کبھی رو لیتے ہیں مل کر، کبھی گا لیتے ہیں
اور مل کر کبھی ہنس لیتے ہیں
دل کے جینے کے بہانے کے سوا اور نہیں
حرف سرحد ہیں جہاں زاد معانی سرحد
اشک سرحد ہیں، تبسم کی روانی سرحد
دل کے جینے کے بہانے کے سوا اور نہیں

'حسن کوزہ گر'۲ (۱۳)

تو ہنسے گی اے جہاں زاد، عجب بات
کہ جذبات کا حاتم بھی میں
اور اشیاء کا پرستار بھی میں
اور ثروت جو نہیں اس کا طلبگار بھی میں!
تو جو ہنستی رہی اس رات تذبذب پہ مرے
میری دورنگی پہ پھر سے ہنس دے!

'حسن کوزہ گر'۲ (۱۴)

یہ حصہ طویل ہے لیکن یہ تینوں ٹکڑے جدید دنیا کے آدمی کی تصویر نمائی کرتے ہیں۔ ان میں کسی قسم کا درس نہیں ہے، یہ contemplative ہیں۔ حالات کو، حالات کی دورنگی کو، اپنی شخصیت کی متنازع جہتوں کو جاننے کی، انہیں قبول کرنے کی کوشش۔ جدید زندگی سے نبرد آزما ہونے والے تنہا انسان کا المیہ جو جذبات کا حاتم بھی ہے اور اشیاء کا پرستار بھی ہے۔ 'حسن کوزہ گر'۳ کے کچھ حصے:

میں سب سے پہلے ''آپ'' ہوں
اگر ہمیں ہوں۔۔۔ تو ہوا اور میں ہوں۔۔۔ پھر بھی میں
ہر ایک شے سے پہلے آپ ہوں!

'حسن کوزہ گر'۳ (۱۵)

مگر ہمارا رابطہ وصالِ آب و گل نہیں، نہ تھا کبھی
وجودِ آدمی سے آب و گل صدا بروں رہے
نہ ہر وصالِ آب و گل سے کوئی جام یا سبو ہی بن سکا
جوان کا ایک واہمہ ہی بن سکے تو بن سکے

'حسن کوزہ گر'۳ (۱۶)

اب انتظار آنسوؤں کے دجلہ کا
نہ گمرہی کی رات کا
(شبِ گنہ کی لذتوں کا اتنا ذکر کر چکا
وہ خود گناہ بن گئیں!)
حلب کی کارواں سرا کے حوض کا، نہ موت کا
نہ اپنی اِس شکست خوردہ ذات کا
اک انتظارِ بے زماں کا تار ہے بندھا ہوا

'حسن کوزہ گر'۳ (۱۷)

یہ حصہ دوسرے حصے کا تسلسل ہی ہے اور اس میں مزید الجھاوے ہیں۔ اس دور کے انسان کی اپنے وجود کی طرف مراجعت جہاں وہ خود سب سے زیادہ اہم ہے۔ عشق کی وحشتوں کے ساتھ ساتھ اسے اپنی ذات کے ہونے کا پورے ادراک ہے۔ اس حصے میں مثلث کا تیسرا وجود بھی داخل ہوتا ہے۔

ایک تو اور ایک وہ اور ایک میں
مثلثِ قدیم کو میں توڑ دوں جو تو کہے مگر نہیں
جو سحر مجھ پہ چاک کا وہی ہے اس مثلثِ قدیم کا

'حسن کوزہ گر'۳ (۱۸)

حالات کی سفاکی کو قبول کرنے اور اس کے سحر میں مبتلا ہونے کی

منزل۔اس حصے میں نئے ذہن کی پیچیدگی،اس کی زندگی سے بیک وقت اکتاہٹ بھی اور پیوستگی بھی،غصہ بھی،غصہ کی تردید بھی،اپنی ذات کا اثبات بھی اور نفی بھی،ہر احساس اور جذبے کی دو انتہائیں اور ان کی درمیانی منزلوں کا تذبذب، ہر دو انتہاؤں کے درمیان کشاکش،جس سے بیسویں صدی کے انسان کی زندگی عبارت ہے،نظم کے اس حصے میں ان تمام کیفیتوں کے سائے منڈلا رہے ہیں اور نیا آدمی ان سایوں کے درمیان اپنے وجود کو قائم رکھنے کی خواہش رکھتا ہے۔اور یہ آخری نظم کے چند ٹکڑے:

جہاں زاد کیسے ہزاروں برس بعد
اک شہرِ مدفون کی ہر گلی میں
مرے جام و مینا و گلداں کے ریزے ملے ہیں
کہ جیسے وہ اس شہر برباد کا حافظہ ہوں
'حسن کوزہ گر'(۱۹)

یہ وہ لوگ ہیں جن کی آنکھیں
کبھی جام و مینا کی لَم تک نہ پہنچیں
یہی آج اس رنگ و روغن کی مخلوق بے جاں
کو پھر سے الٹنے پلٹنے لگے ہیں
یہ ان کے تلغم کی چنگاریاں پا سکیں گے؟
'حسن کوزہ گر'(۲۰)

انہیں کیا خبر کس دھنک سے مرے رنگ آئے
(مرے اور اِس نوجواں کوزہ گر کے)
انہیں کیا خبر کون سی تتلیوں کے پروں سے؟
انہیں کیا خبر کون سے حسن سے؟
کون سی ذات سے، کن خدوخال سے
میں نے کوزوں کے چہرے اتارے؟
'حسن کوزہ گر'(۲۱)

یہ کوزوں کے لاشے جوان کے لیے ہیں
کسی داستانِ فنا کے وغیرہ وغیرہ۔
ہماری اذاں ہیں، ہماری طلب کا نشاں ہیں
'حسن کوزہ گر'(۲۲)

میرے خیال میں نظم کا یہ حصہ سب سے زیادہ اثر انگیز ہے۔جدید زندگی کا حاصل محض رائگانی،تخلیق کار کی تنہائی،ایسی دنیا میں جو اس کو،اس کے فن کو نہ اب سمجھ سکی ہے نہ ہزاروں برس بعد سمجھ سکے گی۔تخلیق کار کے لیے تخلیق ناگزیر ہے۔اسی میں اس کی بقا بھی ہے اور یہی اس کا سب سے بڑا المیہ بھی ہے۔

اس پوری نظم میں تقریباً وہ تمام رنگ ہیں، وہ تمام اشارے ہیں، جدید نظم نگار کے طرزِ احساس کے وہ سب بنیادی خدوخال ہیں جن پر پچھلی اسی نوے برس کی اردو نظم نے اپنی صورت گری کی ہے۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ ۴۰۔۱۹۳۰ کی دہائیوں میں شاعری کا آغاز کرنے والے بعض شعرا نے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زمانے کی بدلتی ہوئی حسیت کو اپنے شعری وجدان میں تحلیل ہونے دیا۔ان کی شاعری اس بات کی تصدیق کرتی ہے۔مجید امجد کے ہاں شاعری کے متنوع رنگ اس بات کی دلیل ہیں اور اپنی زندگی کے آخری چھے برسوں میں لکھی جانے والی تقریباً ۹۷ نظمیں بھی یہی بتاتی ہیں کہ مجید امجد کو، وقت کے ساتھ ساتھ شعری منظرنامے پر رونما ہونے والے تجربات اور ان کی اہمیت کا ادراک تھا اور وہ اس بدلتے ہوئے منظرنامے میں اپنا حصہ شامل کرنا چاہتے تھے۔مجید امجد کے آخری زمانے کی نظمیں حسّی سطح پر اولین نظموں سے یکسر مختلف ہیں، خاص طور پر اپنے اسلوب اور اپنی فضا میں۔اختر الایمان کا کلیات دیکھیں تو اس میں بھی، ایک سطح پر مختلف لیکن یہی صورت نظر آتی ہے۔ان کی نظمیں 'ایک لڑکا' اور 'اپاہج گاڑی کا آدمی' کا اگر موازنہ کریں تو طرزِ احساس کا وہی فرق نظر آئے گا جو آہستہ آہستہ بدلتے ہوئے وقت کی دین ہے۔

ایک اور اہم واقعہ جو اسی عہد میں رونما ہوا وہ نسائی آواز کی قبولیت کا ہے۔یہ آواز ایک اور طرح کے طرزِ احساس کے ساتھ اُردو نظم کے منظرنامے میں داخل ہوئی، جس کی مثال اس سے پہلے نہیں تھی۔ میں نسائی آواز کو mainstream سے الگ کرنے کی ہرگز قائل نہیں ہوں لیکن اس آواز کی اجتماعی عمر اتنی کم ہے کہ اس کا ذکر یہاں کرنا پڑے گا۔عورت پہلے لکھ رہی تھی لیکن اس کا طرزِ احساس روایت کا پابند تھا۔جب اس نے اپنی پوری شناخت کو منکشف کرنا شروع کیا تو احساس و اظہار کے ایسے خدوخال مرتب ہوئے جو اُردو نظم میں اس سے پہلے موجود نہیں تھے۔ایک اور نقطۂ نظر سے شعری دنیا واقف ہوئی۔اس میں دھیما پن بھی ہے، تانیثی احساس کی شدت بھی ہے اور دنیا کو ایک اور طرح کے تجربے کی آنکھ سے دیکھنے کا عمل بھی۔

اگر جائزہ لیا جائے تو گزری ہوئی آٹھ نو دہائیوں میں ایسے بے شمار نظم نگار ہیں جنھوں نے طرزِ احساس کی نئی دُنیا کی سیاحت میں اپنا حصہ کم یا زیادہ شامل کیا ہے۔اگر نام گنوائے جائیں تو مردوں، عورتوں دونوں کو ملا کر پینتیس چالیس نظم نگار تو ایسے ہیں جن کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے، جس کے لیے ایک الگ مضمون درکار ہے۔بعض نے کم لکھا لیکن اس کے باوجود نئی حسّیت کی نمائندگی میں اہم ہیں۔ایک ادیب اور شاعر کا منصب بھی یہی ہے کہ وہ اپنے زمانے کے اجتماعی تجربے اور فکر کو محسوس کر سکے اور حالات و واقعات کی خارجی اور باطنی واردات کے بیان کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کی حسّی تاریخ بھی رقم کرے۔

حوالہ جات

۱۔ عقیل احمد صدیقی، ''جدید اُردو نظم نظریہ و عمل ۱۹۳۶۔۱۹۷۰''، بیکن بکس، ملتان ۲۰۱۴، ص ۲۴

۲۔ ش ق نظام، 'بیسویں صدی میں اُردو نظم'، ''بیسویں صدی میں اُردو ادب'' مرتب گوپی چند نارنگ، ساہتیہ اکیڈمی، نئی دہلی ۲۰۰۲، ص ۱۰۹

۳۔ تصدق حسین خالد، ''سرودِنو''، سنگِ میل لاہور ۱۹۹۰، ص ۲۳

۴۔ ضیاالحسن، ''ن م راشد شخصیت اور فن''، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد ۲۰۰۸، ص ۱۶

۵۔ تصدق حسین خالد، ص ۲۴

۶۔ احتشام علی، ''جدید اُردو نظم میں عصری حسیت''، سانجھ پبلیکیشنز، لاہور ۲۰۱۵، ص ۱۷۸

۷۔ آفتاب احمد، ''ن م راشد شاعر اور شخص''، مکتبہء دانیال، کراچی۔ ص ۷۵

۸۔ ن م راشد، ''کلیاتِ راشد''، ماورا پبلشرز، لاہور ۱۹۸۸، ص ۱۰۳

۹۔ محمد حسن عسکری، ''مجموعہ''، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور ص ۸۲۳۔۸۲۴

۱۰۔ ن م راشد، ص ۲۵۹

۱۱۔ فیض احمد فیض، ''نسخہ ہائے وفا''، مکتبہ کارواں، لاہور، ص ۵۳

۱۲۔ ن م راشد، ص ۴۴۵

۱۳۔ ایضاً، ص ۴۴۶

۱۴۔ ایضاً، ص ۴۴۸

۱۵۔ ایضاً، ص ۴۸۹

۱۶۔ ایضاً، ص ۴۹۱

۱۷۔ ایضاً، ص ۴۹۳

۱۸۔ ایضاً، ص ۴۹۱

۱۹۔ ایضاً، ص ۵۴۲

۲۰۔ ایضاً، ص ۵۴۳

۲۱۔ ایضاً، ص ۵۴۴

۲۲۔ ایضاً، ص ۵۴۷

کوئی لوٹا دے

پہلے:- وہ کنویں کا میلا اور گدلا پانی پی کر 100 سال جی لیتے تھے۔

اب:- صیلے اور پیور لائف کا خالص شفاف پانی پی کر بھی چالیس سال میں بوڑھے ہو رہے ہیں۔

پہلے:- وہ گھانی کا میلا سا تیل کھا کر اور سر پر لگا کر بڑھاپے میں بھی محنت کر لیتے تھے۔

اب:- ہم ڈبل فلٹر اور جدید پلانٹ پر تیار کوکنگ آئل اور گھی میں پکا کھانا کھا کر جوانی میں ہی ہانپ رہے ہیں۔

پہلے:- وہ ڈلے والا نمک کھا کر بیمار نہ پڑتے تھے۔

اب:- ہم آیوڈین والا نمک کھا کر ہائی اور لو بلڈ پریشر کا شکار ہیں۔

پہلے:- وہ نیم، ببول، کوئلہ اور نمک سے دانت چمکاتے تھے اور 80 سال کی عمر تک بھی چبا چبا کر کھاتے تھے۔

اب:- کولگیٹ اور ڈاکٹر ٹوتھ پیسٹ والے روز ڈینٹیسٹ کے چکر لگاتے ہیں۔

پہلے:- *صرف روکھی سوکھی روٹی کھا کر فٹ رہتے تھے

اب:- اب برگر، چکن کڑاہی، شوارمے، وٹامن اور فوڈ سپلیمنٹ کھا کر بھی قدم نہیں اٹھایا جاتا۔

پہلے:- لوگ پڑھنا لکھنا کم جانتے تھے مگر جاہل نہیں تھے۔

اب:- ماسٹر لیول ہو کر بھی جہالت کی انتہا پر ہیں۔

پہلے:- حکیم نبض پکڑ کر بیماری بتا دیتے تھے۔

اب:- سپیشلسٹ ساری جانچ کرانے پر بھی بیماری نہی جان پاتے ہیں۔

پہلے:- وہ سات آٹھ بچے پیدا کرنے والی مائیں، جنہیں شائد ہی ڈاکٹر میسر آتا تھا 80 سال کی ہونے پر بھی کھیتوں میں کام کرتی تھی۔

اب:- ڈاکٹر کی دیکھ بھال میں رہتے ہوئے بھی نا وہ ہمت نا ھی وہ طاقت رہی۔

پہلے:- کالے پیلے گڑ کی بٹھائیاں ٹھوس ٹھوس کر کھاتے تھے۔

اب:- مٹھائی کی بات کرنے سے پہلے ہی شوگر کی بیماری ہو جاتی ہے۔

پہلے:- بزرگوں کے کبھی گھٹنے نہیں دکھتے تھے۔

اب:- جوان بھی گھٹنوں اور کمر درد کا شکار ہیں۔

پہلے:- 100 واٹ کے بلب ساری رات جلاتے اور 200 واٹ کا ٹی وی چلا کر بھی بجلی کا بل 200 روپیہ مہینہ آتا تھا۔

اب:- 5 واٹ (5watts) کا ایل ای ڈی انرجی سیور اور 30 واٹ کے LED ٹی وی میں کم از کم 2000 فی مہینہ سیکم بل نہیں آتا۔

پہلے:- خط لکھ کر سب کی خبر رکھتے تھے۔

اب:- ٹیلی فون، موبائل فون، انٹرنیٹ ہو کر بھی رشتے داروں کی کوئی خیر خبر نہیں لی جاتی۔

پہلے:- غریب اور کم آمدنی والے بھی پورے کپڑے پہنتے تھے۔

اب:- جتنا کوئی امیر ہوتا ہے اس کے کپڑے اتنے کم ہوتے جاتے ہیں

سمجھ نہیں آتا کہ ہم کہاں کھڑے ہیں؟

اور ہم سے کہاں غلطی ہوئی ہے؟

ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا؟

○

براہِ راست

اردو زبان و ادب تہذیب، تمدن اور روایات کی پاسداری کے اُس تسلسل کا نام ہے جو گذشتہ کئی دہائیوں سے بلا کسی امتیاز، کرۂ ارض کے چہار جانب محبت، امن، آشتی اور رواداری نہ صرف عام کر رہا ہے بلکہ ہر آنے والے دن کے ساتھ اس میں وسعت اور کشادگی کا سامان بھی مہیا کر رہا ہے۔ ان مثبت کوششوں اور کاوشوں کو فروغ دینے والوں کی فہرست خاصی معتبر بھی ہے اور طویل بھی۔

محترمہ یاسمین حمید اردو زبان و ادب، سخن فہمی اور سخن سازی کے فروغ میں کارفرماں ایک ایسا حوالہ ہیں جن کی پذیرائی جس قدر بھی کی جائے کم ہے۔ آج کی محفل اسی خواہش اور غرض سے آراستہ کی گئی ہے کہ ہم محترمہ کی طویل اور اخلاص سے پُر اردو دانی اور اردو نوازی کو سراہتے ہوئے اُن کی طویل ادبی، علمی اور سائنسی خدمات کا نہ صرف احاطہ کیا جائے بلکہ جہاں جہاں ممکن اور مناسب ہو مفید مشوروں سے بھی سرفراز کیا جائے!!!

..... گلزار جاوید

☆ ہر چند شاعرات کے ہاں سہرا کہنے کی روایت نہ ہونے کے برابر ہے مگر ہماری خواہش ہے کہ گفتگو کی ابتدا میں اختصار و ایجاز کے ساتھ خاندانی پس منظر کچھ اس طرح بیان کیجیے کہ قارئینِ چہارسو بے ساختہ کہہ اٹھیں ''دیکھا اس طرح سے کہتے ہیں سخن ور سہرا۔''

☆☆ آپ نے سہرے کا تعلق خاندانی پس منظر سے کیسے ملایا یہ تو کہا نہیں جا سکتا البتہ یہ ضرور کہہ دوں کہ تاریخ نے خواتین کے لکھے ہوئے لفظ کو محفوظ کرنے کا اہتمام ہی نہیں کیا ورنہ ممکن ہے سہرا کہنے کی روایت نہ ہونے کے برابر نہ ہوتی۔ اگر خواتین لوک گیتوں کی خالق ہو سکتی ہیں تو اور اصناف کی کیوں نہیں۔

مختصراً یوں ہے کہ مرے بزرگوں کا تعلق یا تو طب کے پیشے سے تھا یا فوج سے یا بیک وقت دونوں سے۔ والد کا خاندان بجواڑہ، ہوشیار پور سے اور والدہ کا خاندان امرتسر سے ہجرت کر کے پاکستان آیا تھا۔ میرے دادا ڈاکٹر عبدالرشید انڈین سول سروس میں تھے۔ والد لیفٹیننٹ کرنل (ر) نیاز احمد رشید سے جب والدہ کا عقد ہوا تو وہ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کرنے کے بعد فاطمہ جناح میڈیکل کالج میں پڑھا رہی تھیں۔ والد کی وجہ سے انھوں نے بھی فوج میں ملازمت اختیار کر لی اور پاکستان فوج کی پہلی خاتون بریگیڈیئر اور پہلی ستارہ ءامتیاز ہوئیں (بریگیڈیئر (ر) ڈاکٹر سعیدہ اختر)۔ سینتس (۳۷) برس فوج میں کام کیا۔ میرے دو بھائی ہیں۔ اظہر رشید اور اسد رشید۔ اظہر کارڈیک سرجن ہیں اور وہ بھی فوج سے آرمی میڈیکل کور کے سرجن جنرل کے عہدے پر پہنچ کر ریٹائر ہوئے۔ آج کل لوگ فوج سے تعلق جوڑتے ہوئے گھبراتے ہیں لیکن مجھے یہ تعلق اچھا لگتا ہے۔ ہماری پرورش اور تربیت والدہ نے کی۔ میری عمر آٹھ (۸) برس تھی جب میں نے والد کو آخری بار دیکھا تھا۔ ہم جو کچھ بھی ہیں، جیسے بھی ہیں، والدہ کی تربیت کی وجہ سے ہیں۔ وہ بہت کھری اور با اصول خاتون تھیں۔ کم گو تھیں۔ ان کی زندگی میں تنظیم کی بہت اہمیت تھی۔ میں نے ان سے وقت کی پابندی سیکھی اور وقت کو تقسیم کرنا سیکھا۔ بہت سلیقہ شعار تھیں۔ میں نے بچپن میں اپنے گھر میں اور اپنے اردگرد کبھی بے ترتیبی نہیں دیکھی۔ انتہا درجے کی صفائی پسند تھیں۔ ہمیں پڑھاتی بھی خود تھیں۔ ان کے ساتھ ہر طرح کا احساسِ تحفظ وابستہ تھا۔ ایک خاص بات جس نے ہمیشہ مجھے سوچنے پر مجبور کیا وہ ان کی پاکستان سے شدید محبت تھی۔ ان کے والدین ۱۱ اگست ۱۹۴۷ کو دلی سے دو سوٹ کیس اور آٹھ بچوں کے ساتھ کراچی پہنچے تھے۔ امی اس وقت میڈیکل کالج میں تھیں اور چھٹیوں میں لاہور سے دلی گئی ہوئی تھیں۔ بچوں میں سب سے بڑی تھیں۔ میں نے ان کی زبان سے اکثر یہ واقعہ سنا ہے۔ بھرا ہوا گھر چھوڑ کر یہ لوگ تباہ حال یہاں پہنچے تھے۔ نانا سرکاری محکمے میں ملازم تھے لیکن یہاں پہنچ کر بیمار ہو گئے اور بہت مشکل وقت گزارا۔ لمبی بات ہے مختصراً یہ کہ میں نے اپنی امی کی زبان سے پاکستان کے لیے یا حالات کے لیے کبھی بھی شکایت کا کوئی کلمہ نہیں سنا۔ انگریزی میں کہہ سکتے ہیں کہ she was a fierce patriot۔ انھیں پاکستان سے ایسے محبت تھی جیسے وہ ان کی چوتھی اولاد ہو۔ اسی لیے جب میں ہجرت کرنے والوں کی زبان سے شکایات سنتی تھی تو مجھے حیرت ہوتی تھی۔ میری شادی ڈاکٹر عبدالحمید صدیقی سے ہوئی تھی۔ وہ کیمیکل انجینئر تھے اور ان کے والد ڈاکٹر عبدالعزیز اپنے خاندان کے ساتھ ناگ پور سے پاکستان آئے تھے۔ حمید کا انتقال ۱۹۹۹ میں ہوا۔ ہمارے تین بچے ہیں، ایک بیٹی مہرین اور دو بیٹے، سلمان اور احمد۔ مہرین اور فرحان اپنی دو بیٹیوں، زینب اور فاطمہ کے ساتھ جورجیا، امریکہ میں رہتے ہیں۔ سلمان اور عیشہ بھی اپنے دو بیٹوں ابراہیم اور حمزہ کے ساتھ کیلیفورنیا، امریکہ میں ہیں۔ احمد اور صالحہ میرے ساتھ لاہور میں ہیں۔

☆ اگر ہم آپ سے عوام کے رویے میں اس تبدیلی کے اسباب دریافت کرنا چاہیں تو آپ کا فرمان کیا ہوگا؟

☆☆ اس سوال کا تعلق نہ تو میری ذات سے ہے نہ ادب سے۔ یہ بات کہیں اور نکل جانے والی ہے، اور اس کے کئی رخ ہیں، کئی زاویے ہیں۔ جو کچھ بھی ہوتا ہے اس کے بہت سے اسباب ہوتے ہیں اور ایسا نہیں ہے کہ کسی معاملے میں قوم کے تمام افراد کی رائے ایک ہو یا کسی ایک ادارے کے تمام افراد ایک جیسے ہوں۔ ہمارے نظام میں جو کمزوریاں ہیں اس کا ذمہ دار ایک ادارہ نہیں، بلکہ ملک کے تمام ادارے ہیں اور بعض افراد ہیں۔ میں تو ان معاملات سے الگ اس وقت اپنی بات کر رہی ہوں۔ میں نے پاکستان فوج کے ادارے کو قریب سے دیکھا ہے

اور پورے خلوص سے یہ سمجھتی ہوں کہ ہمیں اس ادارے پر فخر ہونا چاہیے اور ملک کے دوسرے اداروں کو اس ادارے کے بہترین discipline سے ہی کچھ سیکھ لینا چاہیے۔ میں نے سول کی زندگی کو بھی بہت قریب سے دیکھا ہے۔ فوج کی زندگی نسبتاً سادہ' نظم وضبط اور مشقت سے عبارت دیکھی۔ میں نے صرف وہ بیان کیا ہے جو میں نے اپنے گھر میں دیکھا۔

☆ شعور کی آنکھ سے بلوغ کی آنکھ کا طویل سفر ایک دانشور سخن ساز کے لیے کوزے میں بند کرنا مشکل تو ہوسکتا ہے ناممکن ہرگز نہیں۔

☆☆ میری یادداشت میں جو پہلا نقش ہے وہ کسی پہاڑی علاقے کا ہے۔ میں نے ایک مرتبہ اپنی والدہ سے پوچھا تھا کہ کیا وہ کسی ایسی جگہ پر رہے تھے جہاں گھر کے باہر صحن سے کہیں دور پہاڑوں کے اُس طرف کوئی دریا بہتا تھا۔ مجھے وہ پانی کی چمکتی ہوئی لکیر واضح طور پر یاد ہے۔ میرا ایک مصرع بھی ہے:

آنکھ کی حد میں چلی آئی ہے پانی کی لکیر

یہ پانی کی لکیر مجھے اکثر نظر آتی ہے۔ انہوں نے بتایا تھا کہ وہ چراٹ چھاؤنی میں تھے، جہاں پہاڑوں میں دور بہتا ہوا دریا نظر آتا تھا۔ اس وقت میری عمر دو سے اڑھائی برس تھی۔ دوسری چیز جو مجھے یاد رہ گئی وہ ایک گیت ہے اور اس کی دھن، جس کی لَے پر میں رقص کرنے کی کوشش کرتی تھی حالانکہ میں نے کبھی رقص دیکھا نہیں تھا۔ اس کے بعد امّی اور ابّا کا تبادلہ سیالکوٹ ہوا اور اس کے بعد سے میری یادداشت کا تسلسل قائم ہے۔ میری تعلیم کا آغاز پریزنٹیشن کا نونٹ (Presentation Convent) راولپنڈی سے ہوا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں اسکول بہت شوق سے جایا کرتی تھی۔ ذرا بڑی ہوئی تو ہر چیز میں، کھیلوں سے لے کر ڈراموں تک میں حصہ لینے کا بہت شوق تھا۔ کلاس میں اوّل آنا بھی بہت ضروری تھا کیونکہ گھر میں اس بات کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ موسیقی مجھے بہت متاثر کرتی تھی۔ گیتوں کے بول یاد ہو جاتے تھے اور میں گاتی بھی تھی۔ تصویریں بھی بناتی اور پینٹنگ بھی کرتی تھی۔ اس طرح پاکستان کے مختلف شہروں میں جہاں جہاں والدین کا تبادلہ ہوا، ہم ان کے ساتھ رہے۔ میں نے میٹرک تک سات مختلف اسکولوں میں تعلیم حاصل کی۔ فوج کی زندگی اسی طرح کی ہوتی ہے۔ میٹرک میں نے سینٹ میریز کانونٹ (St. Mary's Convent) ملتان سے کیا۔ اس کے بعد میں نے ہوم اکنامکس کالج لاہور سے بی ایس سی اور پھر ایم ایس سی کیا اور گولڈ میڈل بھی حاصل کیا۔ پڑھنے کے دوران ہی میری شادی کر دی گئی تھی۔ جب میں نے ایم ایس سی (نیوٹریشن Nutrition) کا امتحان دیا اس وقت میری بیٹی ایک ماہ کی تھی۔ میں نے اُس وقت تک باقاعدہ شاعری نہیں کی تھی۔ شعر یاد بہت تھے کیونکہ اسکول کے زمانے ہی سے میں بیت بازی میں ضرور حصہ لیتی تھی۔ اشعار کے معنی کچھ زیادہ سمجھ نہیں آتے تھے لیکن شعر یاد بہت تھے۔ اس وقت تک انگریزی فکشن بھی خاصا پڑھ چکی تھی خاص طور پر کلاسکس (classics)۔ شارلٹ برونٹے (Charlotte Bronte) ایمیلی برونٹے (Emile Bronte)، جین اوسٹن (Jane Austen) ٹومس ہارڈی (Thomas Hardy) اور ان کے علاوہ بھی فکشن نگاروں کو میں نے خاصی کم عمری میں پڑھا تھا۔ یہ سب کتابیں والدہ تجویز کرتی تھیں۔ اردو کی پہلی نثر کی کتابیں مجھے تحفے میں ملی تھیں۔ ایک تو ممتاز مفتی کی 'لبیک' تھی اور دوسری مشتاق احمد یوسفی کی 'خاکم بدہن' اور 'چراغ تلے'۔ چودہ برس کی عمر میں ایک نظم اور ایک آدھ شعر بھی کہا تھا لیکن وہ محفوظ نہیں ہیں۔ شاعری کی طرف باقاعدہ میں نے رسمی تعلیم مکمل کرنے کے بعد رجوع کیا۔ چوبیس پچیس برس کی عمر ہوگی جب میں نے لفظ سے باقاعدہ رشتہ قائم کیا۔ شاید تخلیقیت کے اس نئے رخ کو دریافت کرنے کا وہی وقت تھا۔ کیونکہ میری رسمی تعلیم ادبیات میں نہیں ہوئی تھی اس لیے میں نے جو کچھ بھی سیکھا غیر رسمی طور پر سیکھا، مسلسل مطالعے کے ذریعے سیکھا۔ آغاز ہی سے مجھے احساس تھا کہ فن پر دسترس حاصل کرنا بہت ضروری ہے، اور یہ کام سنجیدگی اور محنت کے بغیر ممکن نہیں۔

☆ غزل کے لغوی معنی خواتین سے گفتگو کرنا بتلائے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود نہایت خوش شکل اور خوش فکر خاتون کے شعر کہنے کی ابتدا تاخیر سے ہونے کے کچھ اسباب تو رہے ہوں گے۔

☆☆ 'غزل' کے ایک سے زیادہ معنی بتائے جاتے ہیں۔ بہرحال معروف معنی یہی ہیں لیکن یہ کسی خاتون شاعر پر منطبق نہیں ہوتے۔ میں نے جیسے پہلے بھی کہا ہے کہ ہر انسان مختلف طریقے سے اپنی شناخت اور اپنے اندر موجود جوہر کی دریافت کے مرحلے سے گزرتا ہے۔ میں نے تو پھر بھی پچیس برس کی عمر تک اپنے اندر چھپے شاعر کو کسی قدر تلاش کر لیا تھا۔ تاریخ میں دیگر مختلف زبانوں میں بہت سے تخلیق کار ایسے ہیں جنہوں نے بہت دیر سے لکھنا شروع کیا۔ یہاں کوئی موازنہ مقصود نہیں۔ بہرحال ٹونی مورسن (Toni Morrison) نے جنہیں نوبل پرائز بھی مل چکا ہے، چالیس برس کی عمر میں لکھنا شروع کیا تھا۔ پھر مارک ٹوین (Mark Twain) ہنری ملر (Henry Miller) ہیں۔ رابرٹ فراسٹ (Robert Frost) کی پہلی کتاب چالیس برس کی عمر میں شائع ہوئی۔ ہمارے اور سب کے جلال الدین رومی نے بھی چالیس کی عمر کے بعد شعر کہا۔ تو کون کب لکھے گا اور کتنا لکھے گا اس کے لیے عمر کی قید نہیں ہے اور عمر پیمانہ بھی نہیں ہے۔

☆ یہاں ضروری ہو گیا کہ آپ ہمیں پہلے قاری، سامع اور ان کی رائے اور رہنمائی کی بابت وہ کچھ بتلائیں جو پہلے نظر سے نہ گزرا ہو۔

☆☆ جب میں نے لکھنا شروع کیا تو ہم کویت میں تھے۔ وہاں شاعری کی نجی نشستیں ہوا کرتی تھیں جس طرح آج بھی باہر کے ممالک میں یہ سلسلہ قائم ہے۔ وہیں ہم بھی شریک ہو جاتے تھے۔ میری ایک دوست تھیں (اب بھی ہیں) قیصر عرفان۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ ہی لکھنا شروع کیا تھا اور ہم ایک دوسرے کو لکھ کر سناتے بھی تھے۔ ایک دوسرے کی رہنمائی تو نہیں کر سکتے تھے، البتہ حوصلہ

افزائی ضرور کرتے تھے۔

☆ زانوئے تلمذ، اصلاح، مشاورت اور رہنمائی کے مراحل کس وسیلے اور تعلق سے طے ہوئے؟

☆☆ باقاعدہ اصلاح کسی سے نہیں لی۔ ایسا نہیں کہ اس کی ضرورت نہیں تھی بلکہ ایسا ہے کہ ہمارے زمانے تک آتے آتے یہ روایت دم توڑ چکی تھی۔ ویسے بھی اس معاملے میں خواتین کے لیے مشکلات زیادہ ہیں۔ میں نے بھی جب لکھنا شروع کیا تو رہنمائی کی ضرورت تھی۔ اس کا مجھے بخوبی اندازہ تھا لیکن میں نے اپنے لیے جس راستے کا انتخاب کیا وہ مشکل بھی تھا اور طویل بھی لیکن میں نے یہ سفر اپنے شوق کی شدت اور توانائی کے اثر میں طے کیا۔ میں نے مطالعے کو اپنا رہنما کیا۔ کسی نے جہاں بھی کسی غلطی کی نشان دہی کی، اسے یاد رکھا اور اپنی اصلاح کی۔ میں نے باقاعدہ اپنے آپ کو سکھانے کا عمل جاری کیا اور آج تک جاری ہے۔ جسے انگریزی میں self taught کہتے ہیں، یہ بات مجھ پر سو فی صد صادق آتی ہے۔

☆ ان تحفظات کی بابت ابتدا میں بتلا دیجیے جن کے سبب انسانی شناخت ظاہر کرنے سے اجتناب برتا گیا۔

☆☆ یہ سوال اگر میری ذات کے لیے ہے تو اس کا مطلب میں نہیں سمجھ پائی کیونکہ مجھے تو شناخت کا مسئلہ کبھی پیش نہیں آیا۔ البتہ ادبی تاریخ میں عورت کے لیے اپنے نام سے لکھنا، اپنی شناخت کو ظاہر کرنا بہت بڑا مسئلہ تھا۔ رشید النساء اور زرخ ش کا عہد انہی تحفظات سے عبارت ہے۔ ہمارے تجربے میں وہ مشکلات نہیں آئیں۔

☆ ذاتی زندگی میں کم گو بلکہ شرمیلی ہونے کے باوجود شاعری میں آپ کی آواز بلند بھی ہے اور توانا بھی۔

☆☆ یہ بات تو ہے کہ میں بنیادی طور پر خلوت پسند ہوں۔ بہت دیر تک بھیڑ میں نہیں رہ سکتی لیکن میرے خیال میں کسی انسان کے تخلیقی وجود اور تخلیقی عمل کی آبیاری کے لیے یہ صورت مہمیز کا کام کرتی ہے۔ شاید اور لوگ اس سے اتفاق نہ کریں لیکن مجھے لگتا ہے کہ تخلیق کار کو اپنے ساتھ زیادہ وقت گزارنا چاہیے۔ یہ بھی ہے کہ کسی انسان کا تخلیقی تشخص اس کے سماجی تشخص سے مختلف ہوتا ہے اور بعض لوگ اظہار کے لیے عام میل جول کے ذریعے کی بجائے تخلیق کے میڈیم کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کی تمام تر توانائی تخلیق میں منتقل ہو جاتی ہے۔

☆ جناب احمد ندیم قاسمی نے آپ کو صاحب اسلوب شاعرہ گردانا ہے جو کسی اعزاز سے کم نہیں۔ سوال صرف یہ ہے کہ یہ قدرتی دین ہے، اکتساب یا ریاضت؟

☆☆ میرے لیے یقیناً اعزاز کی بات ہے۔ اسلوب کا شعوری طور پر تو انتخاب نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی کرنا چاہیے۔ اسلوب کا تعلق تو شاعر کے ذہن، مزاج، زندگی کے تجربے، اس کے مطالعے، اس کی لفظیات اور فن پر دسترس سے ہوتا ہے۔ یہ محلول تیار ہو کر اسلوب میں ظاہر ہوتا ہے۔ مضمون کی حد تک شاعر کو صرف اپنی سچائی پر توجہ دینی چاہیے۔ میں تقلید کی قائل نہیں ہوں۔ لیکن شاعر کی ایک اہم ذمہ داری یہ ہے کہ وہ شعر کہنے کے فن پر پوری طرح گرفت حاصل کرنے کی، اسے پوری طرح سمجھنے کی کوشش کرے۔

☆ شاخِ گل یقیناً استعارہ ہے مگر اس میں پنہاں جذبات و احساسات، امید اور آرزوؤں سے آگاہی بھی ضروری ہے۔

☆☆ کیسے موسم کے ہاتھ آئے گی
شاخِ گل جو شجر کے اندر ہے

یہ شعر میں نے غور و فکر کے بعد تو نہیں لکھا ہوگا، بے ساختہ لکھا ہوگا جیسے میں اکثر لکھتی ہوں۔ اپنے شعر کی وضاحت کرنا مجھے مشکل لگتا ہے۔ البتہ جس کا یہ شعر ہے اس کی پوری شخصیت اس میں نظر آ رہی ہے۔ یہی کہہ سکتی ہوں۔

☆ آپ کی شاعری میں داخلی کیفیات کو بڑا دخل ہے۔ اس کیفیت کے برتاؤ میں وقت اور فارم کے استعمال کا کلیہ کیا ہے؟

☆☆ میرے خیال میں آپ نے فرمایا ہے کہ میری شاعری میں داخلی کیفیات حاوی رہتی ہیں۔ اس کا بھی تعلق شاعر کے تخلیقی مزاج سے ہے۔ بعض لوگ خارجی واقعات کو بھی داخلی سطح پر بیان کرتے ہیں۔ میرے نزدیک اس میں وقت یا فارم کے استعمال کا کوئی کلیہ نہیں ہے۔ جو بات جس وقت جس ہیئت کا اپنے لیے انتخاب کرتی ہے اس میں بیان کر دی جاتی ہے۔

☆ کچھ احباب آپ کے ہاں ابہام کی نشان دہی کس بنا پر کرتے ہیں؟

☆☆ ضرور کرتے ہوں گے۔ میں دانستہ طور پر اپنی نظم یا شعر میں ابہام پیدا نہیں کرتی لیکن میں سمجھتی ہوں کہ ایک لطیف ابہام شاعری کے حسن میں اضافہ کرتا ہے۔ ورنہ تو آپ اخبار پڑھ لیں۔ شاعری کی تفہیم میں قاری کا اپنا حصہ ضرور ہونا چاہیے۔ یہی تو اس کا لطف ہے۔ ابہام اکثر استعارے کے استعمال سے پیدا ہوتا ہے۔ استعارے اور ابہام ہی کے ذریعے شاعری میں تہہ داری پیدا ہوتی ہے۔ قاری اپنے تجربے کی بنیاد پر اس سے معنی کشید کرتا ہے۔ نظم کے تسلسل میں موجود وقفوں یا خالی جگہوں کو قاری خود معنی دیتا ہے۔ البتہ مبہم اور مہمل میں فرق کرنا ضروری ہے۔

☆ آپ کی روحانی جدوجہد میں ملال کی کیفیت کس محرومی کی نشان دہی کرتی ہے؟

☆☆ نعمتیں اور محرومیاں انسان کی زندگی کے ساتھ ساتھ ہیں۔ البتہ تخلیقی سطح پر ملال کے اظہار کا تعلق حالات سے زیادہ شاعر کے مزاج سے ہوتا ہے۔ اس ازلی بے چینی سے ہوتا ہے جو اسے عام آدمی سے الگ کرتی ہے، ایک تخلیق کار بناتی ہے۔ میرے خیال میں تخلیقی عمل اس مستقل بے چینی اور طبیعت میں ارتعاش کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے ہر تخلیق کار کا تجربہ اس ضمن میں مختلف ہوتا ہے۔ حالات اثر انداز ہوتے ہیں لیکن اس اثر کے ذریعے وہ کس درجہ اور کس شدت

سے اظہار کر پاتا ہے یہ ایک انفرادی مسئلہ ہے۔

☆ آپ کی شاعری میں جس تنہائی کا ذکر نظر آتا ہے آج کے انسان کی تنہائی پر اسے کس طور منطبق کیا جا سکتا ہے؟

☆☆ اپنے شعری اظہار کی معنوی سمتوں کے بارے میں بات کرنا مشکل عمل ہے۔ یہ کام دوسرے بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔ اس سوال کا جواب بھی اس سے پہلے دیے گئے جواب کی ایک شکل ہو سکتی ہے۔ تنہائی تخلیق کو مہمیز کرتی ہے۔ انسان اپنے وجود کی کائنات میں ہمیشہ سے تنہا ہے۔ تخلیق کار اس تنہائی کو محسوس زیادہ کرتا ہے۔ جدید دور کے تقاضوں نے اس میں مزید اضافہ کیا ہے۔ ہمارے عہد میں زندگی کے مطالبات نے ایک تخلیق کار کی anxiety کو بڑھا دیا ہے۔ تخلیق کار کا ذہن جتنا پیچیدہ ہوگا اسی درجہ وہ اپنے ماحول میں اجنبیت محسوس کرے گا اور اس کا اظہار بھی کرے گا۔ یہ ضرور سمجھنا چاہیے کہ ہمارے عہد کا تخلیق کار معاشرے کا فعال فرد بھی ہے اور وہ اپنی ذمہ داریوں کو جانتا ہے۔ اس کا تخلیقی وجود اکثر اس کے سماجی وجود سے ٹکراتا ہے۔ یہی تصادم تنہائی کے احساس میں اضافہ کرتا ہے اور یہی احساس جدید تخلیقی رویوں میں نمود کرتا ہے اور نئے طرزِ احساس کو خلق کرتا ہے۔

☆ ابہام اور بے جوڑ ٹکڑوں کے اتفاقی ارتباط کی بات کر کے ڈاکٹر ابو الکلام قاسمی کس امر کی نشان دہی کرنا چاہتے ہیں؟

☆☆ میں نے ہی اپنی ایک کتاب کے دیباچے 'چند باتیں' میں لکھا تھا کہ ''ابہام اور بے جوڑ ٹکڑوں کے اتفاقی ارتباط میں فرق کرنا چاہیے۔'' ڈاکٹر قاسمی نے اسی بات کا حوالہ دیا ہے۔ اس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ شاعری میں حجاب کا حسن بڑی چیز ہے لیکن اسے اپنے اوپر طاری کرنے کی کوشش میں کامیابی کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔ معنی بات کے بطن اور اس کی روح میں موجود ہونے چاہییں۔ انھیں باہر سے اس کے قالب میں منتقل نہیں کیا جا سکتا۔

☆ انگریزی زبان و ادب کے زیر اثر ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو غزل کو از کار رفتہ اور متروک ٹھہرا کر نظم کو فوقیت دینا چاہتا ہے؟

☆☆ یہ بحث تقریباً ایک سو برس پرانی ہے لیکن اردو زبان میں ابھی غزل خاصی تر و تازہ ہے۔ میرے خیال میں غزل اور نظم کا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ ہر صنف اور ہر ہیئت کی ساخت منفرد ہوتی ہے اور جب تک ان ہیئتوں میں شاعری ہوتی رہے گی یہ زندہ رہیں گی ورنہ خود بخود غیر مقبول ہوں گی اور آہستہ آہستہ متروک ہو جائیں گی، جیسے اب قصیدہ اس طرح نہیں لکھا جاتا جیسے دو سو برس پہلے لکھا جاتا تھا۔ نظم انگریزی ادب سے اردو میں نہیں آئی۔ نظمیں تو نظیر اکبر آبادی نے بھی لکھیں۔ قصیدہ اور مثنوی بھی نظم ہی کی قسم ہے۔ یہ کہہ سکتے ہیں کہ نظم کی بعض ہیئتیں مغرب سے اردو ادب میں داخل ہوئیں، جیسے نظم معریٰ، آزاد نظم اور نثری نظم۔ اردو شاعری میں لیکن یہ ہیئتیں بہت مقبول ہوئی ہیں۔ دراصل شاعری کے مضامین، میرے خیال میں، اپنے لیے خود ہیئت کا انتخاب کرتے ہیں۔ اس وقت غزل بھی اچھی کہی جا رہی ہے اور نظم کی جن ہیئتوں کا ذکر اوپر ہوا ہے ان میں بھی کامیاب نظمیں لکھی جا رہی ہیں۔ سو فی الوقت غزل کے متروک ہونے کا امکان نہیں ہے۔ کم سے کم میں یہی سمجھتی ہوں۔

☆ خواتین کی زندگی کے وہ کون سے پہلو ہیں جن پر تحقیق کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور جستجو کا ثمر کیسا رہا؟

☆☆ میرا مضمون تو ادب ہے اور میں کوئی محقق بھی نہیں ہوں۔ البتہ خواتین کی ادبی روایت مرکزی دھارے سے الگ کیوں رہی، اس سوال کو میں اہم سمجھتی ہوں اور صرف اردو ادب ہی میں نہیں بلکہ دنیا کی دوسری تہذیبوں میں بھی ماضی میں عورت کی تخلیقی صلاحیتوں کو اہمیت نہیں دی گئی اور اس کے لکھے ہوئے لفظ کو محفوظ بھی نہیں کیا گیا۔ بیسویں صدی میں اس موضوع پر تنقیدی اور تحقیقی سطح پر، مغرب میں بہت لکھا گیا ہے اور خواتین کی گمشدہ تحریروں کو تلاش کر کے انہیں مرکزی دھارے کا حصہ بھی بنایا گیا ہے۔ مجھے خواتین کی برآمد شدہ تحریریں اور ان پر لکھے ہوئے مضامین پڑھنے اور اس صورت حال کو سمجھنے سے دلچسپی رہی ہے۔ اس ضمن میں چند مضامین بھی لکھے ہیں۔ اپنے خطے کی خواتین کی تخلیقات پر مبنی انگریزی کے جریدے Pakistani Literature کو بطور مہمان مدیر مرتب بھی کیا ہے۔

☆ غالب کا ''افسونِ انتظار'' اور یاسمین حمید کے ''امید کے آزار'' میں کوئی مماثلت تلاش کرنا چاہے تو نتیجہ کیا برآمد ہوگا؟

☆☆ ایک ہی سانس میں یہ دونوں نام نہیں لینے چاہییں۔ البتہ یہ مضمون تو پوری کائنات کا مسئلہ ہے۔ امید ایک بہت توانا احساس ہے۔ امید کے آزار بن جانے کی منزل بھی ایک تجربہ ہے۔ تکلیف دہ بھی ہے اور ایک بڑی حقیقت بھی۔ میں نے بھی اپنی بساط کے مطابق اس کا اظہار کیا ہے۔

مقید عرصۂ ایثار میں ہوں
حصارِ بے در و دیوار میں ہوں
مری آنکھیں گواہی دے رہی ہیں
کسی امید کے آزار میں ہوں

☆ میتھو آرنلڈ نے شاعری کو سویٹنس اور لائٹ کم سے کم، تیرگی اور دھواں فزوں تر کے پیمانوں میں تقسیم کر کے آپ کی شاعری کی نسبت صورتِ حال کی وضاحت پر مجبور کیا ہے۔

☆☆ میتھو آرنلڈ نے تہذیب و ثقافت کے ضمن میں 'sweetness and light' کی ترکیب استعمال کی تھی۔ sweetness سے مراد حسن اور خوبصورتی اور light سے مراد ذہانت۔ اگر شاعری کو بھی دیکھیں تو میرے خیال میں اس میں دلکشی، فکر، اندھیرے اور دھند، کی آمیزش ملتی ہے۔ شاید تمام تر سچی شاعری میں یہ سب عناصر یکجا ہو جاتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ میری شاعری میں ایسا ہے یا نہیں۔ اس کا فیصلہ تو پڑھنے والا ہی کرے گا۔

☆ نثری نظم کے پردے میں برہمی، تلخی اور محرونی وقت کے ساتھ آپ کے ہاں شدت سے نمایاں ہونے کے اسباب کیا ہیں؟

☆☆ برہمی، تلخی اور محرونی کو اگر پڑھنے والے نے محسوس کیا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ شاعر اپنی بات کہنے میں کسی حد تک کامیاب ہے۔ یہ سب احساسات دراصل انسان کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں، کبھی زیادہ نمود کرتے ہیں کبھی کم اور پھر بعض اوقات تخلیقی لمحوں میں اظہار کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ میرے نزدیک بات کہنے کے لیے مناسب ہیئت اہمیت رکھتی ہے۔ بعض احساسات اور تصورات کے بیان کے لیے غزل موزوں صنف ہے بعض کے لیے نظم کی مختلف ہیئتیں زیادہ مناسب ہیں۔ میں نے اپنے آپ کو کبھی کسی ایک ہیئت یا صنف کا پابند نہیں کیا۔ اس لیے جب میں نے اچھی نثری نظمیں پڑھنا شروع کیں تو میں نثری نظم کی طرف مائل ہوئی۔ ممکن ہے میرے لیے یہ ہیئت بعض احساسات کی صورت گری میں زیادہ مناسب رہی ہو۔ آج بھی غزل، نظم معریٰ، آزاد نظم، نثری نظم، ان سب ہیئتوں میں لکھتی ہوں۔

☆ پیور پوئٹری اور اٹلکچول پوئٹری میں تخصیص کرتے ہوئے سحر انصاری صاحب نے آپ کو موخرالذکر کیٹگری میں شمار کر کے دیگر شاعرات کی نسبت سوالیہ نشان کھڑا کر دیا ہے۔

☆☆ بعض شاعر صرف جذبے کی بنیاد پر شعر کہتے ہیں اور بعض کے ہاں فکری عنصر حاوی رہتا ہے لیکن مجھے بہتر صورت ان دونوں کے امتزاج میں نظر آتی ہے۔ 'پیور پوئٹری' کی اصطلاح عام طور پر ایسی شاعری کے لیے استعمال ہوتی ہے جو مقصدیت سے مبرا ہو، جس میں کوئی پیغام وغیرہ نہ ہو۔ زبان کے تخلیقی استعمال اور شاعر کے انفرادی تخیل کی کارفرمائی ہو۔ اٹلکچول پوئٹری کی بھی مختلف تعریفیں بتائی جاتی ہیں۔ میرے نزدیک یہ وہ شاعری ہے جس میں فکری عناصر موجود ہوں۔ یہ سحر انصاری صاحب کی رائے ہے۔ ان کی رائے سر آنکھوں پر۔ میں کسی منصوبہ بندی کے تحت کبھی نہیں لکھتی۔ مجھے تو جو خیال متاثر کرتا ہے اسے نظم کر دیتی ہوں۔ البتہ ذاتی طور پر میں شاعری میں یعنی کسی اور کی شاعری میں فکری عناصر سے ضرور متاثر ہوتی ہوں۔

☆ برادرم حمید شاہد نے آپ کے خوابوں کا ذکر تصویری معنیات کے حوالے سے جس خوبصورت طریق پر کیا ہے اس کی روشنی میں بادہ و ساغر کہے بنا بات بنے گی نہیں۔

☆☆ جو بات حمید شاہد صاحب نے کہی ہے اس کا جواب تو وہ خود ہی دے سکتے ہیں۔ البتہ میں یہ ضرور کہہ سکتی ہوں کہ مجھے شاعری میں امیجری یا تصویری پیکروں اور استعاروں کا استعمال پسند ہے۔

شاخ و گل و ثمر کی بات کون کرے کہ ایک رات
بادِ شمال آئی تھی باغ کا باغ لے گئی

سلیم احمد کا شعر ہے اور جو بات میں نے کہی اس کی تصدیق کرتا ہے۔ اس نوع کا اظہار مجھے ذاتی طور پر متاثر کرتا ہے۔

☆ یہ ہی صاحب آگے بڑھتے ہوئے فیمنزم کا ذکر کر کے آپ کے برتاؤ کو فہمیدہ ریاض اور پروین شاکر سے مختلف بتلا کر گفتگو کا ایک اور در وا کر رہے ہیں۔

☆☆ عورت کی حسیت مرد کی حسیت سے مختلف ہے کیونکہ اس کا وجودی اور خارجی تجربہ مختلف ہے لیکن اپنی حسیت میں ایک عورت بھی دوسری عورت سے مختلف ہو گی کیونکہ وہ ایک فرد بھی ہے اور کوئی ایک فرد اپنے پورے وجود، اپنی فکر، اپنے ماحول کے اثرات میں کسی دوسرے فرد کی طرح نہیں ہو سکتا، نہ ہی تخلیقی سطح پر اس کا اظہار ایک سا ہو سکتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ فیمنزم یا تانیثیت با قاعدہ ایک تحریک کا نام ہے جو دو سو برس سے زیادہ کو محیط ہے اور جس کے مختلف ادوار ہیں۔ یہاں اس کے بیان کی گنجائش نہیں ہے۔ دراصل ہر اور ہر جنل لکھنے والے کی، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، ایک دوسرے سے علیحدہ تخلیقی شناخت ہو گی اور ہونا بھی یہی چاہیے۔ میں نے اپنے تجربے کو لکھا ہے، عورت ہونے کے تجربے کو بھی اور بحیثیت ایک فرد کے بھی۔ اس لیے میرے اظہار کو مختلف ہی ہونا چاہیے۔

☆ مبین مرزا صاحب نے ایذرا پاؤنڈ کے حوالے سے شاعری کو شعور کی تجلّی بنانے کا جو حوالہ دیا ہے آپ اس سے کس حد تک اتفاق کرتی ہیں اور احساس کی مشترک میراث بنانے کے لیے کس امر کو بروئے کار لاتی ہیں؟

☆☆ ایذرا پاؤنڈ جدیدیت کے بنیاد گزاروں میں تھے اور Imagism کی تحریک میں ان کا کردار مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی تنقیدی بصیرت کے بھی بہت سے حوالے ہیں جن میں اہم ترین ایلیٹ کی نظم The Waste Land ہے جسے انھوں نے ایڈٹ کیا تھا۔ شاعری یا کسی بھی تخلیقی عمل کا تعلق شعور سے ہوتا تو ہے۔ لیکن میرے خیال میں صرف شعور سے نہیں ہوتا بلکہ شعور اور لاشعور کے درمیان کسی علاقے میں اس عمل کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ تخلیق کے اسرار کا ممبا لاشعور ہی میں ہوتا ہے۔ شعور اس کے اظہار کا ذریعہ فراہم کرتا ہے۔ احساس کی سرحدیں بھی کبھی واضح نہیں ہوتیں۔ احساس کی لاتعداد پرتیں ہوتی ہیں جن کا تعین ممکن نہیں۔ اسے سیاہ اور سفید میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ احساس اور شعور و لاشعور کے امتزاج ہی سے تخلیقی اظہار کی صورت گری ممکن ہے۔

☆ آگے چل کر مبین مرزا صاحب ورجینا وولف کا حوالہ دیتے ہوئے مجبوری، معذوری، مظلومیت کی بجائے عورت کے صنفی مسئلے کو گفتگو کا موضوع بناتے ہوئے آپ کو ادا جعفری، زہرا نگاہ اور شبنم شکیل کا ہم خیال کس اعتبار سے بتلا رہے ہیں؟

☆☆ آپ ہر سوال میں مجھ سے کسی اور کی کہی ہوئی بات کی توضیح طلب کر رہے ہیں۔ یہ تو مبین مرزا صاحب ہی بتا سکتے ہیں کہ انھیں کیا مماثلت نظر آتی ہے۔ مجھے اپنا مزاج ان سب سے مختلف لگتا ہے۔ دراصل یہ تینوں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ کسی ایک جہت میں ممکن ہے مماثلت تلاش کی جا سکتی ہو

لیکن ہر فرد کا خواہ وہ مرد ہو یا عورت، تخلیقی تشخص اپنا اور صرف اپنا ہوتا ہے جسے کلی طور پر کسی اور کے مماثل قرار نہیں دیا جا سکتا ۔ ہر ایک کا مزاج ، ذہن، تجربہ، حالات، تخلیقی تشخص ہر دوسرے شخص سے مختلف ہوتا ہے۔

☆ جناب امجد اسلام امجد آپ کو نئی زمینوں کی تلاش کا کریڈٹ دے کر ہمیں تفصیل جاننے پر اکسا رہے ہیں۔

☆☆ میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ میں کسی منصوبہ بندی کے تحت نہیں لکھتی اور میں تقلید کی بھی قائل نہیں ہوں۔ میں نے کبھی کسی اور کی طرح لکھنے کی کوشش نہیں کی بلکہ میں نے شروع ہی میں جان لیا تھا کہ میں فلاں اور فلاں کی طرح نہیں لکھنا چاہتی۔ مجھے فکر کو انگیخت کرتی ہوئی شاعری ہمیشہ زیادہ پسند تھی۔ سو ہو سکتا ہے کہ اس وجہ سے نئی زمینوں کی تلاش کا سفر کسی کو میرے شعر میں محسوس ہوا ہو۔

☆ آپ کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے سحر انصاری صاحب نے میر تقی میر کی ناکامیوں کا ذکر کرنا کیوں ضروری جانا؟

☆☆ میر کو ناکامیوں سے کام لینا آتا تھا۔ اگر ہمت اور سلیقہ ہو تو ناکامیوں سے بڑی قوت کشید کی جا سکتی ہے اور اگر کسی کے حصے میں یہ سلیقہ آ جائے تو وہ خوش نصیب ہے۔ تخلیق کے لیے اس سے عمدہ خام مال کوئی نہیں ہے۔

☆ شہزاد احمد صاب نے غزل کی بساط کو شطرنج کی بساط سے مماثل بتلا کر کس جانب اشارہ کرنے کی کوشش کی ہے؟

☆☆ میرے سامنے ان کا مضمون نہیں ہے کہ اس بات کا سیاق وسباق جان سکوں۔ البتہ شطرنج کی بساط میں کھلاڑی کے لیے بڑا امتحان پوشیدہ ہوتا ہے۔ ایک غلط چال سے بساط الٹ سکتی ہے۔ غزل کہنا بھی کلی طور پر شاعری ہی شاعر کے لیے بڑا challenge فراہم کرتی ہے۔ ایک ایک لفظ کا استعمال ایک ایک خیال کی ترسیل کیسے ہو کہ شعر کا ایک خاص معیار قائم رہے۔ مصرع سازی کے لیے بڑی ہنرمندی درکار ہے جو ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ غالباً اس ضمن میں غزل کی بساط کو شطرنج کی بساط کہا ہوگا۔ یا غالباً غزل کے امکانات کی ضمن میں انھوں نے یہ بات کہی ہو۔ ان کا مضمون دیکھیں تو معلوم ہو جائے گا۔

☆ آگے چل کر شہزاد صاحب نے آپ کی شاعری کو کہانی بتلا کر کس جانب اشارہ کرنے کی کوشش کی ہے؟

☆☆ کہانی بھی ہر شخص کی اپنی ہوتی ہے، منفرد، جس کے ہر موڑ پر کوئی نیا واقعہ سننے یا پڑھنے والے کا منتظر ہوتا ہے۔ یہ بات بھی امکانات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ شہزاد صاحب نے ۱۹۹۱ میں شائع ہونے والے میرے دوسرے شعری مجموعے کے اجرا کے موقعے پر یہ تحریر پڑھی تھی۔ اس کے بعد میرے تین مجموعے شائع ہوئے اور ایک تقریباً تیار ہے۔ میں کہاں تک امکانات کو بروئے کار لانے میں کامیاب ہوئی یا نہیں ہوئی یہ تو میری شاعری پڑھنے والا ہی فیصلہ کر سکتا ہے، میں خود تو کچھ نہیں کہہ سکتی سوائے اس کے کہ میں نے دوسرے مجموعے کے بعد نظم پر بھی توجہ دی بلکہ غزل کی نسبت نظم زیادہ لکھی۔

☆ فاروقی صاحب کی رائے کے مطابق آج کے دور کی شاعرات اپنا پیغام شاعری میں داخل کرنا لازمی سمجھتی ہیں۔ آپ اس حوالے سے کیا کہنا اور کرنا پسند کریں گی؟

☆☆ یہ بات انھوں نے میری شاعری کے لیے نہیں کہی تھی بلکہ اسے خاص طور پر عام روش سے الگ کہا تھا۔ اپنے لیے میں یہ ضرور کہہ سکتی ہوں کہ میں نے کبھی کوئی بات اس لیے نہیں لکھی کہ سب لکھ رہے ہیں تو مجھے بھی ایسا کرنا چاہیے یا یہ بات fashionable ہے اور کسی ایک طبقے میں مقبولیت کے لیے لازمی ہے۔ میں نے صرف وہ لکھا جو خود محسوس کیا۔ میرے ہاں ایسے مضامین موجود ہیں لیکن میں نے انھیں اپنے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ جس طرح دیکھا اور محسوس کیا ہے اس طرح سچائی سے بیان کیا ہے۔

☆ فاروقی صاحب سیاست کو گندے دھوئیں سے مماثل گردان کر ادیب اور شاعر کو اس سے دور رہنے کی تلقین فرماتے ہیں۔ آپ اور آپ کا قلم اس حوالے سے کس رویے کو درست گردانتے ہیں؟

☆☆ شاعر کو ہر وہ بات بیان کرنی چاہیے جسے وہ شدت سے محسوس کرے جو اسے ذہنی اور جذباتی سطح پر متاثر کرے اور اسے بیان کرنا اس کی مجبوری ہو۔ سچائی جیسی بھی ہو، اگر شاعر کا مسئلہ ہے تو ضرور بیان میں آنی چاہیے۔ اس سے پہلے سوال میں بھی اسی نوعیت کی بات کی گئی تھی۔ یہ ممکن نہیں کہ آپ کے اردگرد جو کچھ ہو رہا ہے وہ آپ کو متاثر نہ کرے۔ لیکن اظہار کے طریقے مختلف ہوتے ہیں۔

☆ خالدہ حسین کے بقول آپ کے ہاں علم اور شعور معلومات نہیں تجربات کی صورت ظاہر ہوتے ہیں۔ صفِ نازک اور تجربات! مشکل اصطلاح ہے جس کی وضاحت آپ ہی فرما سکتی ہیں۔

☆☆ 'صنف نازک' کی اصطلاح اب مستعمل نہیں ہے۔ اسے استعمال کرنا مناسب نہیں سمجھا جاتا۔ اور تجربات کیا عورت کے حصے میں نہیں آ سکتے؟ یہ کس نے کہا؟ علم اور شعور کا اظہار تخلیقی سطح پر جب بھی ہوگا تو وہ تجربے ہی کی صورت میں ممکن ہے۔ محض معلومات کی بنیاد پر شاعری ممکن نہیں۔ شعری اظہار تجربے کے بغیر نامکمل ہے۔

☆ عورت کو چار دیواری تک محدود رکھنے کا شائق معاشرہ تجربات تو کجا' آزاد سوچ' فکر اور پسند و ناپسند کو بے راہ روی کے کھاتے میں ڈال کر کاری اور بدچلن گردان کر جان لینے سے بھی نہیں چوکتا؟

☆☆ اگر پورے معاشرے کو دیکھا جائے تو یہ بات درست ہے کہ عورت کے ساتھ یہاں انصاف روا نہیں رکھا جاتا اور مختلف علاقوں کے بعض فرسودہ رسم ورواج عورت کو اس کا جائز حق دینے کو تیار نہیں ہیں۔ اس کے لیے تو بڑے پیمانے پر منصوبہ بندی اور قوانین بنانے اور ان پر عمل کرنے اور کروانے کی ضرورت ہے۔ کاری اور ونی کو اپنی روایات سمجھنے والا معاشرہ ایسی غیر انسانی رسموں کے خلاف کم

سے کم قانون سازی تو کرے۔اس طرح کے جرائم کے مرتکب لوگوں کو سزائیں تو دی جائیں۔ جہالت ختم کرنے اور ذہنیت بدلنے کی ضرورت ہے۔ یہ بات اب لمبی ہے لیکن مختصراً یہ کہ ادبی معاشرے میں اب عورت پر وہ پابندی نہیں ہے جو ایک سو برس پہلے تھی۔ یہ میں نے پہلے بھی کہا ہے۔عورت اظہار کی سطح پر بہت کچھ کہہ سکتی ہے، اپنے نام اور اپنی شناخت کے ساتھ کہہ سکتی ہے۔اب بھی مسائل تو ہیں جن کی نوعیت مختلف ہے لیکن حالات پہلے کی نسبت بہتر ہیں۔ یہ بات البتہ ایک چھوٹے طبقے کے لیے ہی کہی جاسکتی ہے۔تقسیم شدہ معاشرہ ہے۔طبقات میں بٹا ہوا ہے، معاشی سطح پر بھی اور ذہنی سطح پر بھی۔

☆ رضی مجتبیٰ صاحب نے آپ کی شاعری کے انتخاب میں ٹی ایس ایلیٹ کی جمالیاتی ہیئت آشنائی، گمبھیر پیچیدگی اور گردش احساس کا ذکر کس مناسبت کے سبب کرنا ضروری جانا؟

☆☆ یہ سوال بھی مجھ سے پوچھنے کا تو نہیں ہے۔اگر انتخاب اس بنیاد پر ہوا ہے تو میرے لیے مسرت کا مقام ہے۔ یہ آج کے عہد اور آج کے ذہن کی علامات ہیں۔ بیانیہ شاعری بھی لوگ کرتے ہیں اور ایسی شاعری مقبول بھی ہو جاتی ہے کیونکہ بیانیہ اسلوب میں عام طور پر گرہیں نہیں ہوتیں۔ اسلوب کی پیچیدگی بھی دراصل خیال کی تہہ داری ہی سے وابستہ ہے۔ مجھے ذاتی طور پر یہ اسلوب پسند ہے۔ میں دانستہ طور پر کچھ نہیں کرتی۔ تخلیقی عمل کے دوران یہ اسلوب خود بخود مجھ پر غالب آجاتا ہے۔ دراصل شاعر خام مال تو غیر تخلیقی لمحوں میں جمع کرتا ہے۔ تخلیقی لمحوں میں خیال کی رَو اور اظہار کی توانائی خود بخود راستہ تجویز کرتی ہے۔

☆ آپ کے خیال میں انسانی سوچ کا بڑا حصہ درمیانی عمر میں جکڑا ہونے کے اسباب کیا ہیں اور یہ dichotomy ہمارے شعور میں ٹوٹ پھوٹ کا سبب کیوں بنتی ہے۔ سلیم الرحمٰن صاحب نے اس حوالے سے آپ کی شاعری کو نجی اور اختراعی ثابت کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی۔

☆☆ سب سے پہلے تو اس سوال کی تصحیح ہونی چاہیے۔ سلیم الرحمٰن صاحب نے میری کتاب ''ہم دو زمانوں میں پیدا ہوئے'' پر کالم انگریزی زبان میں لکھا تھا۔ دو جملے محلِ نظر ہیں۔ ایک تو انھوں نے 'middle ages' لکھا تھا جس کے معنی 'درمیانی عمر' نہیں بلکہ 'قرونِ وسطیٰ' ہیں۔ انھوں نے لکھا تھا کہ جدید زمانے میں رہتے ہوئے ہماری سوچ قرونِ وسطیٰ کی رجعت پسندی سے اب بھی متاثر ہے۔ یہ بات انھوں نے کتاب کے نام کے حوالے سے کی تھی۔ میں نے دراصل یہ نام جدید عہد اور ماضی قریب کے عہد کے حوالے سے دیا تھا۔ میری نظم کا ٹکڑا ہے۔

''ہم دو زمانوں میں پیدا ہوئے
ہمارے بچوں کی حقارت ہمیں بتائے گی
ہمارا نام کس زمانے میں درج ہوا''

تجزیہ نگار کا استحقاق ہے کہ وہ جس طرح چاہے متن کا تجزیہ کرے۔ دوسری بات انھوں نے یہ لکھی تھی کہ "Her poetry is often private and reclusive" جس کے لیے 'نجی اور اختراعی' کے بجائے 'داخلی اور ذاتی' زیادہ مناسب الفاظ ہیں۔ جہاں تک داخلیت پسندی کا تعلق ہے تو یہ بات درست ہے کہ میں شاعری میں داخلی تجربے کو بہت اہمیت دیتی ہوں۔ میرے خیال میں خارجی واقعات بھی جب تک شاعر کے وجود میں پوری طرح حل ہو کر اس کا حصہ نہ بن جائیں، ان کا شعری پیرائے میں موثر اظہار ممکن نہیں۔

☆ ایک زمانے میں انگریزی ادب کی طرز پر اُردو ادب میں بہت سے نظریے اور ازم کا غلغلہ عام تھا۔ وقت کی تیز رفتاری نے سب کو پچھاڑ دیا۔ اس کے باوجود نجیب جمال صاحب آپ کی شاعری کو مابعد جدید کے امکانات کو روشن کرنے کا ذمہ دار گردان رہے ہیں؟

☆☆ انگریزی ادب یا اُردو ادب کی بات نہیں۔ مابعد جدید کی اصطلاح کوئی نظریہ بھی نہیں ہے۔ جو بنیادی بات ہے وہ یہ ہے کہ ہر عہد یکساں نہیں ہوتا، نہ ہو سکتا ہے۔ ادبی رجحانات بھی وقت کے ساتھ تبدیل ہوتے ہیں۔ کوئی تحریک بھی اثر انداز ہو سکتی ہے جیسا کہ اُردو ادب میں ہوا اور نئے میلانات بھی داخل ہوتے ہیں۔ انھیں نام دیں یا نہ دیں بہرحال یہ تبدیلیاں ناگزیر ہیں۔ شاعری کی بات کریں تو پچھلے دو سو برس میں مضامین، اسالیب، شعری ہیئتیں، سب میں تبدیلی آئی ہے اور ادب میں یہ رجحان کسی عہد کے عمومی رجحانات کے زیر اثر ہوتا ہے، جس میں سوچنے کا انداز تبدیل ہوتا ہے، طرز احساس تبدیل ہوتا ہے۔ مغرب میں دوسری جنگِ عظیم کے بعد کے زمانے کو مابعد جدید کہا گیا۔ ہمارے ہاں انیس سو ساٹھ کی دہائی کے ساتھ اس اصطلاح کا استعمال ہوا۔ اس اصطلاح کے استعمال کی وجہ سے کوئی نئی کارفرمائی نہیں ہوئی بلکہ وہ تو ناگزیر تھی اور یہ سلسلہ جاری و ساری رہنے کے لیے ہے۔ آپ چاہیں تو اسے کوئی اور نام دے دیں۔ بات یہ ہے کہ تخلیق کار کے ذہن کو اپنے عہد کا آئینہ دار ہونا چاہیے۔ ایسا ہوگا تو اس کی تخلیق بھی اپنے عہد کی نمائندگی کرے گی۔ ہم ۲۰۲۱ میں انیسویں صدی کی زبان نہیں لکھیں گے۔ ہمارے استعارے اور ہماری علامتیں تبدیل ہو گئی ہیں۔ ہمارا طرزِ احساس مختلف ہے۔ یہ سب کچھ ادبی تخلیق میں نظر آنا چاہیے۔

☆ تراجم کی جانب آپ کی توجہ کس سبب مبذول ہوئی اور اب تک کس کس زبان کے کتنے شعرا و ادبا کو اُردو زبان میں منتقل کر چکی ہیں؟

☆☆ میں نے اُردو سے انگریزی میں ترجمے کیے ہیں اور انگریزی سے اُردو میں بھی کیے ہیں۔ میں نے سب سے پہلے ترجمہ اکادمی ادبیات کے انگریزی رسالے Pakistani Literature کے لیے کیا تھا۔ یہ کام مجھے مظفر اقبال صاحب نے سب سے پہلے دیا تھا۔ انھیں پسند آیا اور شائع ہوا تو ترجمے میں میری دلچسپی بڑھ گئی۔ سو میں نے بعد از اقبال اُردو نظم کا ترجمہ کیا جو ۲۰۱۰ میں کتابی صورت میں شائع ہوا ۔ OUP نے Pakistani Urdu Verse کے نام سے یہ کتاب شائع کی تھی۔ جس میں ۶۳ اُردو کے نظم

نگاروں کا تعارف' تنقیدی نوٹ اور نظموں کا ترجمہ ہے۔ انگریزی سے اُردو کے تراجم کی بھی ایک کتاب تیار ہے جسے جلد شائع ہو جانا چاہیے۔ میں نے اپنی ہم عصر عذرا عباس کی طویل نظم کا بھی انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ اس کی دوسری اشاعت جلد متوقع ہے۔

☆ اس سے ملتا جلتا سوال آپ کے تنقیدی رویے اور آپ کی شخصیت و فن پر تحریر کردہ جائزوں کی نسبت بھی ضروری ہے مثلاً ناقدین آپ کے تخلیق پاروں کی روح تک رسائی حاصل کرنے میں کس حد تک کامیاب رہے؟

☆☆ جن ادیبوں، نقادوں نے میری شاعری کا جائزہ لیا اور رائے دی ہے، مضمون کی صورت میں یا تنقیدی نوٹ کی صورت میں ان کی احسان مند ہوں۔ ان میں میرے سینئر بھی شامل ہیں اور یونیورسٹیوں کے طالب علم بھی ہیں۔ کامیابی کے بارے میں فیصلہ کرنا میرا کام نہیں ہے۔

☆ شاعری، تنقید، تراجم حتیٰ کہ انٹرویو کا آپس میں کچھ تال میل ہے مگر گندم کے آٹے کی مضبوطی اور جانوروں کی پرکھ قطعی طور پر الگ مضامین ہیں۔ کجا نیوٹریشن اور ٹیکسٹائل سے آپ کی دلچسپی اُردو ادب اور شاعری کے قاری کے لیے حیرت کا باعث بن رہی ہے۔

☆☆ میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ میری رسمی تعلیم ادبی دلچسپیوں سے مختلف ہے۔ میرا تعلق اس نسل سے ہے جن کی زندگیوں کے بہت سے فیصلے ان کے والدین کیا کرتے تھے۔ اس وقت تک میری ادب میں دلچسپی واضح نہیں ہوئی تھی۔ میٹرک میں سائنس کے مضامین پڑھے تھے اور نمبر بھی بہت آئے تھے۔ گھر والے بضد تھے کہ میں طب کی طرف جاؤں یعنی والدہ کی طرح ڈاکٹر بنوں۔ وہ میں نہیں چاہتی تھی۔ میں نے فائن آرٹس پڑھنے کی خواہش ظاہر کی لیکن پھر امّی نے فیصلہ کیا کہ ہوم اکنامکس کالج میں داخلہ لوں تو ان کی بات مان لی۔ دراصل میں نے اپنے آپ کو بطور شاعر اس کے بعد دریافت کیا۔ لیکن جس کالج میں میری تعلیم ہوئی وہ اس زمانے کے بہت اچھے کالجوں میں شمار ہوتا تھا اور میں سمجھتی ہوں کہ میں نے وہاں بھی بہت کچھ سیکھا ہے۔ میں اس تجربے کو اپنے لیے بہت مفید سمجھتی ہوں۔

☆ باہر کی ہوا، در و دیوار کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے جبس اور لُو کی کیفیت پیدا کرنے پر بضد ہے۔ اس کے بعد چراغوں کی لَو تو دور کی بات ان کا وجود برقرار رکھنا بھی دشوار نظر آتا ہے۔

☆☆ تخلیقی ذہن کی دنیا حقیقت سے مختلف ہوتی ہے۔ اس میں جبس اور لُو کے ہوتے ہوئے بھی چراغ روشن ہو سکتے ہیں۔ بیک وقت مختلف کیفیتیں اشعار میں تصویر ہو سکتی ہے۔ روشن دن تاریک ہو سکتا ہے، ناامیدی امید میں بدل سکتی ہے۔ سوچا جائے تو حقیقی طور پر بھی زندگی امکانات سے عبارت ہے۔ کچھ بھی طے شدہ اور حتمی نہیں ہے۔ نہ برائی نہ اچھائی، نہ روشنی نہ اندھیرا۔

☆ اچھے فنکار کو نامساعد اور ناخوشگوار حالات میں بہتر مستقبل کی نوید سنانے کا فریضہ سونپا گیا ہے۔ وطنِ عزیز کے موجودہ حالات اور نیو ورلڈ آرڈر کی تلوار کی موجودگی میں یہ امر دشوار نہیں ہو جاتا؟

☆☆ فنکار کا کام اپنے عہد کے منظر نامے کو سچائی سے بیان کرنا ہے۔ یہ بیان تخلیقی سطح پر ہوگا، اس لیے خبر سے مختلف ہوگا۔ فنکار اپنے عہد کی سماجی تاریخ کو حسی سطح پر بیان کرتا ہے۔ شاعری اپنے اظہار میں تخلیقی نثر سے مختلف ہے۔ ادیب کو اپنے عہد کے حالات سے واقفیت تو ہونی چاہیے لیکن ادیب کا کام لکھنا ہے۔ عملی اقدام اٹھانا اور activism اس کا کام نہیں ہے۔ بعض ادیب بہر حال ایسے ہوتے ہیں جو معاشرے کی اصلاح میں عملی طور پر بھی شریک ہوتے ہیں۔ یہ کوئی کلیہ نہیں ہے لیکن ادیب کا اصل کام قلم کے ذریعے سچائی کو بیان کرنا ہے۔ حالات کو تبدیل کرنا ہمیشہ ہی دشوار رہا ہے۔ بہر حال حالات کی نشاندہی کرنے کے لیے بصیرت اور فراست چاہیے۔ اس کے ساتھ یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ فنکار کو یہ فیصلہ کرنے کی آزادی ہونی چاہیے کہ وہ کیا لکھنا چاہتا ہے۔ میں تخلیقات میں کسی ایجنڈے کی قائل نہیں ہوں۔ تخلیق میں بے پناہ وسعت، بے شمار امکانات ہیں۔ انھیں محدود نہیں کیا جانا چاہیے۔

☆ ذمہ دار پاکستانی، باشعور شاعرہ، نقاد، مترجم، سائنس دان اور دانشور، دنیا کی تیزی سے تبدیل ہوتی صورتِ حال میں اُردو زبان و ادب اور وطنِ عزیز کے مستقبل کی بابت کس طرح کا حسنِ ظن قائم کیے ہوئے ہے اور اس کی روشنی میں کس طرح کے لائحہ عمل کو درست گردانتی ہیں؟

☆☆ میں ایک عام تخلیق کار ہوں لیکن سچائی سے یہ محسوس کرتی ہوں کہ اُردو زبان و ادب کے مستقبل کے لیے اور عمومی طور پر ترقی اور خوش حالی کے لیے سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہمارا تعلیمی نظام درست کیا جائے۔ تعلیمی نظام میں معیار کی کمزوری یہاں کی جہالت اور اس سے وابستہ معاشرے کی اور بہت سی خرابیوں کا باعث ہے۔

''گویم مشکل''

بہاولپور میں کُل پاکستان مشاعرہ تھا۔ لاہور سے ریل گاڑی میں حفیظ جالندھری، صوفی تبسم، احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، ضمیر جعفری، احمد فراز اور بہت سے نامور شاعر بہاولپور کے لیے روانہ ہوئے۔

جب ریل گاڑی بہاولپور کے اسٹیشن پر پہنچی تو تمام شعراء کی نظریں پلیٹ فارم پر لگے بینر پر ٹِک گئیں۔ ہر کوئی ایک دوسرے کو گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل کی کیفیت میں دیکھنے لگے۔ بینر کا عنوان تھا:

''میلہ مویشیاں و شاعراں''

''شرارِ عشق''

(محترمہ یاسمین حمید کے سخن نایاب سے مستعار)

عطیہ سکندر علی (سکھر)

کہیں اک شہر بے قیدِ دَر و دیوار بھی ہو
کبھی ہم ساتھ ہوں اور راستہ ہموار بھی ہو

ضروری تو نہیں ہے منزلیں سب ایک سی ہوں
جو موسم اِس کنارے ہے وہی اُس پار بھی ہو

زمیں اور آسماں دونوں ہوں اپنی دسترس میں
نظر کا دائرہ ثابت بھی ہو سیار بھی ہو

یہی دل، جبر کی وحشت سے جو بپھرا ہوا ہے
یہ خود محکوم ہو جائے اگر مختار بھی ہو

یہ سب راہے دورا ہے خود بنا رکھے ہیں ہم نے
کہ ہم خود چاہتے ہیں زندگی دشوار بھی ہو

.....○.....

☆

لہجے کے تیکھے تیور پر لفظوں کی من مانی پر
کبھی کبھی ہنسنا پڑتا ہے اپنی کسی کہانی پر

کبھی قلم سے کاغذ پر جب منظر ایک بناتی ہوں
دُور تلک بہتی ہوں دھیان کے دریاؤں کی روانی پر

ساتوں در جب کھل جاتے ہیں سات سروں کے سواگت میں
حیرت سی ہونے لگتی ہے مجھ کو اس مہمانی پر

آب وہوا دل کے خطّے کی بدلی بدلی لگتی ہے
تیز ہوائیں تیز بہت ہیں، موجیں ہیں طغیانی پر

مجھ میں اک ضدی بچّے نے میری بات کو آن لیا
اپنے آپ کو میں نے ٹوکا جب اپنی نادانی پر

دوسرا رخ تصویر کا دیکھا اور اس کو بھی سینت رکھا
ایک نشانی اور بھی رکھ لی میں نے ایک نشانی پر

کرنے کے جو کام نہیں تھے، وہ بھی کر کے دیکھ لیے
ریت پہ میں نے کشتی کھینچی، شہر بنایا پانی پر

○

☆

بس اب کی بار ایسی کوئی بھی زحمت اٹھائیں گے نہیں ہم
انھی کے سائے میں بیٹھیں گے دیواریں گرائیں گے نہیں ہم

مٹا دیں گے جلا کر راکھ بھی اس کے اڑا دیں گے ہوا میں
مگر کاغذ پہ کوئی دوسرا چہرہ بنائیں گے نہیں ہم

اسے لکھتی رہی ہے مدتوں خوش رنگ اجلی روشنائی
تو کیا اب یہ کہانی سننے والوں کو سنائیں گے نہیں ہم

کوئی مانوس منظر ذہن کے پردے سے مٹ ہی جائے گا کیا
تو کیا دیوار پر تصویر بھی اس کی لگائیں گے نہیں ہم

شرارِ عشق ہے تو آگ بھر دے گا لہو کی گردشوں میں
مگر اِس آگ میں کیا جل بجھیں گے جگمگائیں گے نہیں ہم

کتابِ درد کے اوراق میں دیکھا کریں گے عکس اُس کا
کبھی آواز دے کر جانے والے کو بلائیں گے نہیں ہم

سروسامانِ جاں سب ڈوبنے کو آ گیا تو کہہ رہے ہیں
یہ سوچا تھا، کبھی پانی پہ اپنا گھر بنائیں گے نہیں ہم

○

☆

خوف سے،خوف کی وحشت سے نکلنا پڑے گا
گر گئے ہیں تو ہمیں گر کے سنبھلنا پڑے گا

آنکھ کی حد میں چلی آئی ہے پانی کی لکیر
تھک رہے ہیں مگر اس وقت تو چلنا پڑے گا

پھیلتی جائیں گی جب وقتِ معین کی حدیں
رات تو رات ہے پھر دن میں بھی جلنا پڑے گا

یہ تعلق کا جو آئینہ ہے اس کی خاطر
صرف چہرے کو نہیں دل کو بدلنا پڑے گا

آنے والے کسی لمحے کی خبر رکھنے کو
ہمیں دو چار قدم ساتھ بھی چلنا پڑے گا

ایک اک لحظہ بدلتی ہوئی دنیا کے لیے
کیا ہمیں اور کسی شکل میں ڈھلنا پڑے گا

آسماں پر کوئی تصویر بنانی پڑے گی
یا کسی اور تصور سے بہلنا پڑے گا

کون ہے مدِ مقابل ہمیں معلوم تو ہے
لیکن اب عالمِ حیرت سے نکلنا پڑے گا

.....○.....

☆

قیاس و یاس کی حد سے نکل کر
چلی جاؤں کہیں چہرہ بدل کر

اڑے گی راکھ پھر میری ہوا میں
سبک رفتار ہو جاؤں گی جل کر

میں سورج کے تعاقب میں رہوں گی
طلوعِ صبح ہو جاؤں گی ڈھل کر

طلسمِ مہر و مہ کو توڑ ڈالے
زمیں اپنی حرارت سے پگھل کر

ابھی پہلا قدم طے کر رہی ہوں
دوبارہ گر پڑی تھی میں سنبھل کر

رہیں پھولوں بھرے رستے سلامت
سفر کاٹوں گی انگاروں پہ چل کر

مرے عطار نے خوشبو بنائی
بہت معصوم پھولوں کو مسل کر

○

☆

پوری بات اور پورا قصہ کون لکھے گا
کتنا مشکل تھا یہ رستہ کون لکھے گا

دن اور رات کے آدھے آدھے بٹوارے میں
کتنا کم تھا کس کا حصہ کون لکھے گا

کن ہاتھوں نے کیسے کیسے پتھر کاٹے
کیسے اُن کا بوجھ اٹھایا کون لکھے گا

کتنی دیر کو ہریالی نے آنکھیں کھولیں
کتنی دیر کو بادل برسا کون لکھے گا

جنگل میں گم ہو جانے والے رستے پر
کتنی دھوپ تھی، کتنا سایہ کون لکھے گا

شہر جلا تو کس نے اس کی راکھ سمیٹی
کتنا تھا کس کا سرمایہ کون لکھے گا

گرتی دیواروں میں سانس کہاں تھی باقی
اور کہاں تک بکھرا ملبہ کون لکھے گا

○

☆

سبک ہوتی ہوا سے تیز چلنا چاہتی ہوں
میں اک جلتے دیے کے ساتھ جلنا چاہتی ہوں

غبارِ بے یقینی نے مجھے روکا ہوا ہے
زمیں سے پھوٹ کر باہر نکلنا چاہتی ہوں

میں خود سہمی ہوئی ہوں آئنے کے ٹوٹنے سے
بہت آہستہ سطحِ دل پہ چلنا چاہتی ہوں

نمودِ صبح سے پہلے کا لمحہ دیکھنے کو
اندھیری رات کے پیکر میں ڈھلنا چاہتی ہوں

میں شہرِ شب کو آنکھوں کی دعا دینے سے پہلے
در و دیوار کا چہرہ بدلنا چاہتی ہوں

کسی کے خواب کی تکمیل میں پتھر ہوئی تھی
اب اپنے خواب کی لَو سے پگھلنا چاہتی ہوں

○

☆

رخ ہے آنکھوں کا روشنی کی طرف
ختم ہوتی ہوئی خوشی کی طرف

آج کوئی نہیں ہمارے ساتھ
اور ہم بھی نہیں کسی کی طرف

ہم اگر بات کرنے لگ جائیں
بات جائے گی برہمی کی طرف

ایک رستہ ابھی سکوت میں ہے
ایک جاتا ہی زندگی کی طرف

اٹھ رہا ہے غبار سا شاید
کسی دیوارِ دائمی کی طرف

پوچھتے کیا ہیں اپنے آپ سے ہم
دیکھتے کیا ہیں ہم کسی کی طرف

ایک وقفہ ہے درد کا اور پھر
ہم بھی ہو جائیں گے اسی کی طرف

○

☆

اب یہ ڈنکے کی چوٹ پر کہا جائے
جس کو جانا ہے شوق سے چلا جائے

اُس کے لہجے میں بات ہو اُس سے
خود کو اب بیچ سے ہٹا دیا جائے

یوں تعلق کی حد مقرر ہو
جس کو چاہیں اسے بھلا دیا جائے

کون کس سے زیادہ تنہا ہے
آج اِس کا حساب تو کیا جائے

جیسی دنیا ہے ویسے ہو جائیں
اصل چہرہ کہیں چھپا لیا جائے

رات کے بعد رات کا عالم
ایسے عالم میں اور کیا کیا جائے

راستے جنگلوں میں رکھ دیے جائیں
شہر کو شہر سے ملا دیا جائے

○

☆

مادرائے در و دیوار ہنر کوئی نہیں
گھر بہت سے ہیں مگر اصل میں گھر کوئی نہیں

شورِ دنیا کی طرف جائیں گے دنیا والے
اِس طرف دل کی طرف راہ گذر کوئی نہیں

زندگی چاروں طرف موت بھی ہے چاروں طرف
آئے جو چاہے کہیں سے ہمیں ڈر کوئی نہیں

اسی مقتل میں جہاں آپ بھی اور ہم بھی ہیں
جسم سایوں کی طرح پھرتے ہیں سر کوئی نہیں

بھاگتے جاتے ہیں ہم لوگ بھلا کس کی طرف
جہاں آتا ہے نظر کوئی اُدھر کوئی نہیں

خوف معدوم ہوا فیصلہ مقسوم ہوا
موت معمول ہوئی آج کی خبر کوئی نہیں

.....○.....

☆

سورج ڈوبے گا تو منظر کیسا ہو گا
تب یہ اتنا بڑا سمندر کیسا ہو گا

یاد نہیں کب، لیکن ہم سوچا کرتے تھے
جس میں خوشیاں ہوں گی وہ گھر کیسا ہو گا

سب کچھ کھو دینے کی وحشت کیسی ہو گی
سب کچھ مل جائے گا تو ڈر کیسا ہو گا

لمحے کی سلگا کی ہم سے پوچھ رہی تھی
ایک ہی نقشہ دل کے اندر کیسا ہو گا

کن آنکھوں سے بہتے آنسو خالص ہوں گے
ان سے اٹھنے والا محشر کیسا ہو گا

کس کا قامت اونچا ہو گا اُس محشر میں
کٹ کے جو گر جائے گا، سر کیسا ہو گا

دیکھ رہے ہیں زندہ رہ جانے والوں کو
جان رہے ہیں موت کا منظر کیسا ہو گا

○

☆

چلی شب کے تعاقب میں سحر آہستہ آہستہ
مقفل ہو گئے آنکھوں کے دَر آہستہ آہستہ

ہوا کے ساتھ ہولیں ساعتیں جو ساتھ گزری تھیں
کٹے گا اب جدائی کا سفر آہستہ آہستہ

اجڑ جانا کسی آباد بستی کا نہیں مشکل
مگر بستے ہیں ویرانوں میں گھر آہستہ آہستہ

اذیّت کی مجھے یہ انتہا پہ لا کی چھوڑے گا
ڈوبے گا مری کشتی بھنور آہستہ آہستہ

تھی اتنی بھیڑ رستے میں کہ اوجھل ہو گئی منزل
چھٹے گا اب غبارِ رہ گزر آہستہ آہستہ

بدلتی رُت کے ہاتھوں پھول تو کملا گئے سارے
مگر کم ہو گا خوشبو کا اثر آہستہ آہستہ

مرے دل کی گواہی ایک دن میرا خدا دے گا
حقیقت آنکھ کھولے گی مگر آہستہ آہستہ

○

پسِ ابلاغ

احمد ندیم قاسمی

(●)

یاسمین حمید اپنے دور کے نمایاں غزل گو شعراء سے قطعی طور پر مختلف انداز میں سوچتی اور منفرد انداز میں اظہار کرتی ہے۔ ''حصارِ بے در و دیوار'' اس کا دوسرا مجموعۂ کلام مگر اس نے اپنے پہلے ہی مجموعہ ''پسِ آئینہ'' سے ثابت کر دیا تھا کہ وہ عام ڈگر سے ہٹی ہوئی شاعر ہے۔ یہ بات نہیں کہ وہ غیر حقیقی یا غیر زمینی موضوعات پر گفتگو کرتی ہے۔ یہ تو اپنے عصر کی سچی عکاس اور جدید طرزِ احساس کی کھری نمائندہ ہے مگر وہ جو کچھ کہتی ہے۔ اس ڈھب سے کہتی ہے کہ اسے کسی بھی دوسرے اہم شاعر کے مماثل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ وہ خود ہی اپنی مثال ہے۔ ادب کے وہ ناقدین اور قارئین جنہیں عموماً شکایت رہتی ہے کہ جدید اردو غزل یک رنگ ہوئی جا رہی ہے اور سبھی نئے غزل گو قریب ایک ہی انداز کی غزل کہنے لگے ہیں۔ یاسمین حمید کی غزل پڑھیں گے تو اپنے نظریہ پر نظرِ ثانی کرنا ہوگی۔ یاسمین کے ہاں جذبہ و فکر کا اتنا وفور ہے کہ خود اس طرح کے اعترافات کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

کئی نقطے پسِ ابلاغ ہوں گے
بہت کچھ چھُپ گیا ہے دائرے میں

میں اسے حرف میں محبوس نہیں کر سکتی
جس تخیل سے مری ذات میں ہے پھیلاؤ

یاسمین کی صرف ایک غزل کے حوالے سے اس کے منشورِ فن کو واضح کیا جا سکتا ہے کہ اس کے ہاں موسم خشک میں بھی خوشبو کا تصور جاری رہتا ہے۔ وہ پسِ نقشِ بھی ایک نقش بنائے رکھنے کا عزم رکھتی ہے اور زندگی کے بارے میں اس کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اگر تیز ہوا کی وجہ سے رہ گزر پر چراغ نہ جل سکیں تو گھروں کے اندر تو چراغوں کو جلائے رکھنا چاہیے۔ یوں نفی کے مقابلے میں اثبات نے اس کے ہاں متنوع رنگوں میں اظہار پایا ہے۔

موت کا انتظار کرنا ہے
زندگی سے بھی پیار کرنا ہے

میں نے ملبے کو ہٹا کر دیکھا
ایک اک خواب مرا زندہ ہے

لکھوں کھیتوں کے جل جانے کا قصہ
تو بار آور رتوں کو ساتھ لکھوں

اور یاسمین کا یہ ناقابلِ شکست اثبات اس وقت تو واضح طور پر ایک فاتح کی شان اختیار کر لیتا ہے جب وہ کہتی ہے:

کیسے پت جھڑ کے ہاتھ آئے گی
شاخِ گل جو شجر کے اندر ہے

یہ شجر کے اندر' مستقبل میں پھوٹ نکلنے کے انتظار میں بیٹھی ہوئی شاخِ گل' یاسمین کے فن کی نہایت بلیغ علامت ہے۔ اس اثبات و اعتماد نے اس کارگاہِ حیات کے کسی بھی مرحلے پر مایوس نہیں ہونے دیا۔ یقیناً وہ اداس بھی ہوتی ہے کہ قدم پر اپنے معیاروں کی پامالی دیکھ دیکھ کر اداس ہو ہو جانا ہر صاحبِ شعور انسان کا مقدر ہے مگر اداسی' مایوسی کے ہم معنی نہیں ہے۔ یاسمین کے کلام میں اداسی کی زیریں لہر مستقلاً چلتی رہتی ہے:

نہ جواب ہوں کسی بات کا' نہ سوال ہوں
فقط ایک حیرتِ مستقل کی مثال ہوں

مگر یہ حیرت عارضی ثابت ہوتی ہے جب وہ کہتی ہے:

مری آنکھیں گواہی دے رہی ہیں
کسی امید کے آزار میں ہوں

اس ''امید کے آزار'' سے مجھے غالب یاد آ گئے جنہوں نے کہا تھا:

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا
افسونِ انتظار' تمنّا کہیں جسے

غالب کا یہی ''افسونِ انتظار'' یاسمین کا ''امید کا آزار'' ہے۔ اس امید کو یاسمین کا وہ اعتماد اور اثبات کہنا چاہیے جو اس کے فن کا جلی عنوان ہے۔

یاسمین نے اپنے پہلے مجموعۂ کلام ''پسِ آئینہ'' کی خود نوشت تمہید میں بتایا تھا کہ اس کی شاعری سچائی اور خلوص کا نچوڑ ہے۔ سچائی کو کوئی بھی علمبردار اپنے عصر' اپنی قوم' اپنی تہذیب' اپنے ماحول سے کترا کر نکل جانے کا قائل نہیں ہوتا۔ وہ جب اپنی ذات کی گہرائیوں کی سچائیں بیان کرتا ہے تو دوسری بے شمار سچائیوں کی علمبرداری سے دست کش نہیں ہو جاتا بلکہ اپنے آس پاس کی معاشرتی اور سیاسی صورت حال بھی اس کی حق گوئی کا موضوع بنتی ہے۔ یاسمین بھی خلوص اور دیانت کے ساتھ اپنے ماحول کی سچی ترجمانی کرتی ہے اور کہیں کہیں انداز میں چلاّ اٹھتی ہے:

یہ بے حسی ہے کہ انتہائے خُوئے الم
نگر نگر ہے لہو' اور کوئی ملول نہیں

مگر خود اس کا موقف کتنا مبارک ہے

چننے کو راستے کے سب پتھر
اک سفر بار بار کرنا ہے

بار بار سفر کرنے کا یہ عزم دراصل امید کا وہی آزار ہے جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ سفر کا یہ طلسم یاسمین کے ہاں مقام پر مسحور کرتا ہے اور میری نظر میں یاسمین کا یہ شعر سفر کے اس استعارے کا اوجِ کمال ہے:

سمندر ڈھونڈتا دریا کا پانی
زمیں پر حسن بوتا جا رہا ہے!

میری ان تصریحات سے قارئین کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ سچائی اور خلوص اور دیانت کی اس شاعری میں شاید تغزل غائب ہو گیا ہے حالانکہ حق بات یہ ہے کہ یاسمین نے یہ سب سچائیاں تغزل ہی کے دلآویز لہجے میں بیان کی ہیں۔ غزل کا یہ شعر دیکھئے:

کھٹکتی ہے مجھے وہ دوسروں میں
تمہاری بات جو اچھی لگی تھی

میری رائے میں اس موضوع کا کوئی شعر اردو اور فارسی غزل میں موجود نہیں ہے۔ اگر موجود ہے تو میں اپنے مطالعے کی کمی کا اعتراف کیے لیتا ہوں۔ محبت کی اس طرح کی شِدّت تغزل کی جان ہوتی ہے۔ یاسمین کی غزلوں کے چند شعر سنئے:

ساری سمتیں مجھے ایک سی ہو گئیں
راستہ بھولنا آج اچھا لگا

مجھے بے مائیگی کا دُکھ نہیں تھا
اندھیرے میں دیا جلنے سے پہلے

میں اپنے دل کے دروازے پہ بیٹھی سوچتی تھی
اسے باہر سے بھیڑوں یا پھر اندر لوٹ جاؤں

منتقل ہوتے رہیں گے ایک اک کر کے مکیں
اور مٹی کا گھروندا دیکھتا رہ جائے گا

جس نے پھول چنے ہیں میرے صحرا سے
میری آنکھوں کو اپنی بینائی دے

ہم سمندر کی تواضع کے لئے
ایستادہ ہیں کناروں کی طرح

یہ عقدہ تو بلندی پر کھلے گا
زمیں اوپر ہے نیچے آسماں ہے

مگر میں یاسمین کے اشعار دُہرائے چلے جانے سے شاید اس مجموعۂ کلام کے قارئین کا حق چھین رہا ہوں ورنہ اس نوع کے بے شمار اشعار ''حصارِ بے در و دیوار'' میں موجود ہیں۔ ویسے ان چند اشعار سے بھی یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ یاسمین ایک با اسلوب شاعرہ ہے اور اس کا یہ اسلوب اپنے دور کے ہم سِن شعراء کے تناظر میں صد فیصد منفرد ہے۔ پھر اس کی شاعری میں مسائلِ ذات و کائنات کے بارے میں فکر و تامل کی جو رَو مسلسل رواں رہتی ہے۔ اس نے یاسمین کی اس انفرادیت کی مزید مضبوط کر دیا ہے۔

یاسمین حمید نے نظمیں بھی کہی ہیں اور اس مجموعے کے آخر میں اس کی اکیس نظمیں شامل ہیں۔

''عقدہ''، ''کیوں''، ''کشف''، ''صرف'' اور اسی طرح کی دوسری نظموں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے اگرچہ۔۔۔ خود یاسمین کے الفاظ کے مطابق۔۔۔ اس نے ''خود کو بطور شاعر قدرے دیر سے دریافت کیا'' مگر یہ تاخیر ان معنوں میں اس کے فن کے لئے مفید ثابت ہوئی کہ جب اسنے شعر کہنا شروع کیا تو اس کے مشاہدات میں گہرائی اور خیالات میں پختگی آ چکی تھی۔ یاسمین کی غزلوں کے علاوہ اس کی نظمیں بھی اس حقیقت کی شاہد ہیں۔۔۔ اگرچہ وہ بنیادی طور پر غزل کی شاعر ہے۔۔۔ اور غزل بھی جدید تر۔۔۔ اور ساتھ ہی بھرپور اور گمبھیر!۔۔۔ وہ غزل جس میں دھوپ، تنا ور پیڑوں کے سائے سے ڈرتی ہے اور جلتے ہوئے کھیتوں کی مٹی سے نئی فصل اگانے کے عزائم پرورش پاتے ہیں اور مہکاروں میں رنگ جھلکتے ہیں اور رنگوں سے خوشبو آتی ہے!

☆

۔ شگفتہ وسعت ۔

یہ جو عام سا تعصب پھیلایا گیا ہے کہ شاعرات کی دنیا گھر آنگن اور نرم و رنگیں جذبات تک محدود ہوتی ہے یا پھر بہت ہوا تو کسی نے دریچے سے اِدھر اُدھر جھانک لیا، یاسمین حمید کی شاعری اس تعصّب کی مکمل نفی کرتی ہے۔ مقامِ حسرت ہے کہ پروین شاکر اور اس کے معاصر گروپ کے بعد ایک ایسی شاعرہ اپنے پورے قد و قامت کے ساتھ منظرِ شعر پر متمکن ہوئی ہے جس کا تخلیقی تجربہ کا ملک ہے۔ اس کے ہاں علم، شعور و آگہی، معلومات نہیں، ایک تجربے کی صورت ظاہر ہوتے ہیں۔ یاسمین حمید کی دنیا پوری کائنات پر مبنی ہے۔ سورج، چاند، ستارے، سیارے، پہاڑ، صحرا اور سب سے بڑھ کر سمندر، پانی، بے انت پانی اس کے مستقل رفقا کی صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ مظاہرِ فطرت اس کے احساسات و جذبات کے صرف پس منظر نہیں بنتے، وہ انہیں اپنا ہمجولی محسوس کرتی ہے، بہ تکلف استعارے میں ڈھالنے کی کوشش نہیں کرتی۔ یہ سب آیات اس کے محسوس تجربے ہیں۔ اسی لیے اس کی شاعری میں ایک شگفتہ وسعت ہے، تازہ ہوا، جو ہمیں خوشی، دردمندی اور توانائی بخشتی ہے۔ یہ شاعری وجود کی ایک نئی یا شاید گم شدہ سمت کی تلاش کا سفر ہے۔ ایک عورت کا تجربہ ہونے کے باوجود یہ صنفیت سے مبرّا ہے کیوں کہ بنیادی طور پر انسانی زندگی کسی صنفیت کی پابند نہیں۔

خالدہ حسین

خلّاقیت سے معمور شاعر

شمس الرحمان فاروقی

(●)

بہت دن ہوئے ''پسِ آئینہ'' کی نظموں غزلوں کے ذریعہ یاسمین حمید کے کلام سے میری ملاقات ہوئی تھی تو ایک خوشگوار تعجب اور فرحت کا احساس ہوا تھا۔ ہمارے زمانے میں عورت شعراء کے ساتھ ایک نئی مشکل یہ ہے کہ پڑھنے والے، بلکہ نقاد، بار بار پوچھتے ہیں: عورت کی حیثیت سے وہ دنیا کو کیسا دیکھتی ہے اور دنیا کے بارے میں کیا سوچتی ہے؟ کوئی شک نہیں کہ یہ سوال برجا سے ہے۔ لیکن کسی شاعر کے بارے میں پہلا سوال یہ ہونا چاہیے کہ وہ شاعر کیسا ہے؟ اور یہ سوال بلا لحاظ مذہب وجنس پوچھا جانا چاہیے۔ آج کی بہت سی عورت شاعروں کو میں اس کشمکش میں غیر شعوری طور پر مبتلا دیکھتا ہوں کہ وہ ''اپنا پیغام'' اپنے کلام میں ضرور داخل کردیں، تاکہ کسی کو شک نہ ہو کہ اُنھوں نے اپنے تانیثی تشخص کے ساتھ بے انصافی تو نہیں کی ہے؟ یاسمین حمید کا پہلا مجموعہ جو میرے ہاتھ لگا اس نے مجھے کسی شک میں نہ رکھا تھا کہ یہ حسیت، یہ خاموش، متین لیکن درد میں رچا ہوا لہجہ عورت ہی کا ہوسکتا ہے۔ لیکن ذرا زیادہ غور کیا تو محسوس ہوا کہ اس شاعر کا اصل کمال یہ ہے کہ وہ اپنی تانیثی حسیت کو بے پردہ نہیں کرتی۔ اس کی شاعری پر ''عورت پن'' کا خود کار ٹھپہ نہیں ہے۔ وہ عورت بھی ہے اور دُکھ اُٹھاتے ہوئے، اُمید وبیم سے لڑتے ہوئے، خوف اور دہشت اور عالم گیر تاجرانہ سماج کے دباؤ میں جینے کی کوشش کرتے ہوئے جدید انسان کی بھی ترجمان ہے۔ میری بات کی تصدیق زیرِ نظر نظم بہ حسن وخوبی کررہی ہے۔

چاند

خالص راتوں کا متوالا تھال سنہرا پانی میں
چھپ جاتے ہیں نین نقش بھی اس کی روپ کہانی میں

چاندی سونے جیسی دھاتیں اس کی باتیں سنتی ہیں
اس کے کہے کو اپنے اندر سینت سینت کر رکھتی ہیں

ہم لیکن اس کی چاندی کو آنکھوں میں جب بھرتے ہیں
کچھ پاگل سے ہو جاتے ہیں اپنے آپ سے لڑتے ہیں

توڑ کے پانی کے پیالے کو رخصت ہو جاتے ہیں ہم
اُس کا گھر ہے آسمان پر اس کو بتلاتے ہیں ہم

''پسِ آئینہ'' کے بعد میں نے یاسمین حمید کے دو مجموعے اور دیکھے ہیں اور رسالوں میں بھی ان کا کلام گاہے گاہے دیکھنے کا اتفاق ہوتا رہا ہے۔ وقت کے آگے بڑھنے کے ساتھ یاسمین حمید کے کلام میں بعض نئی جہتیں پیدا ہوگئی ہیں، مثلاً سیاست ان کے لیے اب ایسی حقیقت کا رُوپ اختیار کرچکی ہے جو گندے دُھوئیں کی طرح عالمِ انسانی پر محیط ہے، لیکن سیاست ان کے یہاں موضوعِ سخن نہیں، بہانۂ سخن ہے، اور یہی بات ان کی شاعرانہ مہارت اور استعاراتی نگاہ کی دلیل ہے۔ نثری نظم کے پردے میں اب یاسمین حمید کی برہمی اور تلخی اور محزونی کچھ زیادہ نمایاں ہے اور بعض اوقات خوف پیدا کرتی ہے کہ اس بظاہر خاموشی پسند شاعر کے دل میں کتنے تلاطم اُبل رہے ہیں۔ نظم میں، اور خاص کر نثری نظم میں، ابہام کی بھی گھٹائیں پُر لطف تاثر پیدا کرتی ہیں۔ پڑھنے والا دیر تک ان نظموں میں معنی کی تہوں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ غزلوں میں سادہ گوئی اور تازہ گوئی پہلے کی طرح ہے۔ تانیثی جہت اب بھی پہلے کی طرح موجود لیکن زیادہ تر زیرِ زمیں ہے۔ ''پسِ آئینہ'' کا پہلا شعر ہے:

کنارے پر کھڑی ہوں اور کنارے ڈھونڈتی ہوں
سحر کی روشنی میں چاند تارے ڈھونڈتی ہوں

یہ رومانی تلاش بھی ہے اور آج کی زندگی کی محزونی اور نارسائی بھی۔

''آدھا دن اور آدھی رات'' کا آخری شعر حسبِ ذیل ہے:

سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ مجھ کو میرا خالق
بنانا چاہتا ہے یا مٹانا چاہتا ہے

یہاں رومانی تلاش نے بالآخر شاعر کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ اب ہر طرف استفسار اور رنجیدگی اور تھوڑی سی برہمی ہے۔ یہ انتہائیں نہیں، منزلیں ہیں، بہت بلند منزلیں۔ یاسمین حمید ہمارے شکریے کی حقدار ہیں کہ انھوں نے جدید شاعری کو ایک نیا وقار بخشا ہے۔

موافقت ومفاہمت

ماہرین فن اور ماہرین نفسیات تخلیقی صلاحیتوں اور ذہنی بیماریوں کے رشتوں میں راز جاننے سے ابھی بھی قاصر ہیں لیکن اتنا ضرور جانتے ہیں کہ ان میں کوئی نہ کوئی رشتہ ضرور ہے۔ کارلسن کا نظریہ یہ ہے کہ ذہنی بیماریاں اور تخلیقی صلاحیتیں دونوں ایک ہی طرح کی جینز (Genes) سے نسل در نسل منتقل ہوتی ہیں اگر بچوں میں ان رجحانات کی شدت اور ماحول کی موافقت میں ایک مفاہمت پیدا ہوجائے وہ بچے فنکار بن جاتے ہیں لیکن اگر وہ رجحانات بے قابو ہو جائیں اور شخصیت اور ذہن انہیں برداشت نہ کرسکیں تو وہ بچے جوان ہوکر ذہنی توازن کھودیتے ہیں۔ اس لیے ایک ہی خاندان کے بعض افراد کا فن کار اور بعض کا بیمار ہوجانا بعید از قیاس نہیں۔

حصارِ بے درودیوار

شہزاد احمد

(●)

یہ تاثر یاسمین حمید کے دوسرے شعری مجموعے ''حصارِ بے درودیوار'' کی تقریب پذیرائی میں پڑھا گیا۔ یہ ایک مختصر سی تحریر ہے جو یاسمین حمید کی ساری کتاب کے بارے میں نہیں ہے۔ صرف غزل کے حصے کے بارے میں ہے۔

میں عدیم ہاشمی کی طرح شطرنج کا رسیا تو نہیں لیکن کبھی کبھی مین سوچتا ہوں کہ غزل کی بساط کا موازنہ شطرنج کی بساط سے کیا جا سکتا ہے۔ شطرنج کی ہر بساط کے مہرے بالکل ایک جیسے ہوتے ہیں مگر شطرنج کی ہر بازی دوسری بازی سے مختلف ہوتی ہے اور یہ سارا کھیل صرف چوبیس گھروں اور بتیس مہروں کے ساتھ کھیلا جاتا ہے۔ پھر وہ حکایت تو آپ نے سنی ہوگی کہ ایک بادشاہ نے کسی شاطر سے خوش ہو کر کہا تھا: مانگ کیا مانگتا ہے تو جواب میں اس نے کہا کہ شطرنج کے پہلے خانے میں پیتل کا ایک سکہ رکھ دو اور پھر ہر خانے میں اس کو دوگنا کرتے چلے جاؤ۔ بادشاہ کو یہ لگا کہ شاطر نے اس سے بہت معمولی چیز مانگی ہے مگر اسے جلد ہی احساس ہو گیا کہ وہ اپنی ساری سلطنت بیچ کر بھی پیتل کے یہ سکے پورے نہیں کر سکتا۔

کچھ ایسے ہی امکانات غزل کے اندر بھی موجود ہیں۔ کلاسیکی غزل اور جدید غزل برسوں سے لکھی جا رہی ہے مگر ہر بار کوئی نہ کوئی ایسا شاعر یا شعر سامنے آجاتا ہے جو چونکا کے رکھ دیتا ہے۔ وہ ایسی بازی کھیلتا ہے جیسی بازی کھیلنے کے امکانات تو بہر صورت ہوتے ہیں مگر کسی نے یہ بازی کھیلی نہیں ہوتی۔ لہذا غزل اپنے امکانات میں لامحدود کہی جا سکتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کی حدود بھی متعین کی جا سکتی ہیں۔ یہ حدود محض ردیف، قافیے اور اوزان تک محدود نہیں ہیں بلکہ غزل کی لفظیات، موضوعات اور اکثر اوقات مابعد الطبعیات بھی مشترک ہوتی ہیں۔ اس نے کسی بھی حد یا قید کو توڑنے کی کوشش نہیں کی۔ ایک بھی نیا لفظ استعمال نہیں کیا، ایک بھی نئی ترکیب نہیں بنائی بلکہ تراکیب تو وہ بناتی ہی کم کم ہے مگر اس کے باوجود اس کی قریبی مماثلت کسی دوسرے جدید شاعر سے تلاش نہیں کی جا سکتی۔ اس نے یہ بھی تو نہیں کیا جو چونکا دینے والی شاعرہ بننے کے لیے تحریکِ نسواں ہی کو اچھالا ہو۔ اس نے صرف ایک کام کیا ہے کہ وہ جو کچھ محسوس کرتی تھی اور جس طرح محسوس کرتی تھی اس کو اسی طرح بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ مزے کی بات یہ بھی ہے کہ اس کے ہاں کسی فلسفے یا رویے کو خصوصی طور پر فوقیت حاصل نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ غزل کے اجتماعی رویے کو بیان کرنے کی ایک انفرادی کوشش ہے۔ غزل وہ کہانی ہے جو ہر شخص دوسرے کے کان میں کہتا ہے مگر ہر بار اس میں تھوڑی بہت تبدیلی ہو جاتی ہے اور آخر تک پہنچتے پہنچتے پوری کہانی ہی بدل جاتی ہے۔ یاسمین حمید کی شاعری داستان گوئی کا وہ مقام ہے جہاں سے یہ کہانی کوئی نیا موڑ اختیار کرتی نظر آتی ہے مگر میں کیونکہ نقاد نہیں ہوں لہذا یہ نہیں بتا سکتا کہ اسکے بعد یہ کہانی کیا رُخ اختیار کرے گی۔ البتہ شاعری کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میں آپ کو یاسمین حمید کے چند اشعار ضرور سناؤں گا جو میرے خیال میں نئی غزل کے بعض ایسے امکانات کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن کی نشاندہی کم کم کی گئی ہے یا بالکل نہیں کی گئی۔ کیونکہ یہ میرا ایک ذاتی تاثر ہے اس لیے آپ کو مجھ سے اختلاف کرنے کا حق ضرور پہنچتا ہے مگر یہ شاید آپ کے لیے بھی ممکن نہ ہو کہ آپ اس کتاب کا مطالعہ کر کے ایسے اشعار اپنے طور پر دریافت نہ کر پائیں جو آپ کے خیال میں نئے ہوں۔ اب آپ چند اشعار سن لیجیے:

نا گہاں کوئی نہ آثار مٹا دے اس کے
نقش اک اور پسِ نقش بنائے رکھنا

اسے تلاش کیا جائے دستِ خالق میں
کمی جو نقش میں لگتی ہے نقش گر میں نہ ہو

حیرتِ دید نے افلاک و زمین پر اک ساتھ
ڈوبنے اور پھر ابھرنے کا تماشا دیکھا

کم سے کم جان گئے قیمتِ اُمید ہے کیا
عمر بھر بیٹھ کے جب ایک ہی رستہ دیکھا

ڈوبنے والے کا اندیشہ ہی اکثر
قطرہ قطرہ پانی کو گہرائی دے

جس نے پھول چنے ہیں میرِ صحرا سے
میری آنکھو کو اپنائی بینائی دے

مری ہی خو میں نہ ہو اس کی رنجشوں کا سبب
یہ فاصلہ کہیں میرے ہی بال و پر میں نہ ہو

گل کو موسم نے سزا دی کیسی
زرد پتّوں میں کِھلا چھوڑ دیا

سانس لیتا ہوا انسان تھا وہ
جس کو ملبے میں پڑا چھوڑ دیا

خوشیوں کا گھر

پروفیسر سحر انصاری
(کراچی)

شعر وادب کی دنیا بعض امور میں اپنے جداگانہ طور طریقے رکھتی ہے۔اس دنیا اور اس سے وابستہ افراد کو ان کے پسند کرنے والے دیگر شعبوں کے مقابلے میں زیادہ جانتے اور مانتے ہیں لیکن اُن کی انفرادی حیثیت اور مرتبے کا تعین اتنا آسان نہیں ہوتا۔اس کے برعکس کسی کھلاڑی یا کاریگر کو دوسروں کے مقابلے میں آسانی سے بہتر اور کم تر قرار دیا جاسکتا ہے۔اس کے لیے ادب وشعر کی طرح غیر معمولی آگاہی کی ضرورت نہیں ہوتی۔شعروادب کی دنیا میں کسی کے تخلیقی معیار تک پہنچنا اور پرکھنا خاصا مشکل کام ہے۔جب کوئی تخلیق کار محض رسمیاتِ فن سے مبرّا اور بالاتر ہو تو یہ مشکل اور بھی سوا ہو جاتی ہے۔

یاسمین حمید کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے یہی خیالات مجھے اپنی سمت کھینچ رہے ہیں۔دراصل یاسمین حمید نے شعروادب کی دنیا میں رفتہ رفتہ، آہستہ آہستہ اپنی شناخت اس طرح بنالی ہے کہ انھیں تحسین وستائش کے عمومی پیرایوں کے ذریعے سمجھنا ان سے ناانصافی کے مترادف ہوگا۔یاسمین حمید نے شعروادب کو سنجیدگی سے اپنایا ہے۔وہ ادب وشعر کی تخلیقی اور سماجی صورتِ حال کو پہچانتی اور اسے انفرادی طور پر پایۂ کمال تک پہنچانا جانتی ہیں۔

یاسمین حمید نے نظموں، غزلوں کے علاوہ اپنے تراجم اور تنقیدی مضامین کے ذریعے خود کو ایک جانی پہچانی عمومیت سے الگ اور بلند کرلیا ہے۔ اُن کی نظم ونثر پر مشتمل تحریریں اگر سب کی سب نہیں تو بیشتر میری نظر سے گزر چکی ہیں۔انھیں ادب کی دُنیا میں جس طرح کی اہمیت حاصل ہوئی ہے، وہ ان کا حق ہے کیوں کہ وہ بہت سنجیدگی اور commitment کے ساتھ ادب کا کام کر رہی ہیں۔انھیں جو ادبی اعزازات ملے یا مل سکتے ہیں، وہ بلاشبہ اُن کی merit کی غمازی کرتے ہیں۔

اس وقت یاسمین حمید کی چند غزلیں میرے سامنے ہیں۔ان غزلوں میں اُن کی وہ ساری تخلیقی انفرادیت نمایاں ہے جو یاسمین حمید کے اسلوبِ سخن کی پہچان ہے۔شعروادب کی تخلیق ایک پیچیدہ عمل ہے۔اس کی درجہ بندی میں ناقدین اور مبصرین نے خالصتاً فطری اور وہبی عنصر کو الگ رکھا ہے اور اس کے ساتھ اگر علمی معیار، دانش پژوہی اور انفرادی شناخت مل جائیں تو اس کے لیے تحسین وستائش کا رُخ ذرا مختلف ہوگا۔یعنی بات pure poetry اور intellectual poetry کی ہے۔میں یاسمین حمید کو مؤخر الذکر category میں رکھتا ہوں۔

تاہم یاسمین حمید کے مزاج کا یہ رنگ آج یک بہ یک سامنے نہیں آیا ہے بلکہ جیسے عرض کیا ہے کہ شروع ہی سے اُن کی شاعری ایک سنجیدہ ذہن کی عکاس ہے، البتہ یہ ضرور محسوس کیا جاسکتا ہے کہ زمانے کے گرم وسرد اور نئے تجربات نے اُن کی فکر کو مزید گہرائی دی اور سنجیدگی کو کچھ اور اُجاگر کیا ہے۔اس کا اظہار اُن کی نئی غزلوں سے بھی ہوتا ہے۔چند اشعار دیکھیے:

یاد نہیں کب لیکن ہم سوچا کرتے تھے
جس میں خوشیاں ہوں گی وہ گھر کیسا ہوگا

زندگی کی علامتوں کی طرح
دل کسی امتحان میں رہے گا

لوگ سنورتے سجتے بنتے رہتے ہیں
اور زمانہ اُن پر ہنستا رہتا ہے

ہم اسی دُنیا کا حصہ ہیں مگر اس سے الگ
خامشی میں جی رہے ہیں خامشی کے حق میں ہیں

تخلیقِ فن کے جملہ مراحل از اوّل تا آخر کسی کلچر اور زمینی حقائق کی دَین ہوتے ہیں۔ایک سچا فن کار اگر طلسمِ ہوش رُبا جیسی کوئی خیالی دنیا بھی وضع کر لے تو آخری تجزیے میں اس کے تمام تخلیقی اور فنی، جمالیاتی اور تاریخی زاویے حقیقی دنیا ہی سے متعلق ہوں گے۔اچھا اور زندہ رہنے والا ادب کسی فرضی یا خیالی دنیا کی دَین نہیں ہوتا۔یاسمین حمید بھی اسی دنیا اور اسی ماحول میں سانس لے رہی ہیں جس میں حلاوت اور روشنی، میتھو آرنلڈ کے الفاظ میں sweetness and light کم سے کم تر اور تیرگی اور دھواں فزوں تر ہوتا جارہا ہے۔کبھی کبھی تو میر حسن کا شعر پہروں ذہن پر دستک دیتا رہتا ہے:

گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل
کہاں کی رُباعی، کہاں کی غزل

تاہم سچا تخلیقی فن کار وہی ہے جو میر تقی میرؔ کی طرح ''ناکامیوں'' سے کام لے۔کامیابیوں سے کام لیا تو کیا تیر مارا۔اچھے تخلیقی فن کار کا کام نامساعد اور ناخوش گوار حالات میں بہتر مستقبل اور تاب ناک زندگی کی نوید سنانا ہے۔لیکن جس دور میں آج کا فن کار جی رہا ہے، اُس میں مستقبل کی اُمید اور زندگی کی تاب ناکی کے خواب، سبھی کچھ داؤ پر لگ چکا ہے۔ایسے میں امید کا دامن تھامے رکھنا کتنا مشکل اور کیسا صبر آزما ہے، اس کا اندازہ وہ لوگ کر سکتے ہیں جو زندگی اور اس کے مسائل پر حقیقت پسندانہ نگاہ ڈالنے کی سکت رکھتے ہیں۔اس کے باوجود اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اچھا تخلیقی فنکار ہمیں مایوسی کے اندھیروں میں نہیں دھکیلتا بلکہ ان سے نکال کر لاتا ہے۔یاسمین حمید کا فن اس فریضے کی بجا آوری پوری ذمے داری سے کرتا نظر آتا ہے۔کچھ اشعار دیکھیے:

باقی صفحہ ۳۵ پر ملاحظہ کیجیے

ماورائے درودیوار

امجد اسلام امجد
(لاہور)

بارہ تیرہ برس قبل جب طاہر اسلم گوار نے یاسمین حمید کا پہلا مجموعہ'' پسِ آئینہ'' شائع کیا تو پاکستان میں بہت کم لوگ ان کے نام اور کام سے واقف تھے۔ کتاب پڑھی تو محسوس ہوا کہ یہ شاعرہ نہ صرف کہنے کو اپنے پاس بہت کچھ رکھتی ہے بلکہ اسے کہنے کا ڈھنگ اور ہنر بھی آتا ہے۔ پسِ آئینہ کے خودنوشت دیباچے ''انعکاس'' میں وہ اپنے بارے میں بتاتے ہوئے کہتی ہیں۔

''مگر حیرت کی بات ہے کہ میں نے خود کو بطور شاعر قدرے دیر سے دریافت کیا اور جب کر لیا تو جانا کہ میں دراصل یہی ہوں۔ اور اب شاعری زندگی کا جزو ہے' معلوم نہیں یہ بات اچھی ہے یا بُری' اپنے آپ کو شعر کہنے پر کبھی مجبور نہیں کر سکی جب طبعیت مائل ہوئی کو ایک دن چار چار غزلیں بھی کہیں اور جی نہ چاہا تو کئی کئی مہینے یونہی گذر گئے' میری شاعری چاہیے' اسکا فیصلہ میں آپ پر چھوڑنا چاہوں گی۔ اتنا ضرور کہتی چلوں کہ مجھے سچائی سے محبت اور جھوٹ سے نفرت ہے۔ چھوٹ جیت کر بھی خائف رہتا ہے اور سچائی ہار کر بھی مطمئن۔''

اس تحریر کے اندر جو اکسٹ منٹ اور حقیقت پسندی ہے اس نے چونکایا بھی اور متاثر بھی کیا اس کے بعد ان کے تین اور مجموعے ''حصار بے درودیوار'' ''آدھا دن آدھی رات'' اور ''فنا بھی ایک سراب'' وقفے وقفے سے سامنے آئے اور ہر کتاب کے ساتھ ان کا فنی قد اتنا بلند ہوتا گیا نظم ہو یا غزل' ہر میں وہ یکساں اعتماد اور سلیقے سے بات کرتی ہیں۔ وہ ایک صاحبِ مطالعہ خاتون ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ انہیں اللہ کی اس زمین پر گھومنے پھرنے کا موقع خوب ملا ہے جس سے ان کی نظر اور وژن میں ایک ایسی وسعت اور گہرائی پیدا ہوئی ہے جو بہت کم جدید اُردو شعرا کے ہاں نظر آتی ہے بالخصوص ان کی نظموں کے موضوعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو صرف اُردو شعری روایت کی مخصوص حد بندیوں تک محدود نہیں رکھتیں بلکہ اردگرد کی دنیا میں ہونے والے واقعات' سیاسی اور تہذیبی تبدیلیوں اور زبردست اور زیردست قوموں کی آویزش اور اس کے اثرات پر بھی گہری نظر رکھتی ہیں۔ خانہ زندگی میں بہت کم گو اور شرمیلی ہونے کے باوجود ملنسار بھی ہیں اور ان کی شخصیت کا یہ عکس ان کی شاعری میں بھی کہیں کہیں نظر آتا ہے لیکن وہ زیادہ اعتماد اور قدرے بلند آواز میں بات کرتی نظر آتی ہیں جو چیز انہیں بُری لگتی ہے ان کے خلاف وہ بات بھی کرتی ہیں اور بعض موضوعات پر اپنے غصے کو ضبط بھی کرتی ہیں لیکن ساتھ ساتھ اس ضبط کی کیفیت کا اظہار بھی کر دیتی ہیں۔ پسِ آئینہ سے چند شعر دیکھئے:

آئی جب اس کے مقابل تو یہ بھید کھلا
مجھ کو اندازہ نہ تھا اپنی توانائی کا

ایک ایسا چراغ ہے مجھ میں
جس کا اپنا کوئی مکان نہیں

ہوئی ہے آگ سے چاہے رفاقت
دھواں پھیلا ہوا ہے زندگی میں

میرا بھی ایک نام ہے میرا بھی اک مقام
یہ بھول گئی تھی مگر اس کی چاہ میں

یہ انداز کی صورت مجھے پائے کوئی
اور اعزاز کی صورت میں میں کھوئی جاؤں

اس کتاب میں ایک نیم مسلسل غزل خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جس کا مکالمہ ہے:

جس دن وہ مجھ سے الجھا تھا
سارے بندھن بھول گیا تھا

اس غزل ایک شاعرہ نے قطعات کے گہرے بندھنوں میں پڑنے والی ان دراڑوں کا ذکر بڑی نزاکت اور فنکاری سے کیا ہے جن سے اک حساس اور خود اعتماد فردان نما رشتوں کے حوالے سے گذرتا ہے اس غزل میں مشرقی تعلیم یافتہ اور خوددار عورت کے حوالے سے چند ایسی باتیں کی گئی ہیں جو صرف یاسمین حمید کا حصہ ہیں۔

اس کہانی کا ایک اور رخ ان کے دوسرے مجموعے ''حصار بے درودیوار'' کی ایک غزل میں بہت واضح ہو کر سامنے آتا ہے جس کے مطلع میں وہ کہتی ہیں۔

یہ کیسی ضد ہمارے درمیاں ہے
کہ جب دونوں جانب ہی زیاں ہے

اور اس سے آگے چل کر ایک اور بہت نازک اور خوبصورت شعر کچھ اس طرح ہے کہ:

یہ کس پیرائے میں ہے گفتگو اب
نہ میری ہے نہ یہ اس کی زباں ہے

بیسویں صدی کے دوسرے نصف میں اُردو شاعرات سے قطع نظر یہ میدان خالی پڑا تھا۔ یاسمین حمید سے پہلے ادا جعفری' زہرا نگاہ' کشور ناہید' فہمیدہ ریاض' پروین شاکر' شبنم شکیل' اور بہت سی دوسری شاعرات اُردو شاعری کی جدید تاریخ میں بلا تخصیص جس میں اپنا سکہ جما چکی ہیں۔ آج کل بہت زیادہ خواتین شاعری کر رہی ہیں اور آئے دن ان کے مجموعے چھپتے رہتے ہیں لیکن ان میں سے جن چند شاعرات نے اپنے لئے کوئی مستقل مقام حاصل کیا یاسمین حمید ان کی صفِ اول میں ہیں۔

باقی صفحہ ۳۵ پر ملاحظہ کیجیے

ہم دوزمانوں میں پیدا ہوئے

ابوالکلام قاسمی

(●)

اگر سردست یہ فرض کرلیا جائے کہ انیسویں صدی میں ۱۸۵۷ء اور بیسویں صدی میں ۱۹۴۷ء کے بعد اردو شاعری کی تقریباً تمام اصناف میں داخلی اور خارجی سطح پر غیر معمولی تبدیلیاں رونما ہوئیں تو یہ عرض کرنا بھی درست ہوگا کہ تقسیم ہند کے بعد کی شاعری میں خلیل الرحمٰن اعظمی اور ناصر کاظمی نے تجرباتی، موضوعاتی اور فکری سطح کے ساتھ ڈکشن اور اظہار کی سطح پر بعض انقلاب آفریں رویے اختیار کئے۔ ابن انشا کا نام ان دونوں کے ساتھ تو اس لئے ٹانکا جاتا رہا کہ ان کا پہلا شعری مجموعہ بھی ۱۹۵۰ء کے بعد اس زمانے میں چھپ کر آیا تھا اور ہر چند کہ نظیر اکبرآبادی کی بازیافت کا نمونہ بن گیا تھا مگر انہیں بھی ناصر کاظمی اور خلیل الرحمٰن اعظمی کی طرح میر تقی میر کی روایت کی بازیافت کرنے والوں کی طرح پیش کیا گیا۔ ان شاعروں کے بعد کی نسل میں پاکستان میں منیر نیازی، احمد مشتاق اور ظفر اقبال یا ہندوستان میں شہریار، عمیق حنفی، وحید اختر اور عرفان صدیقی کو ایک خاص طرح کے رجحان کی تشکیل کرنے والوں میں شمار کیا جانا چاہیے۔ راشد، میرا جی یا فیض، سردار جعفری اور اختر الایمان پر گفتگو کے لئے الگ سے نظریاتی پس منظر کی فراہمی لازمی ہوگی اس لئے محض بعض خواتین شاعرات کشور ناہید، فہمیدہ ریاض اور پروین شاکر کا ذکر برمحل ہوگا، کہ اس قبیل کی شاعرات نے اپنی اپنی شناخت دوسرے موضوعات سے زیادہ تانیثی یا نسائی حوالوں سے بھی کرائی۔

متذکرہ شاعرات کے ساتھ دونوں ملکوں میں عموماً کبھی یاسمین حمید کی شاعری کا ذکر نہیں ملتا۔ یا تو یاسمین حمید کی کم آمیزی اور ان کے کلام کی عدم تشہیر نے یہ صورت حال پیدا کی یا پھر اس لیے ان کی نظموں اور غزلوں کی طرف قارئین تو قارئین نقادوں تک کی توجہ مبذول نہیں ہوئی کہ ان کی شاعری کو بہت آسانی کے ساتھ روایت، رچاؤ، رائج استعارات اور گھسے پٹے لہجوں سے الگ کئے بغیر نہ تو دیکھنا ممکن تھا اور نہ تنقیدی زبان میں اس شاعری کی پہچان کا تعین کرنا آسان تھا۔ راقم الحروف کو جب ان کے متعدد مجموعوں کے ایک عمدہ انتخاب ''ہم دوزمانوں میں پیدا ہوئے'' کے مطالعہ کا موقع ملا تو یاسمین حمید کی شاعری نے اسے استعجاب ہی نہیں انکشاف کی کیفیت سے دوچار کیا۔ ان کی غزلیں اردو کی قدیم وجدید غزل کا تسلسل ضرور دکھائی دیتی ہیں مگر موضوعاتی اور لسانی سطح پر اس کی تکرار یا محض بازگشت نہیں معلوم ہوتیں۔ یاسمین حمید کی نظمیں ہر چند کہ غزلوں سے کہیں زیادہ ان کے مزاج اور افتادِ طبع سے ہم آہنگ ہیں۔ اگر ان کے بعض غزلیہ اشعار پر ایک نگاہ ڈالئے تو مانوس کو نامانوس بنا کر تازگی پیدا کرنے اور ایک بالکل نئے شعری محاورے میں اظہار کی راہیں ہموار کرنے کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ایسا بھی نہیں کہ ان کی شاعری میں کہیں سپاٹ بیان ملتا ہو، تہہ داری کی کمی ہو یا بین السطور میں بھی کچھ نہ کچھ کہہ دینے کا انداز نہ ملتا ہو۔ اردو غزل خواہ کلاسیکی ہو یا جدید، اس کی رائج لفظیات سے ایک فاصلہ اختیار کرنے کے باوجود اپنی غزل میں رمزیت اور تہہ داری کے ساتھ بالکل انوکھے اور جدید طرز احساس کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتا ہے۔

یہ بھی ہوتا ہے کہ یوں ہی دیکھتی رہتی ہے آنکھ
روح و دل کا کوئی دروازہ کھلا ہوتا نہیں

تم مری بینائی کو محدود کر دیتے ہو یوں
عکس کوئی آنکھ میں پھر دوسرا ہوتا نہیں

حاصل زیست ہو خلوت مگر اتنی بھی نہیں
خود سے کی جائے محبت مگر اتنی بھی نہیں

کیا ہوا خشک ہوئے جاتے ہیں دریا سارے
ہے مری فصل کی قیمت مگر اتنی بھی نہیں

تعلق کی کہانی کے کسی بھی مرحلے میں
کوئی دامن چھڑائے گا تو دامن چھوڑ دیں گے

اذیت اس کی دونوں صورتوں میں ایک سی ہے
مگر پاؤں سلامت ہیں تو چھالا پھوڑ دیں گے

اظہار کی اس جرأت کے ساتھ شائستگی، رکھ رکھاؤ اور خود اعتمادی کی بعض مثالیں معاصر نظموں میں تو آسانی سے تلاش کی جاسکتی ہیں مگر معاصر غزل میں ان حوالوں سے گفتگو کی نوبت کم کم ہی آپاتی ہے۔

یاسمین حمید کی نظموں میں آزاد ہیئت کے ساتھ نثری شاعری کی ہیئت کا بھی استعمال ملتا ہے مگر ہر جگہ تحت البیان کی کیفیت نمایاں ہے۔ بعض نظموں کے دو تین مصرعوں میں بھی اس کیفیت کی عکاسی کو دیکھا جاسکتا ہے۔

یہاں آ کر / مری آنکھیں مجھے اک کھیل میں الجھانے لگتی ہیں / میں سمتوں کو ملاتی حد فاصل پر کھڑی رہتی ہوں / سب کچھ صاف دکھتا ہے / بہت سفاک دکھتا ہے / مگر پھر بھی میں حیلے ڈھونڈھتی ہوں اپنے حق میں / اور خود کو مطمئن کر کے / ہمیشہ مات کھاتی ہوں / یہاں کچھ تھک سی جاتی ہوں (اپنے حق میں) بعض لوگوں کو اداس پیدا کیا گیا / اور اداس رکھا گیا / تاکہ وہ دنیا کو خوبصورت بنائیں / ہمیں دکھ سے محبت ہوگئی / سورج مکھی کے بیج ہماری مٹھیوں سے پھسل کر

زمین میں چنکے اور فاختاؤں کے انڈے محفوظ ہوئے اہم نے حوض کی تصویر بنائی اور پانی کے رنگ کو بدل دیا (ہمارے منصب میں) اپنے لفظوں کو کیسے مرتب کریں اہم سخن کے خداؤں کی تعظیم کرنے میں مصروف ہیں الفظ ہم سے مخاطب ہیں اور پوچھتے بھی ہیں ا کیوں ہم نے ایسا کیا ان کو حیرت ہے ا کیوں ہم نے سکتے کے عالم میں رہنا گوارہ کیا

(قدیم عورت اور تخلیق)

اردو نظموں میں اظہار کے اسالیب خاصے انوکھے اور غیر روایتی ہیں۔ ایک خاتون کی شاعری میں کسی تانیثی ایجنڈے کی بازگشت نہ ہونے کے باوجود نسائی شناخت سے ناآشنائی نہیں۔ اداسی اور درد کی آمیزش کے ساتھ متانت اظہار، یاسمین حمید کی نظموں کا وہ اختصاص ہے جو ان کو نمائندہ معاصر شاعرات میں بھی ممتاز بناتا ہے، اور اپنے زمانے کی نظموں کے متنوع اسالیب کے درمیان انفرادیت کی گواہی دیتا ہے۔

اس شعری انتخاب میں ممتاز ادیب رضی مجتبیٰ کی نظر انتخاب کے کرشمے ہر جگہ کارفرما ہیں۔ نجیبہ عارف نے یاسمین حمید کی شاعری کی تفہیم کا حق ادا کیا ہے اور خود شاعرہ کے تحریر کردہ چند صفحات ان کے اپنے تخلیقی عمل کو گرفت میں لینے کی عمدہ کوشش کہے جاسکتے ہیں۔ یوں بھی اپنے تخلیقی عمل سے خود شاعر کی آگہی جس طرح خوش آئند بات نہیں ہوتی اسی طرح اس سے مکمل بے خبری بھی تخلیق اور تخلیق کار دونوں کو ہوا میں معلق رکھتی ہے۔

اس پس منظر میں شاعرہ کے بعض بیانات اور خود شاعری کے متذکرہ معروضات کا ثبوت فراہم کیا جاسکتا ہے۔ وہ اپنے تخلیقی عمل کی بازیافت کچھ اس طرح کرتی ہیں کہ ابہام اور بے جوڑ ٹکڑوں کے اتفاقی ارتباط میں فرق کرنا چاہیے۔ شاعری میں حجاب کا حسن بڑی چیز ہے لیکن اسے اپنے اوپر طاری کرنے کی کوشش میں کامیابی کے امکانات کم ہوجاتے ہیں۔

☆

بقیہ : خوشیوں کا گھر

کسی طرح جب بن نہیں پڑتی — پھر تو سنبھل جانا ہوتا ہے
سوال کو شکست ابھی ہوئی نہیں — زمین دل کی سخت ابھی ہوئی نہیں
محبتوں کے پہلے موسموں کی فصل — ہوا کا ساز و رخت ابھی ہوئی نہیں
اپنا بوجھ بڑھا کر اس کا کم کردوں — دھیان اسی سولی پہ لٹکا رہتا ہے

ان اشعار میں نہ صرف زندگی ہے بلکہ زندگی کرنے کا ہنر بھی ملتا ہے۔ یاسمین حمید کے فن کا یہی حوالہ ہے جو انھیں اپنے دوسرے معاصرین سے ممتاز کرتا ہے۔

- بقیہ -

ماورائے درودیوار

ان کی غزلوں میں ردیف اور قافیے کے تخلیقی استعمال کے ساتھ ساتھ کچھ ایسی زمینیں بھی نظر آتی ہیں جو نئی بھی ہیں اور خوبصورت بھی اور ان میں شاعرہ کے عمومی لہجے کا ایک ایسا پرتو بھی نظر آتا ہے۔ شاعری اور شخصیت ایک دوسرے سے گھل مل جاتے ہیں مثال کے طور پر ایک غزل کے دو شعر دیکھئے۔

مجھے آگہی کا نشان سمجھ کے مٹاؤ مت — یہ چراغ جلنے لگا اس کو بجھاؤ مت
مجھے دیکھ لینے دو صبح فردا کی روشنی — میری آنکھ سے ابھی ہاتھ اپنا ہٹاؤ مت

''پس آئینہ'' میں صرف ایک نظم سے جو اس کتاب کے آخری صفحے پر درج ہے مگر بعد کی کتابوں میں نظموں کی تعداد بتدریج بڑھتی چلی گئی ہے اور آخری مجموعے ''فنا بھی ایک سراب'' میں نظموں کی تعداد غزلوں سے بڑھ گئی ہے یہ نظمیں عام طور پر پندرہ بیس لائنوں پر مشتمل ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعرہ اپنی بات کو Compact انداز میں کرنے کی عادی ہے اور بات کو بے جا طور پر طول نہیں دیتی موضوعات کے اعتبار سے بھی ان میں ایک ایسا تنوع ہے جو ایک ہی مرکز سے پھوٹتا ہوا نظر آتا ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یاسمین حمید اُردو کی ایک نمائندہ شاعرہ قرار پائی ہیں اور اکیسویں میں جن آوازوں کی گونج دیر تک سنائی دینے کے امکانات روشن ہیں ان میں یاسمین حمید کی آواز بہت نمایاں ہے امید واثق ہے کہ مستقبل میں اپنے اس مقام کو مزید مستحکم کریں گی۔

''ہجر کا التزام''

عذرا عباس
(کراچی)

یاسمین حمید شاعری میں مجھے اپنے قریب لے جاتی ہے مجھ سے اس کی شاعری کہتی ہے مجھے پڑھو اپنی شاعری میں ہمیں دکھاتی ہو زندگی کیسے گزاری جاتی ہے اب مجھے بھی پڑھو اور دیکھو ایک زندگی ایسے بھی گزرتی ہے۔ یہ صرف لفظوں کی بازیگری نہیں یہ تو ایندھن ہے جو گاہے بگاہے اس کو جلاتا رہا ہے وہ کہتی ہے ''اگر میں خدا ہوتی'' بات یہاں سے ہی شروع ہوتی ہے۔جب وہ کہتی ہے بعض لوگوں کو اداس پیدا کیا گیا۔اور اداس رکھا گیا میں سوچتی ہوں سچ ہے یاسمین زندگی کے تجربے سہتی ہے اور کہتی ہے اگر میں خدا ہوتی اس کے بعد آپ کے سوچنے کے لئے بہت ہے۔

یہ بات اتنی آسانی سے نہیں کہی جاسکتی جب تک آپ کو زندگی نے اس بھٹی کی آنچ سے سینکا نا ہو جب وہ یہ کہہ رہی ہے اگر میں خدا ہوتی اب آپ اس کے پیچھے پیچھے جائیں دیکھیں وہ کہیں خدا بن گئی تب خطرے سے خالی نہیں ہے آگ میں وہ جھلس رہی ہے۔ کیا جھلس گئی ہم اس غلطی میں غلطاں و پیچاں ہیں۔لفظوں کی بازی گری ہمیں زندگی کے معنی سے دور لے جاتی ہے وہ زندگی جو ایک شاعر گزار رہا ہوتا ہے ہم اس کے لفظوں کو سہلاتے ہیں اور خود کو ان لفظوں سے سہلواتے ہیں۔مزا آتا ہے نا۔

(میں روائتی زبان میں تعریف کر سکتی ہوں نہ ان دیواروں کو اپنی زبان کی لاتوں سے گراؤں گی بس جو لفظ اس نے چنے ہیں اپنے دکھوں کو سمیٹنے میں انھیں اپنے بیان میں اکٹھا کروں گی۔اور بتاؤں گی۔ایک یاسمین حمید ہے جو شاعر ہے جو جانتی ہے تنہائی کسے کہتے ہیں اور اور تجربوں کا وہ ملغوبہ جو اس کی زندا گی کو استعارے فراہم کرتا ہے۔

اس کے ہاں خدا نا بننے کی ناکامی نے کیسے فساد پیدا کئے ہیں (پڑھیے یہ نظم) تھوک دی میں نے یہ نظم۔ لو چاٹ لو۔اپنی لمبی زبان سے۔میں نے صبر کیا۔تجربے کی اس گھڑی میں یاسمین کو کہاں جھونکا جا رہا تھا۔صبر کا یہ سفر کیسے طے کر رہی ہے اس کی نظم سفر کر رہی ہے ہم بھی پیچھے پیچھے ہیں بس سوچا جا سکتا یا اس نظم کے پیچھا کرتے ہوئے ہم اپنی کایا کلپ نا کر لیں اور یاسمین کا بنایا ہوا انسان ہم ہی تو نہیں۔

جب ہم ہمیں غلاظت سے عطر کشید کرنے کی تلقین کی گئی
اب دیکھیں) تو ہم نے ہجر کا التزام کیا
اور بھیڑ میں غائب ہو گئے
یہ مصرعے ہمیں کھرا کھرا سنا رہے ہیں)
بے بسی کے اژدہام میں کیا کیا کشید کیا جا رہا ہے
کیا کہتی ہے یاسمین اف ہائے زندگی کا جبر ٹھہر ٹھہر کر نازل ہو گا
ساری دنیا کو یک مشت اداس نہیں ہونا چاہے
(اب بتایئے دنیا کا سفر نامہ اپنے ہاتھوں میں لئے کھڑی ہے اور کہہ رہی ہے)
ہمارے عہد کی تاریخ
ہمارے دل کی تاریخ سے مختلف ہے (کمال ہے)
ہمارے بچوں کی حقارت ہمیں بتائیگی
کہ ہمارا نام کس زمانے میں درج ہے
ہم دو زمانوں میں پیدا ہوئے
اب یاسمین اپنی نظموں میں ہمیں دکھائی دے رہی ہے
وہ لبیک کہتے ہوئے کسی سے کہہ رہی ہے
اور یہاں۔میرے پہلو میں تیرا دیا ہوا دکھ
یہ لفظوں کی کلکاریاں نہیں ہیں یہ تپش ہے اس زندگی کی جو وہ لے کر جا رہی ہے آخری دشت کے فاصلے لبیک اللھم لبیک
نیر عباس نیر کیا میں نے سچ کہا۔

- بقیہ -

''حقیقتوں کے سامنے''

نظم کے اس ٹکڑے میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ یاسمین حمید نے ایک خواب میں دیکھے جانے والے ایسے مناظر سے اپنی جمالیات کو متشکل کیا ہے جو حیرت کی ایک دھند میں لپٹے ہوئے ہیں۔ان حیرتوں میں استفسار ہو جانے کی گنجائش بھی ہیں گویا پوچھا جا رہا کہ یہ کیسے مناظر ہیں جو انہیں دیکھنا پڑے ہیں؟ یا ایسے مناظر وہ کیوں دیکھنے کو مجبور ہیں؟ ایک اور سطح پر یہ ایک جبر کی کیفیت ہے جو ان کے لیے ہونی شدنی جیسی ہو گئی ہے اور آخر میں ایک راست استفسار: ''تم نے خواب میں کیا دیکھا؟''۔خواب میں دیکھے گئے منظروں کی تقلیب، حیرت کی تجسیم اور تجسس سے دانستہ گئے سوال پر نظم کا انقطاع، بظاہر بہت کم مایہ حیلے ہیں۔نہ کوئی نامانوس یا شوخ لفظ، نہ کوئی نئی ترکیب، نہ چونکانے والے موضوعات کا کوئی حیلہ مگر اس سب کے نہ ہوتے ہوئے بھی اپنی جمالیات کا جادو الگ سے جگا لینا، میرے نزدیک وہ صفتِ خاص جو یاسمین حمید کو اس شعری منظر نامے میں الگ اور ممتاز کرتا ہے۔

نرم ہَوا کی دستک

آفتاب حسین (آسٹریا)

معاصر اُردو شاعری کے نقّار خانے میں متعدّد اور مختلف آوازیں سننے کو ملتی ہیں۔ مختلف ہونا تو خیر ایک خوشگوار بات ہے لیکن آوازوں کی کثرت بسا اوقات اُنھیں شور میں بھی تبدیل کر دیتی ہے چنانچہ اِس ہاہا کار میں توجّہ حاصل کرنے کے لیے زیادہ تر آوازیں اِس قدر بلند اور تیکھی (ہوتی) ہیں کہ وہ حسّاس سامعین میں ایک طرح کا نفور پیدا کر دیتی ہیں۔

اِسی نقّار خانے میں یاسمین حمید اپنی مدّھم اور مہذّب آواز میں بات کر رہی ہیں۔ اور یہ دھیما پن، یہ تہذیب اِس ایقان کی عطا ہے کہ اگر آپ کے کلام میں اثر اور تاثیر موجود ہے تو آپ کو چیخ کر بات کرنے کی ضرورت نہیں۔

ہمارے زمانے میں جب شعر کہنے والوں کی کثیر تعداد کسی باتونی بچّے کی طرح چپڑ چپڑ بولنے اور جلدی جلدی سب کچھ کہ دینے کے کرب میں مبتلا دکھائی دیتی ہے، یاسمین حمید کا سخنِ زیرِ لب، اپنی بات کو سینت کر رکھنے اور سنبھال کر کہنے کا انداز اور سرگوشی کی سطح پر آیا ہوا لہجہ، جیسے کہیں کہیں بات کو جان بوجھ کر بیچ میں اَدھورا چھوڑ دیا گیا ہو، کانوں کو بھلا اور دِل کو اچّھا لگتا ہے۔

آج ہماری اِس خوبصورت، نفیس اور سلیقہ مند شاعرہ کے یومِ تولُّد پر انھیں دِلی مبارک دیتے ہوئے اور اُن کی صحت و سلامتی کی دعاؤں کے ساتھ اپنے احباب کے لیے اُن کی غزلوں اور نظموں سے ایک مختصر انتخاب پیش ہے۔

گھر جہاں ہونا تھا نقشے میں، وہیں پر گھر ہے
اِس سے آگے کی مگر بات بتاتے کس کو

مَیں نے مضموں کے معانی کو بدل کر دیکھا
اَبرِ تخلیق کیا، آگ میں جل کر دکھا

لمحے کی سفّا کی ہم سے پوچھ رہی ہے
ایک ہی نقشہ دِل کے اندر کیسا ہو گا

کسی کے نرم لہجے کا قرینہ
مری آواز میں شامل رہا ہے

ہم نے دِل کے رشتوں کی ہم راہی میں بھی
اپنے ہاتھ میں تھامے اپنے ہاتھ کو رکّھا

غُبارِ بے یقینی نے مجھے روکا ہُوا ہے
زمیں سے پُھوٹ کر باہر نکلنا چاہتی ہُوں

کسی کے خواب کی تکمیل میں پتّھر ہوئی تھی
اب اپنے خواب کی لَو سے پگھلنا چاہتی ہُوں

یہ کون ہم کو یہاں ڈھونڈھتا ہُوا آیا
ہم اپنا گیت سُنا کر یہاں سے جا بھی چکے

اسے تلاش کیا جائے دستِ خالق میں
کمی جو نقش میں لگتی ہے نقش گر میں نہ ہو

خود آفتاب مری راہ کا چراغ بنے
مگر یہ بات مرے چاند کو گوارا نہیں

گونجتی جو روح کی خلوت سرا میں بارہا
میری سرگوشی کی، اُس کی بات کی آواز تھی

کیا ملا درد کی گہرائی سے
بے نشاں تم بھی ہُوئے، ہم بھی ہُوئے

رزمِ احساس سے مہرہ ہی ہٹا دُوں اُس کا
ہے مجھے اُس سے شکایت مگر اِتنی بھی نہیں

گھر کے آنگن میں ایک دروازہ
صرف باہر کی سمت کُھلتا ہے

عطائے ابر سے اِنکار کرنا چاہیے تھا
مَیں صحرا تھی، مجھے اِقرار کرنا چاہیے تھا

نرم ہَوا کی دستک تو اب خواب ہُوئی
اُس کی آہٹ سنتی ہُوں طوفانوں میں

کہیں کہیں اِک پردہ سا رہ جاتا ہے
سب کردار نہیں کُھلتے افسانوں میں

گریۂ ہجر کو رُکنے کا اِشارا ہی نہ ہو
کیا خبر اپنے سمندر کا کنارا ہی نہ ہو

یہ بھی ہو سکتا ہے جب گونج اُٹھیں نغمہ و نَے
کوئی آواز سماعت کو گوارا ہی نہ ہو

سب خدوخال مرے دُھند ہُوئے جاتے ہیں
صبح کے رنگ سے آ ؤ، مجھے تصویر کرو

جیتنا میرے لیے کرب ہُوا جاتا ہے
مرے پندار کو توڑو، مجھے تسخیر کرو

کوئی پوچھے مرے مہتاب سے، میرے ستاروں سے
چھلکتا کیوں نہیں سیلاب میں پانی کناروں سے

مجھے قوسِ قزح کی ساعتوں سے پوچھنا ہے
زمیں کا رنگ ہُوں یا گہرا نیلا آسماں ہُوں

مَیں نے اپنے آپ کو دیکھا (نظم نمبر۱)

مَیں نے اپنے آپ کو دیکھا
خواب میں دیکھا
مَیں نے خواب میں دُنیا دیکھی
بہری مُورکھ دُنیا کو
چوپال میں بیٹھے
سر جوڑے
منہ موڑے دیکھا
ہاتھوں میں کچھ لفظوں کا سرمایہ دیکھا
تھوڑی دیر کو سایہ دیکھا
ورق الٹ کر پڑھنا چاہا تو ہاتھوں پر
بادل جیسی دھند کی گیلی چادر دیکھی
اپنی آنکھوں کو پاتال کے اندر دیکھا
بھید بھری خاموشی دیکھی
اپنے دِل میں چُپ کی آگ کو بھرتے دیکھا
دِل کو پانی کے چھینٹوں سے ڈرتے دیکھا
سانس اُکھڑتے دیکھی اپنی
اور زباں میں لُکنت دیکھی
اپنے جسم کو مرتے دیکھا
دُور کہیں چوپال سے باہر
پچھلی رات کے بوڑھے پیڑ کو
پتّا پتّا جھڑتے دیکھا

تُم نے خواب میں کس کو دیکھا؟

754PK (نظم نمبر۲)

شہر جگمگا رہا ہے
اور کسی خفیف روشنی میں تم بھی سو رہے ہو

اِن بلندیوں سے
چاند کی زمیں قریب ہے
مگر نہیں
ہَوا یہاں پہ تیز ہے کہ سرد ہے
کسی کو بھی خبر نہیں
یہ بادلوں کا تیرتا دُھواں ہے
یا رفاقتوں کی گرد ہے
یہ کانپتی ہُوئی صدائے واپسیں کی لہر ہے
کہ ڈولتا ہُوا بدن اُڑان کا
کہ جُھولتی ہُوئی زمیں نشیب کی
وہ کون تھا جو مُٹھیوں میں ریت بھر کے سو گیا
خیال و خواب سے بھی دُور ہو گیا
بھٹکتی راہ کے اُلجھتے گیسوؤں میں کھو گیا

ستارے میرے ساتھ چل رہے ہیں کیا
وہ کون سی خلش ہے، جس کو مطمئن نہیں کیا
بلندیوں، جدائیوں نے
موت کے خیال نے بھی مطمئن نہیں کیا

بلندیوں کے،
پستیوں کے ہم سفر
بتاؤ تو
زمین پر
فضاؤں میں
جو راستہ نہیں بنا
وہ کیا ہُوا

بتاؤ تو
جو رات کی فصیل پار کر سکے
جو صبح میں بدل سکے
وہ کس طرح کی نیند ہے
وہ کس طرح کا خواب ہے
بتاؤ یہ فضا میں کیسی ہُوک ہے
یہ کیسا اضطراب ہے
سفر کا اختتام ہو رہا ہے
اور شور بے حساب ہے

وحشت کا کنارا

ڈاکٹر نجیبہ عارف
(اسلام آباد)

شاعری کیا ہے؟ کہاں سے آتی ہے؟ کیا کام کرتی ہے؟ شعر کہنے والے سے کیا معاملہ کرتی ہے اور شعر سننے یا پڑھنے والے پر کیا عمل کرتی ہے؟ ہم شاعری کیوں پڑھتے ہیں اور اچھا شعر، یعنی وہ شعر جو ہمیں اچھا لگے، پڑھ کر ہم پر جو عالم بیت جاتا ہے، اس کی توجیہ کیسے کی جاتی ہے؟ خود شاعر کب اور کیسے اس عمل پر قادر ہو جاتا ہے کہ وہ چند لفظوں کو ایسی ترتیب سے بیان کر دے کہ دل اچھل کر حلق میں آ جائے؟

ان سب سوالوں کو دو زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا حصہ شاعر کے شعر کہنے کے عمل سے متعلق ہے؛ یعنی شعر میں تاثیر کہاں سے آتی ہے اور یہ مخصوص کیفیات پیدا کرنے پر کیسے قادر ہوتا ہے۔ تخلیقی عمل ایک پراسرار وادی ہے۔ فہم و خیال کا ایک اور ہی منطقہ ہے۔ اس وادی سے گزرنے والے بھی اس کا حال پوری طرح بیان نہیں کر پاتے۔ اس لیے فی الحال اس سوال کو یہیں چھوڑتے ہیں اور دوسرے میدان میں اترتے ہیں۔

ایک قاری کی حیثیت سے شعر — اچھا شعر — دل و دماغ کو کیوں لے اڑتا ہے؟ کیوں ایسا لگتا ہے جیسے اندر کہیں گہرائی میں روشنی کا جھما کا سا ہوا ہو، جیسے کسی نے دل کے آبلے کو ہلکے سے چھو لیا ہو، جیسے اچانک کوئی سایہ اجالے میں بدل جائے، جیسے جھولا جب اونچی اڑان سے واپس آتا ہے تو دل بیٹھنے لگتا ہے، جیسے یکا یک کوئی آپ کو اندر کی طرف کھینچ لیتا ہے، کسی پرانی باؤلی کی منڈیر سے نیچے دھکیل دیتا ہے اور آپ دیر تک بے وزنی کی کیفیت میں اڑنے اور گرنے کا بہ یک وقت مزہ لیتے رہتے ہیں۔ یہ اور اس سے ملتی جلتی کتنی ہی کیفیات جو بعض اشعار پڑھ کر دل پر وارد ہو جاتی ہیں، کہاں سے پھوٹتی ہیں؟ وہی بات جو شعر میں کہی گئی ہے، اگر نثر میں بیان کر دی جائے تو ویسے ہی نتائج کیوں برآمد نہیں ہوتے؟ یہ وہ سوال ہیں جو شاعری پڑھتے یا پڑھاتے ہوئے ہمیشہ میرے ذہن میں ابھرتے رہتے ہیں اور طالب علموں سے شاعری کی اہمیت اور اس کے اثرات و نتائج پر بات کرتے ہوئے ہمیشہ ان کے نئے نئے جواب سوجھتے رہتے ہیں، لیکن کوئی ایسا جواب جو ہمیشہ کے لیے کافی ہو، نہیں ملتا۔

شاعری کے بارے میں، زندگی کے بارے میں، دنیا کے بارے میں، اور اس سے ہٹ کر جو کچھ بھی ہے، یا ہو سکتا ہے، اس سب کے بارے میں، ہم جو کچھ جانتے یا سمجھتے بوجھتے ہیں وہ اصلاً ہمارے نجی تجربے یا احساس سے اخذ ہوتا ہے۔ تجربے سے میری مراد وہ سب کچھ ہے جو ہم اپنی ذات کی سطح پر جھیلتے ہیں، خواہ وہ خارجی دنیا سے متعلق ہو، خواہ ہمارے مطالعات کا ثمر ہو، خواہ ہمارے اپنے جسم و جاں پر اترنے والے عذابوں اور ثوابوں کے پکے نشان ہوں۔ ہم ہر بات ہر تجربے کو اسی حد تک سمجھ پاتے ہیں جس حد تک ہمارے اندر گنجائش یا سمائی ہوتی ہے۔ ایسے میں یہ دعویٰ کرنا کہ کسی بھی شے پر کوئی معروضی حکم لگایا جا سکتا ہے، کچھ نیم پختہ سی خود اعتمادی معلوم ہوتا ہے۔ مجھے آہستہ آہستہ کامل یقین ہوتا جا رہا ہے کہ جسے ہم معروضیت کہتے ہیں، وہ محض خود فریبی ہے۔ ہم معروضیت کا دعویٰ کر سکتے ہیں، اس کے حقیقی ہونے پر اصرار کر سکتے ہیں، مگر مکمل طور پر معروضی نہیں ہوتے۔ اگرچہ معروضیت کا التباس پیدا کرنے کے لیے ہم کئی قسم کے بکھیڑے پالتے ہیں۔

یاسمین حمید کی شاعری مجھے بہت پسند ہے۔ یہ ایک موضوعی رائے ہے، لیکن اسے معروضی بنانے کے لیے میں یہ سمجھنے کی کوشش کرتی رہتی ہوں کہ جو شے مجھے پسند آتی ہے، اس میں ایسی کیا بات ہوتی ہے جو مجھے اپنی طرف کھینچتی ہے۔ آخر یاسمین کی شاعری میں ایسا کیا ہے جو میرے قلب و ذہن کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور میری ذات کا حصہ بن جاتا ہے۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یاسمین کی شاعری مجھے اپنے گرد و پیش کی جانی پہچانی دنیا سے اٹھا کر ایک اجنبی اور نامانوس دنیا میں لے جاتی ہے۔ ایک ایسی دنیا میں جو کچھ مبہم اور دھندلی سی ہے۔ جہاں کچھ باتیں سمجھ میں آتی ہیں، کچھ نہیں بھی آتیں مگر اچھی لگتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ چیزوں کو سمجھنے کے لیے استعمال ہونے والے وہ سب حواس جو اِس مانوس دنیا میں ہمارے کام آتے ہیں، معطل ہو گئے ہوں۔ جیسے اس اجنبی دنیا میں چیزوں اور باتوں کو سمجھنے کی ضرورت ہی نہ ہو، بس انھیں دیکھنا، آنکھ سے نہیں، احساس کی روشنی سے دیکھنا اور محسوس کرنا کافی ہو۔ خواب میں جینے اور سفر کرنے کے تجربے جیسی، جہاں زمان و مکاں کی بندشیں اور ہوں، جہاں حواس کی قوت اور طرح کی ہو اور جہاں فہم و شعور کی رسائی کا دائرہ کسی نامعلوم منطقے تک پھیلتا چلا جا رہا ہو۔

یہ دنیا خالی اور ویران نہیں۔ یہاں محض چیزیں نہیں، خالی خولی باتیں نہیں، یہاں اس دنیا کے خالق کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔ اس دنیا کے خالق سے میری سُر ملتی ہے۔ اس لیے کہ وہ کوئی خود مکتفی، اپنے آپ اور اپنی دنیا سے مطمئن، اس پر نازاں و شاداں شخصیت نہیں۔ وہ تو ایک اداس روح ہے، جسے اپنی دنیا سے محبت تو ہے مگر اس کے مکمل اور مفتوح ہونے کا غرور نہیں۔ اس میں کسی جوگی کی سی بے نیازی بھی ہے اور کسی عاشق کی سی لگن اور تڑپ بھی۔ اس دنیا کے خالق کے پاس ایک ایسی آنکھ ہے جو وجود کے پار دیکھ سکتی ہے، جو بادل پر تصویر بنا سکتی ہے، جو سائے سے بات کر سکتی ہے، جو خواب میں عمر بتا سکتی ہے۔ لیکن یہ محض خواب کی دنیا کی باسی نہیں۔ اس آنکھ کو ایک ایسے شعور کی روشنی بھی میسر ہے جو ہمہ وقت جاگتا ہے، سوال کرتا ہے، اشیا کی، کیفیات کی، احساسات کی پرتیں اتار اتار کر ان کی تہہ تک پہنچنے کی سعی کرتا ہے اور اپنے ہونے کی دلیل دیتا ہے۔ اس انتخاب میں شامل بیشتر نظمیں اس کی مثال پیش کرتی ہیں۔ یہاں مکمل نظمیں درج کرنے کی گنجائش نہیں۔ نمونے کے طور پر چند ایک سطریں دیکھیے:

وہ دن گزر گئے

چلے گئے اِدھر اُدھر
وجود سے پرے
سرک سرک کے
پاس سے گزر گئے
ہمیں خبر نہیں
کہ اس جہانِ انتظار میں
کوئی کہاں ہے
کس طرف کی خاک میں
جڑیں بنا رہا ہے وہ درخت
جس کے پھول
جس کی پتیاں
ہوا اڑا اڑا کے لا رہی ہے
اس طرف ہمارے کنج میں

(ہمیں خبر نہیں)

یہ وقت جو وقت سے بہت پہلے ہے، اصل میں کہاں ہے؟ یہ وقت بس شاعر کی دنیا میں ہوتا ہے، لیکن جب شاعر اسے بیان کر دیتا ہے تو وہ قاری کے لیے بھی ایک حقیقت بن جاتا ہے۔ شاعر اپنے تخیل سے ناموجود کو موجود اور نازائیدہ کو زائیدہ بنا دیتا ہے۔ یہ سطریں پڑھتے ہی کائنات کی بے کرانی کا تحیر اور ہراس دل کو گھیر لیتا ہے۔ وقت کی تہ در تہ پرتیں، جو ایک کے بعد ایک سامنے آتی ہیں، جسم و جاں کو گھیر لیتی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی نے جھیل میں پتھر پھینک دیا ہو اور اس سے بننے والے بھنور دائرہ در دائرہ پھیلتے جا رہے ہوں۔ تخلیقِ کائنات کی کہانی نظر کے سامنے ایسے پھیل جاتی ہے جیسے بجلی کوند جائے۔ علت و معلول کا سلسلہ ہر طرف پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔

یاسمین کی شاعری کی یہ خاص خوبی ہے کہ آنکھوں کے سامنے ایک جیتا جاگتا منظر روشن کر دیتی ہے، لیکن یہ اس نوعیت کی منظر نگاری نہیں ہے جو عام طور پر ٹھوس خارجی اشیا کی لفظی تصویر کشی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یاسمین کی شاعری کے منظر کیفیات سے تعلق رکھتے ہیں۔ کسی مجرد احساس کو ٹھوس صورت میں تصویر کر دینا، کسی جذبے کو یوں بیان کرنا کہ وہ آنکھوں کے سامنے آ جائے — ان کا اصل کمال ہے۔ ایسی تصویریں ان کے اشعار میں جا بہ جا جگمگاتی ہیں۔

ہوا کی لوح پر لکھے ہوئے پل میں
تمھیں جس آنکھ نے دیکھا
تمھیں معلوم ہے
اس آنکھ میں اک راستہ ہے
اور اک اندھا مسافر
اس پہ صدیاں طے کرے گا
جاگتی اور بولتی صدیاں
لہو کی وحشتوں میں بھاگتی صدیاں
پرانی ہڈیوں میں رینگتی صدیاں
تمھیں معلوم ہے؟
اس آنکھ میں جو راستہ ہے
وہ جہاں پر ختم ہوتا ہے
وہاں چہرے بھی پہچانے نہیں جاتے
زمانوں سے زمانوں تک
وہاں سب نام
جس کے نام میں تحلیل ہوتے ہیں
اسی کے اذن سے میں ہوں
اسی کے اذن سے تم ہو
اسی کے اذن سے صدیاں مسافت طے کریں گی!

(ہوا کی لوح پر)

سمندر کی معلوم حد سے
کسی اور حد تک
سفر ہی سفر تھا
مرا تو سمندر میں گھر تھا
میں دشت و بیاباں سے دور
اپنی گہرائیوں میں مگن تھی
روانی میں رستہ بناتے ہوئے
ڈوبتے چڑھتے سورج کے
کرنوں بھرے تھال کو
میں نے ہاتھوں میں لے کر اچھالا
تو میرا خدا مسکرایا

(ایہہ گل الف سجھائی)

یہ منظر خواب کے ہوں یا خیال کے، قاری اس دنیا کا لمس اپنی آنکھوں پر اور عکس احساس کی سطح پر محسوس کر لیتا ہے۔ ان سطروں میں ان ہونے منظروں کو اجاگر کرنے اور انھیں ایک زندہ حقیقت بنا دینے کی شکتی صاف محسوس کی جا سکتی ہے۔ ان میں سے کچھ منظر خارجی نوعیت کے ہیں، مثلاً:

''بہری مور کھ دنیا کو
چوپال میں بیٹھے
سر جوڑے
منہ موڑے دیکھا''

اور کچھ منظر بالکل داخلی اور تجریدی نوعیت کے ہیں، مثلاً:

''اپنے دل میں چپ کی آگ کو بھرتے دیکھا
دل کو پانی کے چھینٹوں سے ڈرتے دیکھا

سانس اکھڑتے دیکھی اپنی
اور زبان میں لکنت دیکھی
اپنے جسم کو مرتے دیکھا''

لیکن دونوں طرح کے منظر یکساں طور زندہ اور متحرک دکھائی دیتے ہیں۔

اس کے برعکس ایک اور نظم دیکھیے جس میں وہ سکوت اور ٹھہراؤ کی تصویر بناتی ہیں۔ایک حنوط شدہ دنیا، جس میں ہر شے ساکن و منجمد ہے۔ایک مکمل سناٹا اور لاحرکتی۔لیکن اس فنا کا انجام اندھیرا نہیں ہے۔اس کے اختتام پر ایک امید بھی ہے۔بھٹکتی ہوئی انگلیوں کے حرکت میں آنے کی امید اور آسمانوں پر وہ بات لکھنے کی امید جو کسی ادھورے خواب میں لکھنے سے رہ گئی تھی۔انسان کے دل میں اگتے ہوئے کسی مکمل دنیا کے خواب فنا کے بعد بھی نہیں مرتے۔

یاسمین کی شاعری میں کئی جگہ ایک ابہام سا ملتا ہے۔ابہام کو کچھ لوگ ایک خامی سمجھتے ہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ ہر عمیق تر تجربے کا آخری لمحہ ابہام کی دھند میں لپٹا ہوتا ہے۔ابہام انسانی فہم و شعور کی حدِ رسائی کا سنگِ میل ہے۔یہ سنگِ میل ہر ایک کے لیے مختلف فاصلے پر نصب ہوتا ہے۔لیکن کہیں نہ کہیں آتا ضرور ہے۔ابہام کا ایک مثبت پہلو یہ بھی ہے کہ اس نقطے سے امکانات کی کئی لکیریں نکلتی ہیں اور خیالات کے کئی دریچے وا ہوتے ہیں۔ابہام کی منزل، تخلیقِ نو کی منزل ہے۔یہ نئی دنیاؤں کی تشکیل کی دعوتِ عام ہے۔البتہ شعری ابہام کی یہ مستحسن صورت وہیں سامنے آتی ہے جہاں یہ محض بے معنی پیچیدگی، بے قاعدہ انتشار اور الجھاؤ کی صورت میں سامنے نہیں آتا، بلکہ معنی خیز اشارات اور خیال انگیز امکانات کا سرچشمہ ہوتا ہے۔یاسمین کی شاعری میں ایسے سرچشمے بار بار پھوٹتے ہیں جو ہمیں ایک صدراہے پر کھڑا کر دیتے ہیں جس کے ہر طرف ایک منزل کا دروازہ کھلتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ یاسمین کے شعری موضوعات بالکل واضح اور سامنے دھری شے کی طرح نمایاں نہیں ہیں۔انھیں کھوجنا پڑتا ہے۔یہ غمِ ذات اور غمِ دنیا دونوں سے معاملہ کرتے ہیں، مگر ان کے ہاں غمِ دنیا بھی غمِ ذات کی طرح باطنی وجود سے پھوٹتا ہے اور محض بلند آہنگ نظریاتی نعروں یا شور و غوغا کی بنیاد پر توجہ طلبی کا مرتکب نہیں ہوتا۔وہ اپنی عصری صورتِ حال کا گہرائی سے تجزیہ کرتی ہیں اور اسے دردمندی سے پیش کرتی ہیں۔

کہانی کو نئے انداز سے تحریر کرنا پڑ رہا ہے
مجھے مسمار کر کے شہر کو تعمیر کرنا پڑ رہا ہے
اٹھانا پڑ رہی ہے مجھ کو اک دیوار اپنی سلطنت میں
پھر اس دیوار پر اک سانحہ تحریر کرنا پڑ رہا ہے
ہوا کے ہاتھ میں چلتی درانتی سے مرے نخلِ یقیں تک
مجھے ایک ایک لمحہ خوف کا تصویر کرنا پڑ رہا ہے
تلاشِ ربط میں کچھ گم شدہ کڑیاں ملانا پڑ رہی ہیں
نئے غم کو پرانے زخم سے تعبیر کرنا پڑ رہا ہے

ان کا عصری آشوب، سماجی بافتوں کے ٹوٹ کر بکھر جانے سے، لٹیروں اور فریب کاروں کے رہبروں اور رہنماؤں کا بھیس بدل کر رونما ہونے سے، فرد کے معاشرے کی بھیڑ بھاڑ میں اپنی انفرادیت کھو بیٹھنے سے، انسانی رشتوں کی باریک رگیں سوکھ کر چٹخ جانے سے، قدروں کے بے معنی اور غیر اہم ہو جانے کے کرب سے عبارت ہے۔بعض اوقات تو یہ عصری شعور ایک عجیب شانِ آگاہی سے مخاطب ہوتا نظر آتا ہے اور اس میں پیش بینی اور بصیرت کی واضح جھلک نظر آتی ہے۔

ان کے ہاں عام طور پر دنیا کا تصور بہت وسعت کا حامل ہے۔ان کی دنیا اس پورے کرۂ ارض، بلکہ اس سے بھی آگے نکل کر یہ پوری کائنات معلوم ہوتی ہے جس میں موجود تمام اجسام ارضی و سماوی ان کے شعری احساس سے رشتہ بپا نظر آتے ہیں۔نظم ''کتبہ کون لکھے گا'' وقت کے ایسے منطقے کا حال بیان کرتی ہے جہاں زمین زادوں کی موت کے بعد ان کا بین کرنے والا کوئی نہیں رہے گا کیوں کہ انسان اپنے ہی ہاتھوں فنا کی منزل کو پہنچنے کے لیے بے تاب ہے۔

اس آفاقی طرزِ فکر و احساس کے باوجود اپنے قدموں تلے موجود زمین سے ان کا رشتہ گہرا اور سچا ہے۔اس میں تصنع اور خود ساختہ لگاؤ کا شائبہ نہیں ہوتا۔یہ ایک فطری اور بے ساختہ تعلق ہے جس میں قلبی گداز اور خلوص نظر آتا ہے۔

باوجود یکہ وہ ایک مکمل انسان کی حیثیت سے اپنے اور کائنات کے رشتے کی تعبیر و توضیح کرتی ہیں، یاسمین کی نسائی حسیت بھی ان کے اشعار میں بھرپور اور منفرد انداز میں جلوہ گر ہوتی ہے۔یہ نسائی حسیت ایک گہری دردمندی، انسانی مقام اور معاشرتی تناظر کے بھرپور شعور کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے۔اس میں ایک خود آگاہی، ایک کرب، اور کبھی کبھی جھنجھلاہٹ ضرور ملتی ہے مگر نعرے بازی کی فضا نہیں۔مبالغہ آمیز انداز میں یک طرفہ مؤقف کا اظہار نہیں۔وہ جانتی ہیں کہ ان کے گرد و پیش میں نسائی وجود کو کیا مقام دیا جاتا ہے۔انھیں احساس ہے کہ اسے محض رنگ آمیزی اور زیبائشی عنصر کا درجہ حاصل ہے۔اسے تسکینِ قلب و نظر کا ایک ذریعہ تو سمجھا جاتا ہے مگر اپنی تسکینِ قلب و نظر کا تقاضا یا اہتمام کرنے کا حق حاصل نہیں۔اس بداندیشی پر وہ کڑھتی بھی ہیں اور احتجاج بھی کرتی ہیں مگر جوابی حملے نہیں کرتیں۔خود اعتمادی اور سکون سے اپنی نسائی حسیت کا اثبات کرتی ہیں اور اس کے بیش و کم کے اظہار میں جھجک محسوس نہیں کرتیں۔یوں ان کے کلام میں تانیثی موضوعات کی کمی نہیں مگر ان کا اظہار ایک مختلف آہنگ میں ہوتا ہے۔

''بہت چپ رہے''، ''قدیم عورت اور تخلیق''، ''بہت سانس کھینچوں بھی تو''، ''اپنے حق میں'' اور ایسی کئی اور نظمیں یاسمین کی نسائی حسیت کی ترجمان ہیں۔

موضوعات سے قطعِ نظر جو چیز ان کے شعری منظرنامے میں بہت واضح دکھائی دیتی ہے، وہ ان کی شعری فضا ہے۔یہ فضا تیار کرنے میں دو تین عناصر بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ایک تو کچھ کلیدی الفاظ ہیں، خواب، سمندر، پرندے، آنکھیں، اندھیرا، آسمان، ہوا، جنگل، ساحل، آگ، ستارے۔یہ الفاظ بار بار ان کے مصرعوں اور سطروں میں در آتے ہیں اور ایک طرح کی وسعت، ایک طرح کی خواب ناکی، ایک خاص طرح کا ماحول بنانے میں اہم کردار ادا کرتے

ہیں۔ان الفاظ کی مدد سے وہ ٹھوس تجربات کو بھی تجرید کی بے کرانی اور لطافت عطا کر دیتی ہیں۔فوری نوعیت کے واقعات و تجربات بھی ان کی شاعری میں ایک طرح کی آفاقیت حاصل کر لیتے ہیں اور زمانی و مکانی حدود و قیود سے ماورا معلوم ہوتے ہیں۔

پوری بات اور پورا قصّہ کون لکھے گا
کتنا مشکل تھا یہ رستہ کون لکھے گا
دن اور رات کے آدھے آدھے بٹوارے میں
کتنا کم تھا کس کا حصہ کون لکھے گا
کن ہاتھوں نے کیسے کیسے پتھر کاٹے
کیسے اُن کا بوجھ اٹھایا کون لکھے گا
کتنی دیر کو ہریالی نے آنکھیں کھولیں
کتنی دیر کو بادل برسا کون لکھے گا
جنگل میں گم ہو جانے والے رستے پر
کتنی دھوپ تھی ، کتنا سایہ کون لکھے گا
شہر جلا تو کس نے اس کی راکھ سمیٹی
کتنا تھا کس کا سرمایہ کون لکھے گا
گرتی دیواروں میں سانس کہاں تھی باقی
اور کہاں تک بکھرا ملبہ کون لکھے گا

اس فضا سازی کا دوسرا اہم عنصر ان کا لہجہ ہے جس میں ایک بھاری سکوت اور ٹھہراؤ نمایاں ہے۔اس میں بے صبری، عجلت پسندی اور بے تابی نہیں۔ صبر، سکون اور انتظار کی حوصلہ مندی ہے۔ یہ لہجہ ان کی شخصیت کے دبیز پردوں کا عکاس ہے۔ یاسمین حمید کی دنیا میں خاموشی اور تنہائی کا راج ہے۔زیادہ بھیڑ بھاڑ نہیں ہے۔ایک میں ہے، ایک تم ہو۔اور تم بھی محض ایک خیال ہی ہے، ایک سایہ سا ہے، ایک سراب سا ہے جس کا ہونا بھی موہوم اور نہ ہونا بھی نا قابلِ یقین ہے۔ وہ زیادہ تر خود اپنے ہی روبہ رو دکھائی دیتی ہیں اور اپنی ذات کے آئینہ خانے میں اتر کر رستے کھوجتی نظر آتی ہیں۔انھیں بھی ہر حساس دل کی طرح محبت اور رفاقت اور ہم خیالی اور ہم کلامی کی آرزو ہے مگر اپنے وقار اور تمکنت کی قیمت پر نہیں۔

میں نے مضموں کے معانی کو بدل کر دیکھا
اَبر تخلیق کیا ، آگ میں جل کر دیکھا
فرش سے عرش تلک رستہ بنایا میں نے
اور کچھ دور تلک اس پہ بھی چل کر دیکھا

پرانے متن کی نئی عبارتوں میں کچھ نہ تھا
مگر وہ اک سخن کہ بس نظر جہاں اٹک گئی

ابھی نقش کوئی بنا ہی تھا مری آنکھ میں
کہ الجھ گیا مرے خواب سے مرا خواب گر

لیکن اس ٹھہراؤ اور سکوت کی تہ میں اضطراب، تلاش اور مسلسل جستجو کا رنگ پوشیدہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ یاسمین کے فکری و فنی سفر میں استفہام کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ان کی بیشتر غزلوں کی ردیفوں میں سوالیہ انداز غالب ہے۔ کون؟ کہاں؟ کیسے؟ کس طرح؟ کس کو؟ کس جگہ؟ یہ الفاظ اس بے چینی کو ظاہر کرتے ہیں جو زندگی کو سمجھ لینے کی شدید خواہش سے پیدا ہوتی ہے۔یہ استفسار اس ذہنی و فکری قوت کا اظہار ہے جو ہر نامعلوم کو معلوم میں بدل ڈالنے کی دھن میں بدل جاتی ہے۔

تعلق کے بہاؤ کا مقدم استعارا کس جگہ ہے
مرے گہرے سمندر تیری وحشت کا کنارا کس جگہ ہے
بتا اے روز و شب کی بے ثباتی میں توازن رکھنے والے
جسے کل ٹوٹنا ہے آج وہ روشن ستارا کس جگہ ہے
نہ سطحِ آب پر ہے اور نہ تہ میں اس کے ہیں آثار کوئی
بتا اے بحرِ غم! کاغذ کی کشتی کو اتارا کس جگہ ہے
سورج ڈوبے گا تو منظر کیسا ہوگا
تب یہ اتنا بڑا سمندر کیسا ہوگا

اور اب کچھ باتیں اس انتخاب کے بارے میں جو شاعر اور نقاد رضی مجتبیٰ نے کیا ہے۔یاسمین کے کلام کا یہ انتخاب اس قدر احتیاط اور غور و فکر سے مرتب کیا گیا ہے کہ مجھے سب سے زیادہ مشکل اپنی بات کی مثال کے لیے اشعار اور نظمیں چننے میں پیش آئی۔ ہر ہر ورق اپنی طرف کھینچتا رہا۔نظمیں، غزلیں، نثری نظمیں، قطعات اور فردیات، ہر حصہ اپنی جگہ بھرپور ہے۔رضی مجتبیٰ خود اچھے شاعر اور پڑھے لکھے شخص ہیں۔ادب و نقد پر ان کی نگاہ بہت اچھی ہے۔اس کا ایک ثبوت یہ عمدہ انتخاب بھی ہے۔ بلاشبہ یہ انتخاب یاسمین کی شاعری کے بہترین نمونوں پر مشتمل ہے اور از اول تا آخر لطف و مسرت کے ذائقوں سے بھرا ہوا ہے۔

آزادی کے بعد

یعقوب اسرائیل دی ہان (Jacob Israel de Haan) صیہونیت مخالف ایک یہودی شاعر و ادیب تھا جس کو صیہونی (Zionist) جماعت ہگانا (Hagana) نے ۱۹۲۴ میں قتل کر دیا تھا۔ یہ شخص خود فلسطین اس حال میں آیا تھا کہ یہ صیہونی تھا مگر جب اس کے کچھ حریدم (Haredim) یعنی حد سے زیادہ روایتی (Orthodox-ultra) یہودی ربّیوں سے ملاقات ہوئی تو اس کے نظریات میں تبدیلی آئی اور اس نے صیہونیت کے خلاف ایک تحریک کا آغاز کر دیا۔ اور اس کو پھر قتل کر دیا گیا جبکہ وہ ایک یہودی عبادت گاہ سینا گوگ (Synagogue) سے نکل رہا تھا۔ یہ شخص اس بات کا حامی تھا کہ فلسطین پر برطانیہ سے آزادی کے بعد مسلمان حکومت ہی ہونی چاہیئے جس میں امن کے ساتھ یہودیوں کو رہنے دیا جائے۔

بے ثمر پیڑوں کی خواہش

زاہد حسن
(لاہور)

یاسمین حمید کے نئے شعری مجموعہ ''بے ثمر پیڑوں کی خواہش'' کے مطالعہ کا آغاز ہم اُن کی نظم ''اعلان'' سے کرتے ہیں۔ ''اعلان'' جو اُن کے یہاں انسانی اقدار کا اعلامیہ دکھائی دیتی ہے۔

''نہیں
مجھ کو شکستِ فاش دینا
اتنا بھی آساں نہیں ہے
تم
مرے دُشمن ہو تو
پھر جان لو
میں انتقامی کارروائی بھی نہیں کرتی
تمہارا خوف ہی میری توانائی ہے
مجھ کو ہارنے کا ڈر نہیں ہے
ڈر تمھیں ہے
میں اگر اس جنگ میں ہاری
تو اپنے ہارنے کا فیصلہ بھی خود کروں گی''

نظم جیسا کہ پہلے کہا گیا اُن انسانی اقدار کا اظہار ہے جو برابری اور حق وانصاف کی سطح پر نشوونما پاتی ہیں۔ اور جن کا مادہ ہر انسان آغازِ زندگی کے ساتھ ہی فطرتاً اپنے احساس اور روح کا حصہ بنا کر ساتھ لاتا ہے، جو قدرت اسے تفویض کرتی ہے۔ تاہم اس سے بڑھ کر نظم میں عورت کی پوشیدہ طاقت کا خفی اشارہ بھی ملتا ہے جو آخری سطروں میں کھل کر سامنے آجاتا ہے، بالخصوص مشرقی عورت کی اس طاقت کا اظہار، دورِ جدید میں بھی عورت جس سے تہی چلی آتی ہے۔ یاسمین حمید نے ایک بار پھر سے اُسے اپنی اس قوت کا، اس طاقت کی موجودگی کا احساس دِلایا ہے۔ یوں اس شعری مجموعہ میں ہمیں عورت کے وجود کا اثبات ملتا ہے۔ اس کی منفرد شکل میں اور مجموعی طور پر بھی وہ ہمیں انسانی پیمائشاتی دکھائی دیتی ہیں جس کے ذریعے ہم نئے تخلیق ہورہے عہد میں قصہء آدم سے آگاہ ہوتے ہیں۔ یوں اُن کی شاعری صحیح معنوں میں انسانی فکر کا اظہار ہے جو دُنیا اور رنگِ دُنیا کو شعری اسلوب میں سمیٹ کر ہمارے سامنے لاتی ہے۔ کچھ اسی بات کو شمس الرحمٰن فاروقی نے زیادہ واضح اور زیادہ خوب صورت انداز سے بیان کیا ہے: لکھتے ہیں۔

''یاسمین حمید کا اصل کمال یہ ہے کہ وہ اپنی تانیثی حیثیت کو بے پردہ نہیں کرتی۔ اس کی شاعری پر، عورت پن، کا خود کار ٹھپہ نہیں ہے۔ وہ عورت بھی اور دُکھ اٹھائے ہوئے، امید وبیم سے لڑتے ہوئے، خوف اور دہشت اور عالم گیر تاجرانہ سماج کے دباؤ میں جینے کی کوشش کرتے ہوئے جدید انسان کی ترجمان بھی ہے۔''

''بے ثمر پیڑوں کی خواہش'' کے شروع میں یاسمین حمید نے ''چند باتیں'' کے عنوان سے جو ایک مفصّل مضمون تحریر کیا ہے دراصل اُن کی اپنی شاعری کو ہی نہیں پوری شاعری کو سمجھنے کے لیے بے حد معاون ثابت ہوتا ہے اور پھر اس مضمون میں انہوں نے جو معیارت قائم کیے ہیں اُن کی شاعری اُن معیارات پر پورا اترتے دکھائی دیتی ہیں۔ یہاں ہم اُن کی نظم ''مجھے جاگنا جب پڑے گا'' کے دو حصّے پڑھتے ہیں اور پھر اُن کی نثری تحریر کا پہلا پیراگراف۔

''مجھے بولنا جب پڑے گا
تو میں اچھے لفظوں میں
گمنام لوگوں کی باتیں کروں گی

مجھے ہارنا جب پڑے گا
تو میں رائگانی کا نقشہ
بناؤں گی تلووں پہ
اور جانے دوں گی اُسے
جس کو جانے کی جلدی ہوئی۔''

کیا زبردست اختتام ہوا ہے نظم کے آخری مصرعوں میں کہ نظم شروع سے آخر تک شاعرہ کے احساس کی ترجمانی کرتی دکھائی دیتی ہے۔ اور اب وہ بات جو شعری معروض کا ایک طرح سے آئینہ ہے اور جس کا اظہار یاسمین حمید نے کیا ہے، لکھتی ہیں:

''وقتِ موجود میں جدید اور قدیم کے کوئی معنی نہیں ہوتے۔ معنی اگر ہوتے ہیں تو تجزیہ نگاروں کے لیے کیونکہ انہیں اپنے موضوع کو زمانی حدود میں رکھ کر کچھ باتوں کے تعین میں سہولت محسوس ہوتی ہے۔ تخلیق کار جس عہد میں اپنا بساط بھر سرمایہ جمع کرتا ہے، اسی عہد کو جانتا اور محسوس کرسکتا ہے۔ محسوس کرنے کے عمل کی پرتوں کا، اس کی پیچیدگیوں کا شمار مشکل ہے۔ احساس اور فکر کے دائرے میں، حالات کی کتنی صورتیں، کن سمتوں سے داخل ہوتی رہتی ہے، ان کو حساب میں نہیں لایا جاسکتا۔ تخلیقی سطح پر انہیں کس طرح اور کس حد تک اظہار کی شکل دی جاسکتی ہے، اس کا انحصار تخلیق کار پر ہے۔''

ایک تخلیق کار اپنے آپ کو آئینہ تمثال بنا سکتا ہے۔ جیسا کہ یاسمین حمید نے اپنی نظم ''تیسری آنکھ'' میں اسے ایک مثال بنایا ہے۔

''آئنے، روز وشب کا چہرہ دیکھ
آئنے، گرد جھاڑ آنکھوں سے
آئنے، عکس کر وہ لو جس میں
خلق خوابوں کا اندراج کرے
ختم ہو جائے مدتوں کی تلاش'' (تیسری آنکھ ۱۰۲)

اور مدتوں سے جاری اس تلاش کا ایک پڑاؤ، ہمیں اُن کی نظم ''بات سچی'' پر کیا گیا نظر آتا ہے۔ تنہائی، جس میں وہ رات رات بھر نظمیں لکھتی ہیں ایسی نظمیں جن سے ''بے ثمر پیڑوں کی خواہش'' جیسا مجموعہ تشکیل پاتا۔ جس کا مطالعہ کرنے کے لیے جب ہم اپنا ہاتھ اسے اُٹھانے کے لیے آگے بڑھاتے ہیں تو ہمارے کانوں میں ایک سرگوشی سی ہوتی ہے، ہم پل بھر کو ٹھہر جاتے ہیں، اس سرگوشی کے باقاعدہ آواز کا روپ دھارنے تک انتظار کرتے ہیں۔ یہ آواز ہمیں ایک تخلیق کار کی آواز معلوم ہوتی ہے۔

''ابھی باقی ہے دن
اس موڑ سے
اُس موڑ تک
رستہ نیا ہے
اور سخن کچھ ان کہے ہیں
کچھ کتابیں بے پڑھی ہیں
ان کو جس ترتیب سے رکھا گیا ہے
ہم اُسی ترتیب سے اُن کو اٹھائیں گے
مگر چھونے سے پہلے
ہاتھ دھولیں گے۔'' (تخلیق کار ۱۰۰)

''وقت'' اور ''زندگی'' یاسمین حمید کے دو اہم موضوعات ہیں، وقت اپنی ازلی اور ابدی شکل میں ٹھوس اور مائع، تبدیل ہوتا ہوا غیر متبدّل، یہ خاصیت محض اور محض وقت کو ہی حاصل ہے۔ وقت کی اس خاصیت پر زندگی جیسی قیمتی شے صرف کرتی خلقت حیرت زدہ ہے کہ وقت کی اس گردش میں، گردش کی بھول بھلیوں میں زندگی کس بے دردی کے ساتھ بیتی جا رہی ہے۔ اس کی صورتیں ہمیں ان کی شاعری میں جا بجا نظر آتی ہیں۔

''جسے تم وقت کہتے ہو
یہ سوکھی ریت کا ٹیلہ ہے
اس کی ان گنت شکلیں
کہاں تک یاد رکھو گے
ہوا سے دوستی کب تک نبھاؤ گے۔ (کہاں تک ۹۴)

ان کے شعری مجموعہ ''فنا بھی ایک سراب'' پر بات کرتے ہوئے میں نے لکھا تھا۔

''نارسائی زندگی کی معنویتوں اور ان المیوں سے ہی تو جنم لے رہی ہے جنھیں تقدیر لحظہ بہ لحظہ شاعرہ کے جریدہء دِل پر مدّون کر رہی ہے۔ یہ درست ہے کہ وقت، تخلیق اور محبت ان کی شاعری کے بنیادی استعارے ہیں، تاہم یاسمین حمید کی شاعری کا کلیدی استعارہ محبت ہی ہے۔ ان کی شاعری کا مطالعہ کرتے وقت محبت رازوں سے بھری ہوا کی مانند ہمارے چار سو سرسراتی پھرتی ہے۔''

اور حقیقت یہ ہے کہ ''بے ثمر پیڑوں کی خواہش'' کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے یہ اعتراف کرتے ہی بنتی ہے کہ تخلیق اور وقت اُن کی نظموں اور غزلوں میں بنیادی استعارے کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں اور کسی معاصر شاعر کی نسبت غالب طور پر۔ انھوں نے وقت کو تخلیق کے فلسفے اور مابعد الطبیعاتی نظام کے طور پر سمجھنے کی کوشش کی ہے اور یہ کہ وقت، زمانے اور زمانے کے اندر موجود اشیاء پر کس طور اور کس طرح کے اثرات چھوڑ جاتا ہے، اور اس سفر میں انسانی احساسات کی کارگزاری کیا رہتی ہے، محبت اور پسماندگان محبت اس رفتارِ وقت سے کیسے کیسے دُکھ اٹھاتے ہیں اور دُکھوں کے موسموں سے کاشت کی گئی کھیتی میں ''ہجر'' اُنہیں کس قدر آسودہ رکھتا ہے۔ یہ سب ہمیں ''بے ثمر پیڑوں کی خواہش'' کی شاعری میں پڑھنے کو ملتا ہے۔

اور روں سے دل کہتا ہے سچی باتیں
خود سے جھوٹے وعدے کرتا رہتا ہے
لوگ سنورتے ، سجتے بنتے رہتے ہیں
اور زمانہ اُن پر ہنستا رہتا ہے
میں انسانوں کے انبوہ کا حصّہ ہوں
اور انسان تو جیتا مرتا رہتا ہے

اور یہ کہ:

موت سے ماورا کوئی بابِ طلسم اس میں تھا
ورنہ تو اس زمین پر شے کوئی دائمی نہ تھی

''بے ثمر پیڑوں کی خواہش'' کی شاعری کے شعری اور تخلیقی تناظر میں مجھے ایک بار پھر سے اپنی ہی بات سنانا ہے کیوں کہ زیرِ مطالعہ مجموعہ کے موضوعات بھی ہمیں وقت، محبت اور خواہشات کے خمیر سے اُٹھے دکھائی دیتے ہیں۔

''وقت اپنی گھمیرتا، تخلیق اپنی شناخت کے حوالے سے، محبت اور شدید محبت کی خواہش اور لاحاصلی سفر کی، محبت کی اور خوابوں کی، یہی وہ موضوعات ہیں۔ یاسمین حمید کی شاعری کا خمیر جن سے اُٹھتا ہے۔''

(فنا بھی ایک سراب۔ ایک مطالعہ)

اپنی بات کو آگے بڑھانے کے لیے مجھے یاسمین حمید کے نقطہء نظر کو وسیلہ بنانا پڑے گا اور اس امر کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ انھوں نے ایک دو فقروں میں کس خوبی کے ساتھ شعر اور شاعری کے اسرار کو کھول کر بیان کیا ہے۔ کہتی ہیں:

''تو پھر شاید یہ کہنا چاہیے کہ شاعری حصول کا نہیں تلاش کا نام ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو لکھنے والا جلد ہی اکتا جاتا۔ اس کا اضطراب ختم ہو جاتا اور تخلیق کی خواہش بھی۔ جو توانائی لکھنے والے کو تلاش کی طرف گامزن رکھتی ہے، اس کی تقسیم کا حساب بھی اسرار کے پردے میں ہے۔''

اپنے اس نظریے کو انہوں نے اپنی نظموں اور غزلوں میں کمال ہنروری کے ساتھ برتا ہے، اور زندگی کے ان فلسفیانہ معاملات کو جو کائنات میں جی رہے انسان کے وجود اور روح کے ساتھ جُڑے ہیں، ان کو اپنا موضوع بنایا ہے۔

''بے ثمر پیڑوں کی خواہش'' ان کا پانچواں شعری مجموعہ ہے۔ اسے

ہم پانچویں حواس اور پانچویں چراغ کے طور پر بھی جانچ، دیکھ سکتے ہیں اس میں انھوں نے زندگی کی بستی کے چاروں کھونٹ کا احوال بیان کیا ہے۔ رات پڑنے پر بستی کے مسافروں کی آسانی کے لیے پانچوں چراغ جلائے ہیں' جن کی روشنی میں کسی بھی مسافر کے راستے سے بھٹکنے کے امکانات کم کم ہو گئے ہیں۔ شرط فقط یہی ہے کہ مسافر جذبہ سچّا رکھتا ہو اور من میں منزل پر پہنچنے کا صدق موجود ہو۔ یوں شعری مجموعہ دراصل زندگی نامہ ہے۔ زندگی کی حقیقتوں کو اپنے اندر سموئے، پڑھنے والوں پر ان کو منکشف کرتے ہوئے جن کی کھوج میں وہ ڈگر ڈگر ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔ یاسمین حمید کی یہ شعر کہانی دراصل حیات سے ممات تک کے سفر، اس سفر کے اسرار سے پردہ اُٹھاتی ہے۔ اپنے اپنے کام پر آئے ہوئے، مقاصد کی تکمیل میں بھٹکتے، روشوں، راہداریوں اور سیڑھیوں پر ایک دوسرے سے بھڑتے، ٹکراتے، ٹھوکریں کھاتے، جدید انسانوں کے قدیم آسائشوں کی کھوج میں بھٹکتے وجود۔ روحوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے وجود اپنے اپنے جسموں کا بوجھ اُٹھائے انسانوں کی کہانیاں ہیں اس شعری مجموعہ میں۔ محض ایسے دھیان سے اور دھیرج سے پڑھنے کی ضرورت ہے۔

آنکھ کی حد میں چلی آئی ہے پانی کی لکیر
تھک رہے ہیں مگر اس وقت تو چلنا پڑے گا
کون ہے مدِّ مقابل ہمیں معلوم تو ہے
لیکن اب عالمِ حیرت سے نکلنا پڑے گا

ضابطے میں نے سفر کے نہیں توڑے تھے کبھی
یہی اُس سے بھی کئی بار کہا تھا میں نے
مجھ کو بھی آنا تھا اک روز اسی کی زد میں
واقعہ اوروں کی نسبت تو سنا تھا میں نے

اور یہاں شاعرہ نے کس کمال کے ساتھ زندگی کو استعارہ بنا کر اپنے آپ کو زندگی کا نعم البدل بنا لیا ہے۔ اور شعر کے دونوں مصرعوں میں بے ساختگی اس قدر ہے کہ بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

یاسمین حمید کا پہلا شعری مجموعہ ''پسِ آئینہ'' ۱۹۸۸ میں چھپ کر منظرِ عام پر آیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فہمیدہ ریاض' پروین شاکر' ادا جعفری' کشور ناہید' زہرا نگاہ' شاہدہ حسن اور بعض دیگر شاعرات اُردو میں اپنی آوازیں مستحکم کر چکی تھیں' اور یوں کہنا چاہیے کہ وہ لہجہ جسے ہمارے یہاں قدیم سے ''نسائی لہجہ'' سے تشبیہ دے کر علیحدہ خانے میں رکھ دیا جاتا تھا' یہ شاعرات اس خانے کے اوپر سے حاشیہ مٹا کر بطور ''اُردو شاعر'' کے اپنی حیثیت تسلیم کروا چکی تھیں' اور ان کا نام اُردو کی ایسی شاعرات میں شمار کیا جانے لگا تھا جنھوں نے اپنی ''صنفی حیثیت'' سے بڑھ کر معاملاتِ زندگی کو بیان کرنا شروع کر دیا تھا۔ زبان، اسلوب، استعارات و تشبیہات کا ایک منفرد نظام مروّج کر دیا تھا۔ ان شاعرات کا تجربہ سماجی اور معاشرتی طور پر ایک اضافہ لیے ہوئے تھا کہ عورت کی ذات سے جُڑے ہوئے اسرار، جو ابھی زمانے کی آنکھ میں خوابیدہ تھے اور جنھیں تہذیب و ثقافت اور اخلاقیات کی دبیز چادر کے نیچے تھپکی دے کر گہری نیند سُلا دیا گیا تھا، مسرورِ زمانہ کے باعث اس میں حرکت پیدا ہو رہی تھی اور یہ کروٹیں لینے لگے تھے کوئی وقت جاتا تھا کہ ان کو اسرار کو ''چشمِ زمانہ'' پر آشکار ہونا تھا۔ اور بالآخر وہ ہو گئے، کہ نئے زمانے نے جسے ہم بیسویں صدی کی آخری دہائی کے زمانے کے طور پر جانتے ہیں زندگی کے معاملات و مسائل کو یکسر طور پر بدل کر رکھ دیا تھا۔ یاسمین حمید' شعری افق پر جب نمودار ہوئیں تو زمانہ اپنی اس نئی صورت میں انسان کا استقبال کر رہا تھا۔ یوں روایت اور جدّت کے کنارے کنارے چلتی یاسمین حمید نے اُردو کو ان چھبیس برس میں پانچ شعری مجموعے عطا کیے، جن میں ان کی اپنی زندگی بھر کا تجربہ اور زمانے کا حسیاتی و تہذیبی مطالعہ جلوہ نما نظر آتا ہے۔ پسِ آئینہ (۱۹۸۸ء) حصارِ بے در و دیوار (۱۹۹۱ء) آدھا دن اور آدھی رات (۱۹۹۶ء) فنا بھی ایک سراب (۲۰۰۱ء) بے ثمر پیڑوں کی خواہش (۲۰۱۲ء)۔ ان میں زندگی ہمیں نئے طور پر جلوہ گر نظر آتی ہے جس کا اُن چار شعری مجموعوں پر مشتمل کُلیات ''دوسری زندگی'' (۲۰۰۷ء) کے فلیپ پر خالدہ حسین نے اپنے الفاظ میں کچھ اس طور پر تعارف کروایا ہے۔

''یہ جو ایک عام سا تعصب پھیلایا گیا ہے کہ شاعرات کی دُنیا گھر اور نرم و رنگین جذبات تک محدود ہوتی ہے یا پھر بہت ہوا تو کسی نے دریچہ سے اِدھر اُدھر جھانک لیا، یاسمین حمید کی شاعری اس تعصّب کی مکمل نفی کرتی ہے۔ مقامِ مسرت ہے کہ پروین شاکر اور اس کے معاصر گروپ کے بعد ایک ایسی شاعرہ اپنے پورے قد و قامت کے ساتھ منظرِ شعر متمکن ہوئی ہے جس کا تخلیقی تجربہ cosmic ہے۔ اس کے ہاں علم، شعور، آگہی، معلومات نہیں، ایک تجربے کی صورت ظاہر ہوتے ہیں۔ یاسمین حمید کی دُنیا پوری کائنات پر مبنی ہے۔ سورج، چاند ستارے سیّارے، پہاڑ، صحرا اور سب سے بڑھ کر سمندر، پانی، بے انت پانی اس کے مستقل رفقاء کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ مظاہر فطرت اس کے احساسات و جذبات کے صرف پس منظر نہیں بنتے' وہ انہیں اپنا ہم جولی محسوس کرتی ہے، بہ تکلّف استعارہ میں ڈھالنے کی کوشش نہیں کرتی۔ یہ سب آیات اس کے محسوس تجربے ہیں۔ اسی لیے اس کی شاعری میں ایک شگفتہ وسعت ہے، تازہ ہوا جو ہمیں خوشی، دردمندی اور توانائی بخشتی ہے۔ یہ شاعری وجود کی ایک نئی یا شاید گم شُدہ سمت کی تلاش کا سفر ہے۔ ایک عورت کا تجربہ ہونے کے باوجود یہ صنفیت سے مبرّا ہے۔ کیونکہ بنیادی طور پر انسانی زندگی کسی صنفیت کی پابند نہیں۔

خالدہ حسین، فلیپ ''دوسری زندگی'' ''فنا بھی ایک سراب'' میں اُن کی ایک نظم شامل تھی، جس کے کچھ مصرعے یاد آتے ہیں، یوں محسوس ہوتا ہے خوف سے بھری مناجات دہرائی جا رہی ہوں۔

''چراغوں والی!
رات سے ڈر
تو جانتی ہے تیرا کوئی خدا بھی ہے
یہ بانس کا جنگل ہے
اس میں تنکا، تنکے کو بجھائی نہیں دیتا

آنکھیں بنانے والے سے منکر نہ ہو
اندھے کی بددُعا نہ لے

چراغوں والی!
شہر سے ڈر
تو جانتی ہے تیرا کوئی والی بھی ہے۔''

''بے ثمر پیڑوں کی خواہش'' میں یاسمین حمید کی پابند نظمیں، غزلیں اور نثری نظمیں شامل ہیں۔ یوں انھوں نے اُردو شاعری میں پرچلت تین بڑی اصناف کو اظہار کا وسیلہ بنایا ہے اور ایک سے بڑھ کر ایک مصرعہ نکالا ہے۔ ایسی بامعنی اور پُر لطف سطریں پڑھنے کو ملتی ہیں، لگتا ہے گویا ایک ایک مصرعے میں زندگی کی تمام تر جزئیات بیان کر دی گئی ہیں۔ علیحدہ اور منفرد لفظیات کا استعمال کیا ہے کہ شاعری اپنے حقیقی پیرہن میں دکھائی دیتی ہے۔ ''بے ثمر پیڑوں کی خواہش'' معاصر شعری اُفق پر ایک منفرد اور اہم شعری مجموعہ کے طور پر اُبھرا ہے جو ہماری شعری دُنیا میں اپنی جُداگانہ شناخت کے ساتھ باقی رہے گا۔ ان کی نثری نظموں سے کچھ اقتباسات دیکھیے جو ''بے ثمر پیڑوں کی خواہش'' کے حوالے سے میری اس بات کی تائید کریں گے۔

''بعض لوگوں کو اُداس پیدا کیا گیا
اور اُداس رکھا گیا
تا کہ وہ دُنیا کو خوبصورت بنائیں۔''
(''ہمارے منصب میں''۱۶۰)

''ہمارے عہد کی تاریخ
ہمارے دل کی تاریخ سے مختلف ہے
ہم دو زمانوں میں پیدا ہوئے
ہمارے بچوں کی حقارت ہمیں بتائے گی
کہ ہمارا نام کس زمانے میں درج ہوا۔''
(''ہم دو زمانوں میں پیدا ہوئے''۱۶۳)

مجموعی طور پر یاسمین حمید کی شاعری ہمارے عہد کے المیّوں، روز بروز تبدیل ہوتے حالات، واقعات اور نئے زمانے میں تشکیل پذیر نئے انسان کی کہانی ہے، نئے زمانے کا ایسا انسان جو پیدا ہوتے وقت تو قُدرت کی جُملہ خصوصیات اور رنگا رنگی لے کر آتا ہے لیکن زندگی جس دُنیا میں اس کا استقبال کرتی ہے وہ اُس کے بدن سے فطری پیراہن اُتار کر نیا لباس زیب تن کروا دیتا ہے اُسے۔ جو اُسے یکسر نئے انسان کی شناخت عطا کر دیتا ہے۔ یہاں مرد و زن کی کوئی تخصیص نہیں۔ سبھی پر زمانے کے یہ اصول یکساں طور پر لاگو ہوتے ہیں۔ شاید یہ زمانہ ہی پیڑوں کی علامت ہے جو یاسمین حمید کے یہاں بے ثمر رہ گئے ہیں اور جن کی خواہش میں وہ ان کی شاخیں پکڑ کر اُنہیں نگاہوں کے قریب لا کر بغور دیکھتی ہے۔!

☆

تکمیلِ امثال

ہم طالب شہرت ہیں ہمیں ننگ سے کیا کام
بدنام جو ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا
(مصطفیٰ خان شیفتہ)

گلہ کیسا حسینوں سے بھلا نازک ادائی کا
خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے
(سرور عالم راز سرور)

داورِ حشر میرا نامہ اعمال نہ دیکھ
اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں
(ایم ڈی تاثیر)

میں کِس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں
تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے
(مصطفیٰ زیدی)

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے
(مرزا غالب)

قیس جنگل میں اکیلا ہے مجھے جانے دو
خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو
(میاں داد خان سیاح)

غم و غصہ، رنج و اندوہ و حرماں
ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے
(حیدر علی آتش)

مریضِ عشق پہ رحمت خدا کی
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی
(نامعلوم)

آخر گِل اپنی صرفِ میکدہ ہوئی
پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا
(مرزا جواں بخت جہاں دار)

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں
(مولانا الطاف حسین حالی)

نہ جانا کہ دنیا سے جاتا ہے کوئی
بہت دیر کی مہرباں آتے آتے
(داغ دہلوی)

دکھ کے علاقے کی تقسیم

مبین مرزا
(کراچی)

معزز خواتین وحضرات!

ایک قاری کی حیثیت سے یاسمین حمید کی شاعری کا پہلا جو تاثر ہم تک پہنچتا ہے، وہی دراصل اُن کی شاعری کی ماہیت اور معنویت دونوں کی بابت ہمیں رائے قائم کرنے کا موقع فراہم کردیتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اُن کی غزل ہو یا نظم وہ بالعموم احساس کی ایک لہر اور کیفیت کی تہ داری کے ساتھ ہم تک پہنچتی ہے اور معنویت کے ایک سیاق میں اپنا ابلاغ کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یاسمین حمید کی شاعری کا پہلا تاثر ہی یہ قائم ہوتا ہے کہ اُسے تفریحِ طبع کے سامان یا لطافتِ زبان و بیان کے طور پر نہیں پڑھا جاسکتا۔ محمد حسن عسکری کے بقول یہ سارے سنجیدہ اور معنی خیز ادب کا خاصا ہوتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ اس قسم کا ادب و شعر نہ تو جھولنے والی کرسی پر بیٹھ کر پڑھا جاسکتا ہے اور نہ ہی استراحت کے عالم میں نیم خوابیدہ ذہن کے ساتھ۔

ایسا ادب وشعر آپ کو سوچ کے زاویے فراہم کرتا ہے اور آپ کے اندر اضطراب وارتعاش کی لہریں دوڑاتا ہے، حالاں کہ اس میں انقلاب کے کوئی نعرے ہوتے ہیں اور نہ ہی تبدیلی، بغاوت یا مزاحمت کا اعلان۔ ہاں، اس میں احساس کو متغیر کرنے والی وہ کیفیت ضرور ہوتی ہے جو ایذرا پاونڈ کے بقول شاعری کو شعور کی تجلیل کا ہنر بناتی ہے۔ ادب کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم دیکھ سکتے ہیں، اسی ہنر سے کام لینے والے فن کاروں نے ایک طرف انسانی احساس کو مشترک میراث بنانے اور دوسری طرف اپنی تہذیب کے indigenous نشانات کو ابھارنے میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ حرفِ سخن کی اسی اثر آفرینی کی بنا پر اس کے بارے میں از دل خیزد بر دل ریزد والی بات کا ہم کبھی مشاہدہ اور کبھی تجربہ کرتے ہیں۔

موضوعات کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یاسمین حمید کے یہاں دو پہلو غور طلب محسوس ہوتے ہیں۔ اوّل یہ کہ اُن کے یہاں انفرادی جذبے کی پیدا کردہ کیفیات اور اوائلِ عمر کے تجربہ و احساس سے لے کر پختہ عمر کے گمبھیر مشاہدات اور سوالات تک ایک ایسا سفر ہمیں ملتا ہے جس میں فرد کے شعور اور سماجی ضابطے کا ایک پھیلتا ہوا دائرہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ یہ دائرے والی بات بھی توجہ طلب ہے۔ وہ یوں کہ جب کسی فن کار کو ہم اُس کی کلیتِ کار میں دیکھتے ہیں تو اس کے فکری سفر کی معنویت کو بہتر انداز سے اسی وقت سمجھا جاسکتا ہے، جب ہم اس کے یہاں مرکز سے محیط تک پورے تناظر کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ بصورتِ دیگر وہ زاویہ نمایاں ہی نہیں ہوتا جس کے ذریعے فن کار کا integrated vision فوکس ہوکر سامنے آتا ہے، جس کے ذریعے ہم اس کے تخلیقی مزاج اور فن کارانہ رویے کی بابت رائے قائم کرتے ہیں۔

یاسمین حمید کی شاعری کا دوسرا پہلو بھی اہم ہے۔ ان کے یہاں تخلیقی سفر کی ابتدا میں تو بے شک بیانیہ کا اسلوب انفرادی جہت سے مخصوص نظر آتا ہے، لیکن بعد ازاں ہم دیکھتے ہیں کہ یہ اسلوب اُن کے یہاں اجتماعی لہجہ و آہنگ اختیار کرتا چلا گیا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ عمل کسی ادغام کا تاثر پیدا نہیں کرتا۔ ایسا قطعاً محسوس نہیں ہوتا ہے کہ اس عمل میں اُن کے یہاں ایک آواز دوسری کو کاٹتے ہوئے اپنی جگہ بنا رہی ہے، بلکہ یہ ایک آواز کا دوسری میں infusion ہے جو آواز کی base اور لہجے کی قوت بڑھاتا ہوا نظر آتا ہے۔ دیکھیے، وہ جسے حرفِ شعر کہا جاتا ہے، اُس میں بڑی سے بڑی کیفیت اور نہایت دبیز احساس کو سہارنے کی جو سکت ہوتی ہے، وہی تو اُسے معجزہ بناتی ہے، اور ایسا جن عناصر کی بنیاد پر ہوتا ہے، اُن میں ایک اہم شے یہ infusion بھی ہے۔ یہ ایک الگ اور قدرے تفصیل طلب گفتگو کا موضوع ہے، ظاہر ہے جس کا اس مختصر گفتگو میں موقع نہیں، لیکن یہ اُن کی شاعری کے مطالعے کی ایک توجہ طلب جہت ضرور ہے۔ اس کے ذریعے دیکھا جاسکتا ہے کہ یاسمین حمید نے آواز کے infusion کا یہ عمل کس حد تک شعوری سطح پر اختیار کیا اور کس درجے میں اُن کا فطری تخلیقی مزاج یہ پیدا کرتا آیا ہے۔ تاہم یہ طے ہے کہ اس نے ان کے ہنر کو صیقل کیا ہے۔

ہمارے یہاں اس وقت جن موضوعات و مسائل کو تخلیق کاروں نے خصوصیت کے ساتھ مرکزِ نگاہ بنایا ہے، اُن میں ایک اہم موضوع عورت اور اُس کی زندگی بھی ہے۔ ممکن ہے، یہ بات کچھ لوگوں کے لیے ناگوارِ خاطر ہو، لیکن واقعہ یہی ہے کہ اس مسئلے کے باب میں بات کرنے والے اور والیاں بیشتر افراد آپ کو ایک دوسرے کی جگالی کرتے ہوئے محسوس ہوں گے۔ موضوع کی یکسانیت ہی نہیں، بلکہ شخصی احساس اور تخلیقی رویے تک میں ایسی نقالی نظر آتی ہے کہ شدید اکتاہٹ پیدا ہوتی ہے۔ یاسمین حمید نے اس معاملے میں بھی سنبھلے ہوئے مزاج کا اظہار کیا ہے۔ اس لحاظ سے وہ ادا جعفری، زہرا نگاہ اور شبنم شکیل والے قبیلے کی فرد نظر آتی ہیں۔ اُن کے یہاں سوال عورت کی مجبوری، معذوری اور مظلومیت کا نہیں ہے، بلکہ وہ ان سوالوں سے دوچار ہیں جنھیں ورجینیا وولف نے عورت کی صنف کا نجی مسئلہ کہا ہے۔ جس کا تجربہ تو کجا مشاہدہ بھی مرد کی محفوظ دنیا میں بیٹھ کر نہیں کیا جاسکتا۔ چناں چہ یاسمین حمید کے یہاں نسائیت کا فیشن ایبل حوالہ نہیں ملتا، بلکہ وہ حقائق توجہ کا مرکز بنے ہیں جن کا سامنا ایک عورت اپنے معاشرے میں فی العمل اپنی وجودی اور ذہنی ساخت کی بنیاد پر کرتی ہے اور جن سے اس کے شعور و احساس کی دنیا مرتب و متشکل ہوتی ہے۔

خواتین و حضرات، گفتگو کا وقت ختم ہوا چاہتا ہے، سو بس آخری بات۔ وہ یہ کہ یاسمین حمید کے یہاں لہجہ بھی ایک اہمیت رکھتا ہے۔ اب تو خیر اس

طرح کے موضوعات پر ہمارے نقاد بات کرتے ہوئے نظر نہیں آتے، لیکن ایک زمانے میں سیّد عابد علی عابد اور ڈاکٹر سیّد عبداللہ ایسے لوگ شعری مطالعے میں لہجے کی طرف بھی بالاہتمام توجہ دیا کرتے تھے۔ یاسمین حمید کے یہاں بالعموم نرم، دھیما اور شائستہ لہجہ نظر آتا ہے، لیکن خاص بات یہ ہے کہ اس لہجے میں ادق بات، الجھن والے احساس اور کھردرے رویے کو سہارنے کی صلاحیت بھی صاف نظر آتی ہے۔ خواتین وحضرات! یاسمین حید اس عہد کی نمائندہ تخلیق کاروں میں ہیں۔ ان کی شاعری ہم سے سنجیدہ، تفصیلی اور بالاستیعاب مطالعے کی متقاضی ہے۔ اس مختصر وقت میں اُن کی شعری ہنری مندی کے پہلوؤں کی طرف محض اختصار ہی سے اشارہ کیا جاسکتا تھا۔ آخر میں ان کے چند شعر سنیے:

دل کو خاموشی سے بھر سکتے تھے ہم
اس سے زیادہ تو نہیں کر سکتے تھے ہم
کھلی فضا میں اور بہت کچھ ہونا تھا
کھلی فضا میں اور بکھر سکتے تھے ہم
کیسے کرتے دکھ کے علاقے کو تقسیم
ایسا کر سکتے تو سنور سکتے تھے ہم
اور پھر ہم بھی ان سے جینا سیکھ گئے
جن کی خاطر شاید مر سکتے تھے ہم

کن ہاتھوں نے کیسے کیسے پتھر کاٹے
کیسے ان کا بوجھ اٹھایا کون لکھے گا
جنگل میں گم ہوجانے والے رستے پر
کتنی دھوپ تھی، کتنا سایہ، کون لکھے گا

لہجے کے تیکھے تیور پر لفظوں کی من مانی پر
کبھی کبھی ہنسنا پڑتا ہے اپنی کسی کہانی پر
دوسرا رُخ تصویر کا دیکھا اور اُس کو بھی سینت رکھا
ایک نشانی اور بھی رکھ لی میں نے ایک نشانی پر

(یہ مضمون آرٹس کونسل آف پاکستان، کراچی کی گیارہویں عالمی اردو کانفرنس میں پڑھا گیا۔)

☆

جدید طرزِ احساس

''ہم دوزمانوں میں پیدا ہوئے'' یاسمین حمید کے پانچ شعری مجموعوں ''پسِ آئینہ''، ''حصارِ بے در و دیوار''، ''آدھا دن اور آدھی رات''، ''فنا بھی ایک رات'' اور ''بیشتر پیڑوں کی خواہش'' کے علاوہ ادبی رسائل میں شائع ہونے والے تازہ کلام کے انتخاب پر مبنی ہے اس سے پہلے ان کی شاعری کا ایک انتخاب ''دوسری زندگی'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا جو ان کے اولین چار شعری مجموعوں کا انتخاب تھا اور 2007 میں دانیال پبلشرز کراچی نے شائع کیا تھا اور اب 2018 میں اس انتخاب کلام کو ''اکادمی بازیافت'' نے شائع کیا ہے جس کے روح رواں مبین مرزا ہیں۔ دونوں ہی انتخاب حسن سلیقہ کے ساتھ شائع ہوئے، شاعری کا معیار بھی آپ اپنا تعارف ہے گویا سوگرام کی شاعری سوگرام کے کاغذ پر شائع ہوئی ہے اور ایسا شاذ ہی ہوتا ہے۔ عنوان یاسمین حمید کی ایک نثری نظم (ان کا خاصہ تو نہیں) کی آخری سطروں سے لیا گیا ہے۔ نظم کا عنوان بھی یہی ہے۔ ہمارے عہد کی تاریخ / ہماریدل کی تاریخ سے مختلف ہے/ ہم دوزمانوں میں پیدا ہوئے/ ہمارے بچوں کی حقارت ہمیں بتائے گی/ کہ ہمارا نام کس زمانے میں درج ہوا۔ ان چند سطروں ہی سے اندازہ ہوتا ہے کہ یاسمین کی سوچ اور اظہار دونوں ایک بالکل مختلف فکر وخیال رکھتے ہیں۔ وہ اپنی ذات اور زمانے کے سچ کو یکساں طاقت سے بیان کرسکتی ہیں۔ اگرچہ ان کا لہجہ نرم اور دل گیر ہے مگر بقول شمس الرحمٰن فاروقی ''وہ اپنی تانیثی حیثیت کو بے پردہ نہیں کرتیں''۔ ان کی نظم بہ یک وقت فکری، اسلوبیاتی اور معنوی سطح پر نئے پن کی حامل ہے اگرچہ وہ خالصتاً نظم کی شاعرہ نہیں بلکہ نظم اور غزل دونوں میں اظہار کی ایک جیسی قدرت رکھتی ہیں۔ چھوٹی بحر کی ان کی غزلیں تو واقعتاً خدنگ جستہ کے مانند دل میں یوں پیوست ہوتی ہیں کہ خون کی ایک دھار سی جسم سے نکل کر کماں تک پہنچتی ہے۔ یہ شاعری نئی حسیت کے ساتھ مابعد جدیدیت کے امکانات کو روشن تر کرتی ہوئی جدید تر طرزِ احساس سے متعلق رہتی ہے اور جدیدیت کی فکر سے وابستہ لاحاصلی، نامرادی، مایوسی، بیسمتی، تنہائی، موت، شکست، فنا پذیری اور اضمحلال سے قطع تعلق کرکے ہر عہد کی انسانی صورت حال سے تعلق قائم کرتی ہے۔ معروف شاعر اور نقاد رضی مجتبیٰ نے یہ انتخاب پیش کیا ہے۔ مبین مرزا نے ہی ان کا تنقیدی اثاثہ ''جدید ادب کا تناظر'' کے عنوان سے دو جلدوں میں شائع کیا تھا۔ رضی مجتبیٰ کو سحر انصاری نے ہمارے عہد کے اہم اور سنجیدہ نقادوں میں شمار کیا ہے ان کے حق میں یہ سند ہی بہت ہے۔ وہ خود یاسمین حمید کی شاعری کے جمالیاتی اور فکری پہلو سے متاثر ہوئے اور انہوں نے اس جواز کے ساتھ یہ انتخاب پیش کیا ہے کہ ''شاعرانہ اظہار و بیاں کے حوالے سے ٹی ایس ایلیٹ جس جمالیاتی ہیئت آشنائی، گھمبیر پیچیدگی اور گردش احساس کا ذکر کرتا ہے وہ آپ کو اس انتخاب میں جا بجا نظر آئے گی''

نجیب جمال

حقیقتوں کے سامنے

محمد حمید شاہد
(اسلام آباد)

کشور ناہید سے یاسمین حمید کی شاعری کے اس انتخاب پر بات چل نکلی، جو رضی مجتبیٰ نے ''ہم دو زمانوں میں پیدا ہوئے'' کے نام سے کیا تو پہلے اُنہوں نے اس کتاب کے نام کی تعریف کی پھر کہنے لگیں؛ یہ جو ہمارے ادھر اُدھر سانحات ہو رہے ہیں، یہ یاسمین کی شاعری میں بھی اس طرح نظر نہیں آتے جیسے خود اُن کی اپنی شاعری میں جگہ پاتے رہے ہیں۔ یاد رہے کشور ناہید کی شاعری کا مجموعہ ''شیریں سخنی سے پرے'' بھی حال ہی میں آیا ہے اور لگ بھگ اس مجموعے کی ہر نظم ایسے ہی سانحات کا شکار ہونے والوں میں سے کسی نہ کسی کی طرف توجہ کھینچ لے جاتی ہے جس کی خبر پڑھ سن کر ہمارا کلیجہ ہر بار کٹتا رہا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یہ بنیادی سوال ہے جو کشور کی نظموں سے پھوٹتا ہے اور ایسا نہیں ہونا چاہیے یہ وہ خواہش ہے جو کشور کی نظمیں پڑھنے والوں کے دل کی زمین میں ایک مقصد کا بیج بو دیتی ہیں، کہہ لیجئے ان کی نظمیں اپنے زمانے کی عکاسی کرتی ہیں اور فرد اور اس کا وجود ثانوی ہو جاتا ہے اتنا ثانوی کہ کہیں کہیں تو وہ غالب کے لفظوں میں یوں معدوم ہوتا ہے؛ ''ہر چند کہیں کہ 'ہے' نہیں ہے''۔ جی، وہ اپنے وجود میں کم اور سماجی وجود کے اندر زیادہ جیتی ہیں۔ کم از کم ان کی نظموں کی حد تک تو ایسا ہی لگتا ہے تاہم غزل میں وہ اپنے سوئے پڑے وجود کو جھاڑ پھٹک کر جگا لیتی ہیں اور اس صنف کی اپنی تہذیب سے جڑنے کے جتن کرتی نظر آتی ہیں کہ اس صنف میں تخلیق کار کا اپنا وجود جب تک مرکز میں نہ رہے تغزل کا جادو نہیں جاگتا۔ یاسمین حمید کے ہاں ایسا نہیں ہوا، وہ نظم ہو یا غزل اپنے وجود کی سرشت پر قائم رہی ہیں۔

یہاں میں کشور ناہید اور یاسمین حمید کی شاعری کا تقابل یا موازانہ نہیں کر رہا، ہوا یوں کہ دونوں کتابیں لگ بھگ ایک ساتھ ملیں اور اوپر تلے پڑھ ڈالیں تو شاعروں کے ہاں تخلیقی واردات کے مختلف ہونے سے شاعری کا مزاج کیسے مختلف ہو جاتا ہے اسے سمجھنے نے مجھے ایسا کہنے پر اُکسایا ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ یاسمین حمید کے ہاں ایسا نہیں۔ مجھے یوں لگتا ہے وہ اس گوں کی تخلیق کار ہیں ہی نہیں جو اپنے وجود سے باہر بکھرے پڑے موضوعات کے حرزِ جاں بنا پاتے ہیں۔ وہ تو اس زندگی سے زیادہ قریب ہیں۔۔۔ نہیں مجھے جملہ درست کرنے دیجئے کہ یہ قربت والا لفظ یہاں چھوٹا پڑ رہا ہے واقعہ یہ کہ وہ اس زندگی کے حسی ریشوں کے کہیں اندر سے دھڑکنیں کشید کرتی ہیں جس میں انہیں اپنا پورا وجود اپنی آنکھوں کی طرح جاگتا محسوس ہوتا ہے اور جہاں انہیں اپنے ہی لہجے میں بولنا ہوتا ہے، اپنے آپ سے، وہ اپنے وجود میں سر بسر اطاعت پر مائل ہو چکے شخص کی طرح وجودی منکشف نہ سہی مگر اپنے ہجر کی تفسیر ضرور ہو گئی ہیں؛ اپنے دھیمے سروں میں بہتی شفاف ندی کے ایسے پانیوں کی طرح جو بہ ظاہر پہاڑوں سے اُتر کر ہموار زمینوں پر خامشی سے بہہ رہے ہوتے ہیں مگر اپنی مسافت کے مفسر بھی ہوتے ہیں یا پھر ایک بے کراں صحرا میں اُڑتی پھول کی اُس پتی کی طرح جسے، کہنے کو موسموں اور فاصلوں کا ڈر نہیں ہوتا، مگر جو اپنے اُچٹنے، اُکھڑنے، بچھڑنے، بھٹکنے اور اپنی موت کو چھو کر پلٹنے کا استعارہ ہو جاتی ہے۔

میں نے یاسمین کے تخلیقی وجود کو آنکنے ماپنے کے لیے بار بار وجود کا لفظ استعمال کیا ہے تو اس سے گماں نہیں باندھنا چاہیے کہ میں ان کی شاعری کو فلسفہ وجودیت کی عطا سمجھنے لگا ہوں۔ میں نے بہت توجہ سے انہیں پڑھا ہے، ان کی نظمیں اور غزلیں اور ہاں نثمیں بھی اور کہیں بھی مجھے اوپر ہی اوپر تیرنے والا Guilt یا جرم کا احساس نظر نہیں آیا ہے۔ نہ کہیں بیگانگی اور مغائرت یعنی ایلی نیشن (Alienation) نہ تصورِ موت کی جکڑن۔ اکتاہٹ، گھٹن اور اُبکائیاں جو وجودیوں کے ہاں سیلن کی طرح سطروں میں اندر تک گھس کر ایک گہرے ہمک اور عجب طرح کی باس کو باہر اُچھالتی ہیں۔ یاسمین نے اس کچھ کو اپنے القا ہونے والی حیرت سے بدل لیا ہے اور ان پر ایک بچی کی طرح سوالات کی تہیں بچھاتی چلی گئی ہیں۔ یہ حیرتیں اور استفسارات ہمیں ایک ہی وقت میں سنائی اور دکھائی دیتے ہیں اور حسیات پر پھوار کی طرح برستے بھی ہیں۔ اپنے وجود پر القا ہونے والی آوازوں اور تصویریں سے ہی اس شاعرہ کے ہاں شعری جمالیات کے خال وخد بنتے ہیں۔

تخلیقی جمالیات اور تصویری معیاتی تشکیل میں یاسمین حمید نے اپنے خوابوں سے بھی خوب کام لیا ہے؛ کئی نظموں اور نثموں میں اور غزلوں میں بھی۔ جہاں بھی خواب سے معاملہ ہوا ہے وہ محض خواب کا بیان نہیں رہا ہے۔ مثلاً ''فنا بھی ایک سراب'' کی ایک غزل کا یہ شعر دیکھیے:

ابھی نقش کوئی بنا ہی تھا مری آنکھ میں
کہ اُلجھ گیا مرے خواب سے مرا خواب گر

یا پھر ''آدھا دن آدھی رات'' کی ایک غزل کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

تری حقیقتوں کے سامنے مری بساط کیا
صدی کے تیز رنگ! میں تو نقش خواب بھی نہیں

اپنی نظموں میں بیشتر اوقات وہ اپنے مجموعی تخلیقی رویے کی پیروی کرتی ضرور ہیں تاہم ایسے مقامات بھی قدرے زیادہ دیکھے جا سکتے ہیں کہ وہ اپنے ذاتی وجود سے باہر نکل سماجی وجود سے جڑ جاتی ہیں مثلاً ''فنا بھی ایک سراب'' کی ایک نثم کی یہ سطریں دیکھیے:

''چراغوں والی!
خواب سے ڈر
تو جانتی ہے تیرا کوئی موسم بھی ہے
درختوں کی چھاؤں آدھی ہو جائے
تو روپ جھڑ جاتے ہیں

اورسوچنے والی کی قیمت پوری نہیں لگتی''

(چراغوں والی افنا بھی ایک سراب)

جہاں جہاں ایسے مقامات آئے ہیں وہاں وہاں اُن کے تخلیقی وجود کے اندر سے نسائی وجود نے الگ سے چھب دِکھائی ہے۔ تاہم مجموعی طور پر نسائی وجود یاسمین حمید کی شاعری میں اس عورت کے وجود سے الگ دِکھنے لگتا ہے جو فیمنسٹ تخلیق کاروں کے ہاں بھرپور توجہ پاتا رہا ہے۔ مثلاً'' آدھا دن آدھی رات'' کی غزل کا یہ شعر نسائی شعور کی تظہیر ہو کر گرے پڑے تمام طبقوں کی تصویر ہو گیا ہے جن کے لیے زندگی مسلسل مٹنے اور مٹتے چلے جانے سے عبارت ہے:

سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ مجھ کو میرا خالق
بنانا چاہتا ہے یا مٹانا چاہتا ہے

یاسمین حمید کے ہاں عورت بھی انہیں طبقات میں سے ایک جن کا وجود قدرت کے اس کارخانے کے بیک یارڈ میں پڑا گل سڑ رہا ہے۔ تام طبقاتی اور نسائی شعور مجموعی طور پر داخلی عنصر میں مقلب ہو کر فن میں عاکس کی بجائے غیر عاکس ہو کر ظاہر ہوا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاعری سے سطح پر معاملہ کہ آپ سر بسر شاعر رہیں اور سماجی فرد آپ کو پچھاڑے نہیں، ایک ایسی زبان کا تقاضا کرتا ہے جو چونکانے کی بجائے پڑھنے والے پر تصویر کی طرح کھلے، اُس کے من کو رنگوں کی طرح اُلجھائے اور اس کے دِھیان کو خاموشیوں کی طرح اپنے گھاؤں میں سمیٹ لے اور لطف کی بات یہ ہے کہ یاسمین حمید کے ہاں ایسی زبان متشکل ہوئی ہے۔ جی، کوئی نیا یا اجنبی لفظ استعمال کیے بغیر، کوئی نئی ترکیب ڈھالے بغیر ایسی زبان جس میں جوگی کے بھیگے بدن کی باس سما سکتی ہے، وہ داستانیں جاگ سکتی ہیں جنہیں کبھی لکھا یا سنا سنایا گیا یا پھر لکھا اور سنا سنایا جا سکتا ہے، وہ اسی زبان میں لمحوں کی بندش سے آزاد گزر چکے وقت کو مرتب کرتی ہیں اور گزرتے وقت کو بھی۔

''جو دور سے دکھائی دیا
تہذیب نے اسکے چہرے پر حسین نقش ونگار بنائے
اور قریب آنے والے کے منہ پر تھوکا
اُسے گالی دِی
اور اپنی جھولی میں آنسو بھر لیے''

(انسان بدل گیا کیا ابے ثمر پیڑوں کی خواہش)

اسی ثُم میں آنے والے وقت کو بھی دیکھا جا سکتا۔ جا چکے وقت کی طرح آ چکا اور آنے والا وقت جن سرابی راستوں کی وسعتوں میں دھول اُڑا رہا ہے وہاں یہ بہت کم کم بدلتا ہے۔ یاسمین حمید ہی کے لفظوں میں:

''ہزار سال کے فاصلے پر بننے والی قبریں ایک جیسی ہیں۔''

یاسمین حمید نے اپنے ایک مضمون میں اس نہ بدلنے والے وقت کے بارے میں کہہ رکھا ہے:

''وقتِ موجود میں جدید اور قدیم کے معنی نہیں ہوتے۔۔۔ تخلیق کار جس عہد میں اپنا بساط بھر سرمایہ جمع کرتا ہے، اُسی عہد کو جانتا ہے اور محسوس کرتا ہے۔ محسوس کرنے کے عمل کی پرتوں کا، اس کی پیچیدگیوں کا شمار مشکل ہے۔

احساس اور فکر کے دائرے میں، حالات کی کتنی صورتیں، کن سمتوں سے داخل ہوتی رہتی ہیں، ان کو حساب میں نہیں لایا جا سکتا۔ تخلیقی سطح پر انہیں کس طرح کس حد تک اظہار کی شکل دی جا سکتی ہے، اُسی کا انحصار تخلیق کار پر ہے۔''

(چند باتیں ابے ثمر پیڑوں کی خواہش)

سرابی راستوں پر دھول اڑاتے وقت کا جو پارچہ یاسمین حمید کی بساط کا سرمایہ ہوا ہے وہ اگرچہ یہی نہ بدلنے والا وقت ہے مگر اس کو ایک ایسے آئنے کی طرح ماضی اور حال کے وسط میں نصب کر لیا گیا جس میں وقت کی دونوں طرفیں جھلک دے رہی ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ آئنے میں سب کچھ صاف دکھائی دے رہا ہے کہ دونوں طرف کا وقت اس برف کی طرح ہے جو روئی کے گالوں کی صورت اُڑتے ہوئے اُترتا ہے یا اُس قدرے کم دبیز دھند کی طرح جو بہت کچھ چھپا کر بھی بہت کچھ ظاہر کر دیا کرتی ہے۔ اسی منہاج سے اس شاعرہ کے ہاں در آنے والی پیچیدگیاں، الجھنیں اور فکری اور حسی دائرے بھی نظموں میں مسطر ہو جاتے ہیں۔ یہیں وضاحت کر دوں کہ اس شاعرہ کے ہاں دَر آنے والا ابہام زبان کے مشکل برتاوے کا زائیدہ نہیں ہے اور نہ ہی یہ شعری تجربے میں برتی گئی فکریات کا نظامِ فہم سے باہر رہ جانے یا قصیداً باہر رکھ کر ایک دھند بنا لینے کا شاخسانہ ہے، یہ تو احساس کی لطیف سطوح سے جنم لیتا ہے، ہرے بھرے تخیل سے پھوٹتا اور جمالیاتی سطح پر متن کا حصہ ہو جاتا ہے۔ کچھ اور کہنے سے پہلے، ''فنا بھی ایک سراب'' سے ایک نظم کی کچھ سطریں، یہاں وہاں سے، مقتبس کرتا ہوں:

''میں نے اپنے آپ کو دیکھا۔۔۔
تھوڑی دیر کو سایہ دیکھا
ورق الٹ کر پڑھنا چاہا تو ہاتھوں پر
بادل جیسی دھند کی گیلی چادر دیکھی
اپنی آنکھوں کو پاتال کے اندر دیکھا
بھید بھری خاموشی دیکھی۔۔۔
سانس اکھڑتے دیکھی اپنی
اور زبان میں لکنت دیکھی
اپنے جسم کو مرتے دیکھا
دور کہیں چوپال سے باہر
پچھلی رَت کے
بوڑھے پیڑ کا
پتا پتا جھڑتے دیکھا
تم نے خواب میں کس کو دیکھا؟''

(میں نے اپنے آپ کو دیکھا فنا بھی ایک سراب)

باقی صفحہ ۳۶ پر ملاحظہ کیجیے

"گمنام لوگوں کی باتیں"

(محترمہ یاسمین حمید کے نظمیہ کلام کی گل پاشی)

ارفعہ افتخار (اسلام آباد)

ایک اور دن گزر گیا

سانس کا دھواں تمام کھڑکیوں پہ جم گیا
پھر ایک شہر گم ہوا
تماشا گاہِ روز و شب میں صرف میں ہوں
اور سنگ وحشت کا حصار ہے
لہولہان واہموں کی آہٹیں ہیں
چھپکلی سی رینگتی
سخن طراز عورتوں کا غول سرسرا رہا ہے
میری سمت بڑھ رہا ہے۔۔۔
درد کی تپش سے دل کے روزنوں پہ لہلہاتی شاخِ گل جھلس گئی
کسی کی معترض نگاہ اعتبار کی حدوں پہ رک گئی

اور آج بھی یہی ہوا کہ
عہد نامۂ وفا کی سطرِ خاص
کاغذی تعلقات کے حساب میں لکھی گئی
کتابِ دل کا ایک اک ورق گواہ ہے
کتاب بے پڑھی ہی رہ گئی
صریرِ خامۂ سیاہ نے صدا بلند کی
تو سوچتی ساعتوں کا دائرہ سمٹ گیا
کسی کا نام دوسرے کے نام سے جدا ہوا
اور انتظار نے دلوں کی سرزمیں پہ اک لکیر کھینچ دی
ہواؤں نے سخن کیا
تو گھر کے سارے لوگ روشنی بجھا کے سو گئے
اک اور دن گزر گیا!

مجھے جاگنا پڑے گا

مجھے جاگنا پڑے گا
تو میں گھر کے دیوار و در پر
مرتّب کروں گی کتابیں

مجھے سوچنا جب پڑے گا
تو میں موت سے زندگی کو
ملاتے ہوئے دائرے پر چلوں گی

مجھے دیکھنا جب پڑے گا
تو میں نوکِ نشتر پر

ہاتھوں پہ تازہ لکیریں بنا کر
انہیں اپنی آنکھوں کی
تحویل میں چھوڑ دوں گی

مجھے بولنا جب پڑے گا
تو میں اچھے لفظوں میں
گم نام لوگوں کی باتیں کروں گی

مجھے ہارنا جب پڑے گا
تو میں راکھ کا نقشہ
بناؤں گی تلوؤں پہ
اور جانے دوں گی اُسے
جس کو جانے کی جلدی ہوئی

کتبہ کون لکھے گا

ابھی پہلا ستارہ ڈھونڈتے ہو تم
ابھی تو روشنی آنکھوں تلک پہنچی نہیں ہے
جب شکست وریخت کی منزل سے آگے
سینکڑوں نوری برس تسخیر ہو جائیں گے
تب تم آسماں کی آخری حد پر
زمیں زادوں کی باتیں سن رہے ہو گے
خلا اندر خلا سیارہ گاہیں اپنی کم آباد دنیا کو پکاریں گی
زمیں بھی آسماد ستک پہ چونکے گی
مگر پھر کون بولے گا
گلستاں، رنگ، خوشبو

چہچہاتے پیڑ اور چنگھاڑتے جنگل
اکیلے کیا کریں گے
شہروں شہروں گھومتے دن رات
کس کو تھپکیاں دے کر سلائیں گے، جگائیں گے
کسی ویران قریے میں
الاؤ سینکتے ہاتھوں کی بے مصرف لکیریں
اپنے ہونے کا گلہ کس سے کریں گی
پتھروں کی، برف کی جانب پلٹتی زندگی کو
کون پُرسا دینے آئے گا
خلا اندر خلا گنجان سیاروں کے سارے خواب
ہجر و وصل کی لذت کے افسانوں پہ ہنستے خواب
اپنی آخری گردش مکمل کر کے
بے تعبیر رہ جائیں گے تو اس سانحے پر
کون روئے گا
زمیں زادوں کا کتبہ کون لکھے گا!

کہیں اک شہر ہے

کہیں اک شہر ہے
جو میری آنکھوں میں سما سکتا نہیں
اس شہر کی گلیاں
ڈھلکتے آنسوؤں سی
جسم و جاں پر جال پھیلائے ہوئے
جانے کدھر کو جا رہی ہیں
اس کے گھر آنگن
دریچے، در
مری بینائی پر کب کھل سکے ہیں
اس کے سبزہ زار

اپنے رنگ کب مجھ کو دکھاتے ہیں
کبھی اس کے خس و خاشاک میں
اڑتی ہوئی سرگوشیاں
گیلی ہوا میں جذب ہو کر
دُور افتادہ زمینوں پر بسیرا کرنے جاتی ہیں
تو مجھ کو دھیان آتا ہے
کہ میری دسترس میں کچھ نہیں ہے!

Mosaic

ایک سمندر جس کے ساحل ریگستانی
ایک سمندر جس کا انت ہے کالا جنگل
ایک سمندر جس کے سارے سبز کنارے
ایک سمندر جس کی حد پر نیلا پربت
ایک سمندر جس کے پار افق کی لالی
ایک سمندر جس کی ہر اک سمت سوالی
ایک سمندر جس کے چاروں اور سمندر
ایک سمندر جس میں ایک سمندر گم ہے
ایک سمندر جس کی تہہ کے اندر تم ہو
ایک سمندر جس کی موج پہ میرا گھر ہے

میں شاعر ہوں

میں شاعر ہوں
مری تہذیب میں ڈھلتے لہو کی تیز سرخی سے
تمہارے نقش تیکھے ہو گئے ہیں
تم مری ساری ریاضت چھین لیتے ہو
جو دکھ پل کر جواں ہوتا ہے
اس کو تم سے نسبت ہے
جسے میں خود بھلا دیتی ہوں
وہ دکھ دوسرا ہے
وہ مری اپنی کہانی ہے
مرے ہونے نہ ہونے کا تو قصہ

تم سے ملتا ہے
تمہارے دل سے ملتا ہے

میں شاعر ہوں
مری تہذیب میں بھیگتے ہوئے موسم کی نرمی ہے
میں جب پتھر کو چھوتی ہوں
وہ بارش میں بدل جاتا ہے
تم پتھر نہیں ہو
اور تمہیں بارش سے بھی رغبت نہیں ہے
تم مسافر ہو
تمہارے رات اور دن میری آنکھوں سے الجھتے ہیں
تعاقب کے پرانے کھیل میں
لفظوں کی گنجائش نہیں ہے
اور میں شاعر ہوں
مرے ہونے نہ ہونے کا بھی قصہ
تم سے ملتا ہے
تمہارے دل سے ملتا ہے

○

آخری معجزہ

بہت بھیگے ہوئے دیوار و در ہیں
اور آنسو تھم گئے ہیں
بے حس و حرکت کوئی تصویر
میرے سامنے
اک چوکھٹے میں دم بہ خود
مجھ کو بلکتا دیکھنے کے بعد جیسے جاگ اٹھی ہے
ہوس کا رقص کرتا
ایک بدہیئت پجاری
دیوقامت آئنے کی قید سے باہر نکلنا چاہتا ہے
چوکھٹے میں جاگتی تصویر کا اک ہاتھ

میرے سر پہ ہے
مریمؑ کا بیٹا
معجزہ دکھلا رہا ہے۔۔۔

خواب میں سہمی ہوئی
مٹی کی مورت
خواب کی تعبیر لکھنا چاہتی ہے!

کبھی جب۔۔۔

کبھی جب دل کی حد میں دو مخالف راستوں کا میل ہو جائے
تو کوسوں دور کا منظر بھی آنکھیں دیکھ سکتی ہیں
دھندلکے کا طلسمی راستہ
اسرار کی زد سے نکل جائے
تو ہر شے خواب سی، جاگی ہوئی معلوم ہوتی ہے
اچانک دن نکلتا ہے
اچانک رات ہوتی ہے

○

آزاد کردو سب پرندے

چھوڑ دو
در کھول دو
آزاد کردو سب پرندے
ان پرندوں میں تمہارا جسم ہے
ان میں تمہارا دل دھڑکتا ہے
تمہاری روح بے کل ہے کہیں ان میں
انہیں آزاد کردو

رات ہوتے ہی
پروں کی پھڑ پھڑاہٹ میں

وہ ساری داستانیں جاگ اٹھتی ہیں
جنہیں تم نے بھی سوچا ہے
جنہیں تم نے سنا ہے
تم نے لکھا ہے
انہیں آزاد کردو
گھپ اندھیرے سے نمی رسنے لگی ہے
قیدیوں کی بند آنکھیں
نیند میں بھی جاگتی ہیں
کس قدر کہرام ہے ان میں
اب ان کے زرد چہروں میں سنہرا رنگ بھردو
سرد جسموں کو نیا ملبوس پہنا دو
انہیں آزاد کردو
خون کی یہ آخری گردش ہے
اس کے بعد دہشت کا سفر ہوگا
کہ برفیلی ہوائیں زندگی کے روزنوں کو بند کردیں گی
انہیں آزاد کردو

اعتراف

سورج ڈھلنے کی ساعت میں
ہم نے دیا جلایا کب تھا
اتنا بوجھ اٹھایا کب تھا
وقت کی دھندلی دیواروں پر
پورا نقش بنایا کب تھا
خوف کے جنگل کب کاٹے تھے
پل پل بڑھتی خاموشی کے
دل میں تیر چلایا کب تھا
انہونے خوابوں کی گٹھڑی کب کھولی تھی
سورج چاند ستارے مٹھی میں بھرنے کا

تجھ کو راز بتایا کب تھا
ہم تیری خاطر زندہ ہیں
تجھ کو یاد دلایا کب تھا
مٹی، تیرے غم کو ہم نے
اپنے دل سے لگایا کب تھا

تمہارے پھول تازہ ہیں

تمہارے پھول تازہ ہیں
مری سب انگلیوں پر اُگ رہے ہیں
اور یہ شاخیں
یہ میری انگلیاں،
کیسی ہری ہیں
ان کی شریانوں میں بہتا رنگ
پھولوں کے لبوں سے بہہ رہا ہے
قطرہ قطرہ
ایک بے موسم کہانی کہہ رہا ہے!

وقت دراصل یہاں سے شروع ہوگا

(نثری نظم)

وقت دراصل یہاں سے شروع ہوگا
یہاں خواب کی تعبیر میں، خواہش کا مرجانا طے پائے گا
اور زندگی کی ڈھلان پر پھسلتے ہوئے پتھروں
کو روکنے والی آواز سہم جائے گی

وقت دراصل یہاں سے شروع ہوگا
گلے سڑے وجود سے ایک ایسی وحدت جنم لے گی
جس میں ناموں کے پرتو سمٹ جائیں گے
اچھا برا چھپ جائے گا
نیکی مرتب ہونے کی کوشش کرے گی

وقت دراصل یہاں سے شروع ہوگا
یہاں سے آسودگی اور دکھ کی گھڑیاں مکمل ہو جائیں گی
جزا اور سزا کی بات کثیف ہو جائے گی
صرف فاصلہ رہ جائے گا
واضح اور شفاف

وقت دراصل یہاں سے شروع ہوگا
چہروں کی لکیروں میں وقت تعمیر کرے گا
ایک اونچی عمارت
جو زمین کو آسمان سے ملائے گی
اور میں آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھتے
اس کی آخری منزل پر پہنچ کر
غائب ہو جاؤں گی

○

وصیت

(نثری نظم)

وہ پچھلی صف سے بھاگتی ہوئی
اگلی صف تک پہنچی --
پہنچ تو گئی
مگر سانس کو برقرار نہ رکھ سکی
اور ڈگمگائی
وہ کنارے پہ چلتے چلتے
پانی پہ دوڑنے لگی
پار تو اتر آئی
مگر پیروں کو خشک نہ رکھ سکی
اور ایک پاؤں تو دریا ہی میں رہ گیا
وہ خاردار تار سے بچتی بچاتی
اپنے گھر پہنچی
مگر جسم کا لہو کہیں پیچھے گرا آئی

پورا انسان کبھی اپنے آپ سے مطمئن نہیں ہوتا

دم توڑنے سے پہلے اس نے بچوں کو نصیحت کی
کہ وہ اسکی پوری آپ بیتی نہ پڑھیں
سچ صرف وہی ہے
جو انھوں نے محسوس کیا
باقی سب گرد ہے
اور ہوا

○

''حسن لاج''

شہناز خانم عابدی (کینیڈا)

صدف ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی۔فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی مجبوراً صدف نے فون اٹھایا۔

''کومل،تمہارا فون ہے''اس نے اپنی بہو کو آواز لگائی اور فون کو ہولڈ پر رکھ کر دوبارہ اخبار پڑھنے لگی۔

کومل آئی،فون لے کر چلی گئی۔اس کے ساتھ ہی حسان بھی آیا اور بولا:

''امّی! آپ فون کیوں اٹھاتی ہیں جس کا فون ہوگا اٹھالے گا،اگر آپ کا فون ہوگا تو آپ کو دے دیا جائے گا۔''

صدف نے اخبار سے نظریں ہٹائیں، بیٹے کو دیکھا اُس کے سامنے وہ ننھا سا حسان آ گیا جو اس کو بیٹھے دیکھ کر گود میں سوار ہو جاتا تھا اور دونوں ہاتھ اس کے گرد لپیٹ لیتا تھا اور کہتا تھا''مجھے آپ کی گود میں لیٹنا ہے''یا پھر اس کی قمیض پکڑے اس کے ساتھ ساتھ لگا رہتا تھا اور ایسی بہت سی ننھی منی محبتیں اس کی آنکھوں کے سامنے جھلملا گئیں۔اس کے چہرے پر غم کے سائے پھیل گئے۔

''اس سے پہلے تو حسان نے کبھی اس لہجے میں بات نہیں کی۔''اس نے سوچا۔

''ٹھیک ہے۔آئندہ خیال رکھوں گی۔''یہ کہہ کر وہ دوبارہ بظاہر اخبار پڑھنے لگی۔نظریں اخبار پر تھیں لیکن اسے تو اخبار کے حروف بھی صاف نظر نہیں آ رہے تھے۔

حسان نے محسوس کر لیا کہ اس کا اس طرح بات کرنا ماں کو پسند نہیں آیا۔وہ ماں کے پاس صوفے پر بیٹھ گیا صدف کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر بولا۔

''امّی! میں آپ سے اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اگر آپ اس طرح فون اٹھائیں گی،اور اگر گر پڑیں گی تو کیا ہوگا۔۔۔؟ آپ کمزور ہو گئی ہیں،آپ کے لیے چلنا مشکل ہوتا ہے۔فون اٹھانا،گیٹ پر جانا یہ سب کام کومل کے ہیں اب آپ ان تمام ذمّہ داریوں سے سبکدوش ہو جائیے اور آرام کیجیے۔''

''امّی آپ اتنی اونچی آواز سے ٹی وی چلا رہی ہیں،آپ کو پتہ ہے بچوں کے امتحانات ہیں،وہ پڑھائی کر رہے ہیں۔''

حسان نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی کی آواز دھیمی کر دی۔صدف نے لاؤنج میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھنا چھوڑ دیا۔وہ اپنے کمرے میں ہی ٹی وی دیکھتی۔

ایک دن صدف نے محسوس کیا کہ اس کی طبیعت بہتر ہے تو اس نے کچّے گوشت کی بریانی بنائی،سب کو بہت پسند تھی،خاص طور پر حسان کو۔۔۔وہ سوچ رہی تھی حسان بہت خوش ہوگا۔۔۔مگر الٹا ہوا۔

''امّی! اب آپ پکوان کا خیال چھوڑ دیں آپ کے بس کی بات نہیں رہی۔''حسان کے منہ سے یہ الفاظ سن کر اسے بڑی حیرت ہوئی اور دکھ بھی ہوا۔بریانی تو بہت مزیدار بنی تھی۔کومل کو بھی چکھائی تھی۔وہ بھی بہت تعریف کر رہی تھی کہہ رہی تھی''امّی بہت زبردست بنی ہے۔''

''امّی یہ کمرہ آپ کے لیے بہت بڑا ہے آپ زینا کے کمرے میں شفٹ ہو جائیے زینا یہاں آ جائے گی۔''حسان نے ایک نیا حکم صادر کر دیا۔

''اس کمرے اور اس کمرے کی ایک ایک چیز سے میری یادیں جڑی ہوئی ہیں۔میں یہ کمرہ نہیں چھوڑوں گی۔''صدف نے بمشکل کہا۔

''امّی! پلیز اب آپ ان دقیانوسی سوچوں سے باہر نکلیں۔کل میں آفس سے آدمی بھیجوں گا وہ آپ کا سامان شفٹ کر دے گا۔''حسان کہہ کر چلا گیا۔

صدف جانتی تھی حسان کے دماغ میں آ گئی ہے اب وہ یہ کمرہ زینا کو دے کر ہی مانے گا۔

صدف گھر کے ماحول میں اپنے لیے یہ تبدیلی دیکھ کر حیران تھی۔ایسا لگتا تھا وہ ایک بے جان روبوٹ ہے۔ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی کومل اور حسان امّی، امّی کہتے نہ تھکتے تھے۔ہر بات میں پوچھنا،ہر کام میں مشورہ۔۔۔بچے بھی ہر کام دادی سے ہی کرواتے۔ماں سے زیادہ دادی کو بچوں کی ہر چیز کا پتہ تھا۔ہر طرف محبتیں ہی محبتیں۔۔۔روشنیاں ہی روشنیاں بکھری ہوئی تھیں۔

اور اب تو جیسے سب کچھ بدل گیا تھا کومل آفس سے آنے کے بعد زیادہ تر اپنے کمرے میں ہوتی یا فون کرتی نظر آتی۔بچے بھی مصروف رہتے۔بچوں کا اپنے نانا،نانی کے گھر آنا جانا زیادہ ہو گیا تھا۔اکثر چھٹی کے دن یا تو نانا نانی کے گھر گزارتے یا پھر سیر و تفریح میں۔صدف پورا پورا دن اکیلی گھر میں پڑی رہتی۔اس سے چلنے کے لیے اخلاقاً بھی نہیں کہا جاتا۔

اس دن وہ اپنے کمرے میں بیٹھی ٹالسٹائی کا ناول''اینا کرینا''پڑھ رہی تھی سائم اور افروز آ گئے،صدف نے کتاب ایک طرف رکھ دی اور بولی:

''آؤ بیٹا! کیسے ہو تم لوگ؟''

''امّی آپ اکیلی بیٹھی ہیں،اوپر آ جاتیں ہمارے پاس''افروز بولی:

''افروز،تم امّی کو کیوں تنگ کر رہی ہو۔انہیں سیڑھیاں چڑھنے میں مشکل ہوگی۔تم خود امّی کے پاس آ جایا کرو۔''سائم ایک دم بول پڑا۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ سائم بھی نہیں چاہتا کہ میں اس کے پاس آؤں۔''صدف کے دماغ میں ایک دھچکا سا لگا مگر دوسرے لمحے ہی اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

''تم لوگ بیٹھو،میں چائے بناتی ہوں پھر سب مل کر پئیں گے۔''صدف نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''امّی! آپ بیٹھیں چائے میں بناتی ہوں۔''افروز نے صدف کو ہاتھ سے روکتے ہوئے کہا۔

افروز نے چائے بنائی،تینوں نے مل کر چائے پی گپ شپ کی۔۔۔پھر افروز اور سائم اوپر چلے گئے۔وہ دوبارہ کتاب پڑھنے لگی مگر اس کا دل نہیں لگا۔اس نے کتاب بند کر دی اور گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھ گئی۔وقت اسے ماضی کی طرف لے گیا۔

صدف اسلام آباد سے اپنی دوست رابعہ کی شادی میں آئی تھی۔حسن

نے اُسے وہیں دیکھا تھا۔

''امّی! بلیک اور اورنج کلر کا جولڑ کی سوٹ پہنے تھی، رابعہ کی شادی والے دن اور زیادہ تر رابعہ کی امّی کے ساتھ ساتھ تھی کیا آپ اسے جانتی ہیں۔'' حسن نے ماں سے پوچھا۔

''اچھا تو آپ لڑکیوں کو اس قدر غور سے دیکھتے ہیں۔'' حسن کے بھائی حاشر نے جملہ کسا۔

''لڑکیوں کو نہیں، صرف ایک لڑکی کو ہی دیکھا ہے۔'' حسن بولا

''نہیں میں نہیں جانتی۔ شاید رابعہ کی دوست ہے ''صدف'' نام ہے اس کا۔ حسن کی امّی نے جواب دیا۔

''امّی! آپ اس کے متعلق معلوم کیجیے۔ میں شادی کروں گا تو اسی سے ورنہ نہیں کروں گا۔'' حسن نے نہایت جذباتی انداز میں کہا۔

''زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ اس لڑکی کو جانتے ہیں اور نہ اس کے خاندان سے واقف ہیں۔ فرض کرو وہ شادی شدہ ہے، یا اس کی منگنی ہوگئی ہے، یا نکاح ہو چکا ہے وغیرہ وغیرہ۔۔۔'' ماں نے ہلکا سا دھمکایا۔

اور پھر حسن اور صدف کی شادی ہوگئی۔ حسن نے اپنی ''پہلی نظر کی محبت کو نبھایا۔ تمام زندگی صدف سے دل و جان سے محبت کرتا رہا۔''

شادی کے بعد صدف نے حسن سے جوب کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ حسن نے نہ صرف اسے اجازت دے دی بلکہ جوب کے سلسلے میں اس کی مدد کی۔ صدف کو ایک مقامی کالج میں لیکچرر شپ مل گئی۔ اس نے انگریزی لٹریچر میں ماسٹرز کیا تھا اس لیے بھی ''جوب'' ملنے میں زیادہ دقت نہیں ہوئی۔ اس کے دو بیٹے ہوئے حسان اور سائم۔ صدف نے اپنے بیٹوں کی تعلیم و تربیت بہت اچھے طریقے سے کی، کبھی جوب کو اپنی گھریلو ذمہ داریوں کے بیچ میں نہیں آنے دیا۔

ایک دن حسن صدف کو لے کر گھر سے باہر نکلا۔ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد صدف نے حسن سے پوچھا ''ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''تھوڑا صبر کرو'' حسن نے کہا۔

پھر ایک خوبصورت گھر کے سامنے گاڑی روکی اور دروازہ کھول کر صدف کو اترنے کے لیے کہا۔ چوکیدار نے گیٹ کھولا۔ حسن ہاتھ پکڑ کر اسے اندر لے گیا۔

''یہ گھر تمہارے لیے خریدا ہے۔'' حسن نے اسے لپٹاتے ہوئے کہا۔

''حسن! یہ تو بہت خوبصورت دکھائی دے رہا ہے۔'' اس نے پورے گھر پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

پھر حسن اور صدف نے پورے گھر کا چکر لگایا۔ ''اوپر کی منزل سائم کے لیے ہے نیچے حسان اور ہم دونوں بھی حسان کے ساتھ نیچے رہیں گے۔ اور یہ دیکھو یہ ہے ہمارا بیڈ روم۔ اس کی ایک کھڑکی باغ میں کھلتی ہے۔ پھولوں کی مہک ہمارے کمرے کو معطر کرتی رہے گی۔'' حسن بے حد خوش نظر آ رہے تھے۔

''اب تم پر بہت بڑی ذمہ داری آ گئی ہے۔ آہستہ آہستہ اسے فرنشڈ کرنا ہے۔'' حسن نے کہا۔

''ہاں ضرور۔ ہم دونوں مل کر یہ کام کریں گے۔ ان شاء اللہ۔'' صدف نے حسن کو یقین دلایا۔

''کہتے ہیں اچھا وقت تیزی سے گزر جاتا ہے۔ ہم لوگ اس گھر میں آ گئے بچے بڑے ہو گئے۔ حسان کی شادی ہوگئی، اس کے تین بچے بھی ہو گئے۔ زندگی اور وقت مزید تیز رو ہو گئے۔ حسن کی ریٹائرمنٹ کا وقت آ گیا۔''

''حسن! ابھی تو آپ جوان ہیں ریٹائرمنٹ کیسا۔۔۔؟''

صدف نے حسن کے ریٹائرمنٹ کا سن کر ہنستے ہوئے کہا۔

''اڑا لیجیے آپ بھی ہمارا مذاق'' حسن نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔

''یہ سب سوچتے ہوئے صدف کے ہونٹوں پر ہلکی سے مسکراہٹ پھیل گئی۔'' وہ دوبارہ ماضی کے دھندلکوں میں کھو گئی۔

''صدف! تم کالج چلی جاتی ہو، میں اکیلا بور ہوتا رہتا ہوں۔ کتنا اخبار پڑھوں۔۔۔ ٹی وی بھی تمہارے بغیر دیکھنے میں مزہ نہیں آتا۔ پودوں کے ساتھ بھی کچھ وقت گزار لیتا ہوں۔ پھر بھی وقت نہیں کٹتا۔۔۔''

کچھ لمحے کے بعد دوبارہ بولے ''تمہاری ریٹائرمنٹ میں کتنا وقت ہے۔''

''حسن میری ریٹائرمنٹ میں ابھی چار سال باقی ہیں۔'' صدف نے جواب دیا۔

''زندگی ہم دونوں کی مستقل بھاگ دوڑ میں گزر گئی۔ پتہ ہی نہیں چلا زندگی کے اتنے برس کیسے گزر گئے۔ پیچھے مڑ کر دیکھو تو سب ''خواب'' سا لگتا ہے۔ میں نے سوچا تھا ریٹائرمنٹ کے ہم دونوں خوب گھومیں پھریں گے، یورپ کا ٹور (Tour) کریں گے۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ کبھی باہر وقت تو گزارا ہی نہیں۔'' حسن نے محبت سے صدف کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

''حسن! میں چھ ماہ کی چھٹی لے لیتی ہوں۔ مجھے آسانی سے مل جائے گی۔ پھر ہم پلان کر سکتے ہیں۔'' صدف نے حسن سے کہا۔

ابھی ہماری ایک ذمہ داری باقی ہے۔ سائم کی شادی۔۔۔ تو سب سے پہلے سائم کی شادی کا سوچو، اس کے بعد ہم دونوں عمرہ ادا کرنے چلیں گے اور پھر یہ یورپ کے جانے کی تیاری کریں گے۔'' حسن نے کہا۔۔

سائم کی شادی میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ حسن کی بھتیجی افروز سے سائم کی شادی طے ہوگئی۔ سائم اور افروز نے بھی ایک دوسرے کو پسند کر لیا۔

''سائم کی شادی کے بعد ہم دونوں عمرہ کرنے چلے گئے وہاں سے واپس آنے کے بعد حسن نے کہا اب ہم ایک دو ماہ آرام کریں گے، پھر یورپ کا پلان بنائیں گے۔''

''عمرے سے واپس آنے کے ایک ہفتے کے بعد حسن کو دل کا دورہ پڑا جو جان لیوا ثابت ہوا'' صدف کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

حسن کی موت کے بعد صدف کی دنیا اجڑ گئی۔ وہ تو بالکل بکھر گئی تھی مگر اس کے دونوں بیٹوں اور بہوؤں نے بہت محبت دی اور وہ آہستہ آہستہ زندگی کی جانب لوٹنے لگی۔

''چہار سُو''

اس کے ریٹائرمنٹ کا وقت بھی آ گیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اس نے گھر کی تمام تر ذمہ داری سنبھال لی۔ کومل تھوڑی بہت اس کی مدد کر دیتی تھی۔ بچے بھی اپنے ہر کام کے لیے دادی کے پاس ہی آتے۔ گھر کے ہر کام میں حسان اور کومل، صدف کے مشورہ لیتے۔ بہت عزت اور خوشی سے زندگی گزر رہی تھی۔

''بڑھاپا دبے پاؤں آ رہا تھا۔ کام کرنے میں بھی وہ مستعدی نہیں رہی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ کچھ نہ کچھ کرنے کی کوشش کرتی رہتی۔''

''گھر کے کام کاج کیا چھٹے کہ نظامِ ہستی ہی بدل گیا۔ بچے، بڑے آہستہ آہستہ سب دور ہوتے چلے گئے۔ بعض اوقات وہ سارا سارا دن اپنے کمرے میں اکیلی پڑی رہتی۔ سب اپنی اپنی زندگیوں میں مگن۔۔۔''

ایک دن اس کی طبیعت خراب ہوگئی، فیملی ڈاکٹر نے گھر آ کر چیک کیا۔ بلڈ پریشر ہائی تھا۔ ڈاکٹر نے دوائیں تجویز کیں اور خیال رکھنے کے لیے کہا، دن میں دو مرتبہ بلڈ پریشر چیک کرنے کے لیے تاکید کی۔

ڈاکٹر کے جانے کے بعد حسان اور سائم ماں کے پاس آئے اور بیڈ کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئے۔ ماں سے اس کی طبیعت خرابی کے حوالے سے بات کرنے لگے۔ پھر حسان صدف سے مخاطب ہوا۔

''امّی ہم دعا کرتے ہیں آپ لمبی عمر تک زندہ رہیں، آپ سے ایک بات کہنا چاہ رہے ہیں اگر آپ اجازت دیں تو۔''

''ہاں بیٹا بولو۔'' صدف نے محبت سے کہا۔

''ہم دونوں یہ چاہتے ہیں کہ آپ یہ گھر میرے اور سائم کے نام کر دیں۔ آپ تایا ابّو کے بیٹوں صفدر اور عاصم کو تو جانتی ہی ہیں ان کی نظریں شروع ہی سے ہمارے گھر پر ہیں۔''

''صدف ایک بات میری اچھی طرح اپنے پلے باندھ لو اپنی زندگی میں یہ گھر بیٹوں کے نام نہ کرنا۔'' صدف کے سامنے حسن کا چہرہ آ گیا۔

''حسن مجھے معاف کر دینا تمہاری بات کے خلاف جا رہی ہوں۔''

صدف کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔

''ٹھیک ہے، میں تیار ہوں۔'' صدف نے کہا۔

گھر حسان اور سائم کے نام ہو گیا۔ لمحات کا ایک سلسلہ وقت کی صورت میں گزرتا جا رہا تھا۔۔۔ زندگی کے کچھ لمحات اور برس گزر گئے۔

کبھی کبھی وہ سوچتی یہ وقت بھی کتنی عجیب چیز ہے۔ زندگی کے ایک حصہ میں یہ ایک تیز رفتار پرندے کی صورت اڑان بھرتا رہتا ہے۔ روکنا بھی چاہو تو قابو میں نہیں آتا۔ اور پھر زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ اس ''وقت'' میں کوئی اتار، چڑھاؤ۔۔۔ عروج و زوال۔۔۔ آغاز و انجام کچھ نہیں ہوتا۔ سست رفتاری سے چلتا رہتا ہے، فکر اور جذبے کے عوامل سے بے نیاز۔

پھر ایک دن حسان، صدف کے پاس آیا بیڈ کے سامنے بیٹھ گیا۔

امّی! کیسی طبیعت ہے آپ کی؟ حسان نے پوچھا۔

''بہت اچھی ہوں، اللہ کا شکر ہے'' یہ کہتے ہوئے صدف اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''امّی آپ لیٹی رہیں'' حسان نے کہا۔

''میں ٹھیک ہوں تم بتاؤ سب خیریت ہے۔'' صدف نے پوچھا۔

''امّی، دراصل آپ کو یہ بتانا تھا کہ ہم یہ گھر بیچ رہے ہیں۔'' حسان نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''لیکن آخر کیوں؟'' صدف کے دماغ کو ایک دھچکا سا لگا۔ وہ یہ کہتے ہوئے بیڈ سے اتر کر حسان کے پاس صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔

''سائم کو معلوم ہے یہ بات؟'' صدف نے حسان سے سوال کیا۔

''امّی، ہم دونوں نے مل کر ہی یہ فیصلہ کیا ہے۔'' اتنے میں سائم بھی آ گیا۔

''یہ سائم بھی آ گیا ہے، آپ چاہیں تو اس سے بھی پوچھ لیں۔'' حسان نے سائم کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی امّی، یہ ہم دونوں ہی کا فیصلہ ہے۔'' سائم بولا۔

''امّی، میرے پیپرز آ گئے ہیں۔ ہمیں ویزا مل گیا ہے۔ میں، کومل اور بچے امریکہ جا رہے ہیں۔ یہاں گھر رکھنا فضول ہے کسی نے قبضہ کر لیا تو کون عدالت کے چکر کاٹے گا۔ یہاں کے حالات سے تو آپ واقف ہی ہیں۔'' حسان نے ماں سے نرمی سے کہا۔

''تم لوگ امریکہ جاؤ، سائم تو ہے گھر بیچنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں اور سائم یہاں رہیں گے۔'' صدف نے کہا۔

''اس گھر کے لیے اس نے اور حسان نے کتنے خواب اپنی آنکھوں میں سجائے تھے کہ ''ہم نہیں ہوں گے تو ہمارے بچوں کے، پوتے پوتیوں کے، نواسے نواسیوں کے قہقہوں اور خوشیوں سے یہ گھر منور رہے گا۔ اس گھر میں ان کی شادیاں ہوں گی۔ بیٹیاں رخصت ہو کر نئی دنیا بسائیں گی، بہوئیں آ کر اس گھر میں روشنی پھیلائیں گی۔۔۔''

''امّی! آپ کیا سوچنے لگیں۔۔۔ میں آپ سے یہ کہہ رہا تھا کہ سائم کی دوبئی میں جوب ہوگئی ہے سائم دوبئی جا رہا ہے'' حسان نے ماں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ حسان کی آواز پر صدف اپنے خیالات سے واپس آئی۔ یہ سن کر ''سائم دوبئی جا رہا ہے'' اسے بہت دکھ ہوا۔

''مجھے بتایا تک نہیں دونوں نے کہ وہ پاکستان سے باہر جانے کی کوشش کر رہے ہیں'' صدف نے دل ہی دل میں سوچا۔

''میں کس کے ساتھ جاؤں گی؟'' صدف نے سوال کیا۔

''ارے امّی آپ کہاں امریکہ، دوبئی جیسے ملکوں میں اپنے آپ کو ایڈجسٹ کرتی اور خوار ہوتی پھریں گی۔ اور وہ بھی اس عمر میں۔ ہم آپ کو اسلام آباد بھیج رہے ہیں آپ اپنے مائیکے میں آرام سے رہیے گا۔''

مجھے اسلام آباد نہیں جانا ہے۔ مائیکے اور سسرال کا معاملہ میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ مجھے تمہارے ساتھ رہنا ہے، جینا ہے، مرنا ہے اپنے بیٹوں کے ساتھ۔ دونوں نہیں تو کسی ایک ساتھ جو دل سے رکھے۔'' صدف نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''امّی! یہ صرف میرا نہیں، آپ کے دونوں بیٹوں کا فیصلہ ہے۔''

بڑے بیٹے (حسان) حکم دینے کے لہجے میں بولا۔

''امّی! یہ ہماری مجبوری ہے۔اس کا خیال کریں اور ہمیں معاف کر دیں۔'' چھوٹا بیٹا (سائم) بولا۔

''کل شام چار بجے کی آپ کی فلائٹ بک ہے۔'' حسان نے تحکمانہ لہجے میں کہا اور مزید بات چیت کیے بغیر وہاں سے چلا گیا۔

چہار جانب ایک المناک سکوت ہو گیا۔صدف نے چھوٹے بیٹے کی جانب نظریں جما دیں۔لیکن وہ بھی ماں سے نظریں چراتے ہوئے اٹھا اور منظر سے غائب ہو گیا۔صدف بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔

دوسرے دن صبح جب خادمہ صدف کے کمرے میں پہنچی تو دیکھا صدف کمرے میں نہیں تھی، باتھ روم میں بھی سناٹا تھا۔خادمہ نے سب سے پہلے کومل کو اطلاع دی۔

''تو میں کیا کر سکتی ہوں'' کومل نے نوکرانی کو جھڑک دیا۔

نوکرانی نے صدف کے غائب ہونے کی اطلاع گھر کے چھوٹے بڑے تمام لوگوں کو پہنچا دی۔

اسلام آباد کی فلائٹ کینسل کروا دی۔حسان اور سائم گاڑی لے کر جگہ جگہ ماں کو تلاش کرتے پھرے تھک ہار کر پولیس سے مدد مانگی۔۔۔میڈیا سے بھی مدد لی۔۔۔مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔صدف کا پتہ نہ چل سکا۔صدف کے ساتھ گھر پر لگی ہوئی تختی ''حسن لاج'' غائب تھی مگر اس پر کسی کا دھیان نہیں گیا۔

مکان فروخت ہو گیا۔امریکہ جانے والے امریکہ چلے گئے۔دوبئ جانے والے دوبئ چلے گئے۔ماں کا مکان فروخت کرنے اور ماں کو ساتھ لئے بغیر ملک چھوڑنے والے بیٹوں کا دھیان ماں کے بینک اکاؤنٹ کی جانب نہیں گیا تھا۔ وہ مکان بیچنے کے ساتھ اپنی بوڑھی ہوتی ہوئی ماں سے بھی جان چھڑا رہے تھے۔ان کی بیگمات بھی ایک بوجھ سے چھٹکارا پا رہی تھیں اور وہ بھی ہمیشہ کے لیے۔

دوبئ میں سائم کو ملازمت تو اچھی مل گئی تنخواہ بھی اچھی تھی لیکن اس کی بیگم نے یہ محسوس کر لیا کہ یہاں زندگی گزاری نہیں جا سکتی۔ان دونوں نے بھی حسان کے پاس نیویارک جانے کا ارادہ کر لیا۔نیویارک میں حسان کو اس کے اپنے فیلڈ میں مناسب جوب ملنے میں بہت دقت پیش آئی۔

انجینئرنگ کے جس شعبہ میں وہ سند یافتہ تھا اس میں اس کے اسٹینڈرڈ کے مطابق اسے جوب نہیں مل رہی تھی۔بالآخر اس نے یہی فیصلہ کیا کہ فی الحال جو بھی جوب ملے کرتا ہے۔کومل ابتدا میں بہت خوش تھی مگر جب بچوں کی اور گھر کی ذمہ داری تنہا اس پر پڑی اور ساتھ میں جوب تو اسے اپنا ملک بہت یاد آیا کیونکہ اسے تو نوکر چاکر کی عادت تھی۔

صدف ان کی زندگی سے ہی نہیں ان کی یادوں سے بھی نکل چکی تھی۔ایسے میں حسان نے ٹی وی پر ایک پاکستانی چینل پر اپنی ماں (صدف) کو دیکھا۔اس نے کومل کو آواز دی۔دونوں پھٹی پھٹی آنکھوں سے صدف کو دیکھنے لگے۔صدف ان کے سامنے کھڑی تھی۔اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔اس کی آواز میں دھیرج اور خود اعتمادی تھی۔وہ بول رہی تھی:

''پہلے میں اپنے اور اپنی اولاد کے ماسوا کسی اور کے بارے میں سوچتی ہی نہیں تھی۔میری دنیا مجھ پر اور میرے بچوں پر مشتمل تھی۔پھر یہ ہوا میں اپنی ایک کالج کی ساتھی کے ساتھ اس کے آبائی گاؤں گئی۔وہاں چند روز رہنے کے بعد میری سوچ بدل گئی۔میں نے محسوس کیا اس چھوٹے سے گاؤں اور گاؤں میں رہنے والوں کو میری ضرورت ہے۔میں اس گاؤں اور گاؤں کے رہنے والوں کی ہو گئی۔اور آج بھی اپنے فیصلے پر پوری طرح مطمئن ہوں۔''

اب اینکر خاتون مخاطب تھیں:

''آپ نے بیگم صدف حسن کو دیکھا، ان کی باتیں سنیں۔بیگم صدف حسن نے بہت کم عرصے میں ایک ادارے کی تشکیل کی۔

''حسن میموریل انسٹی ٹیوٹ اوف ویلیج ویلیفئر''

''Hassan Memorial Institute of village welfare''

اس کی شاخیں دیگر دیہاتوں میں بھی قائم کیں۔

''بیگم صاحبہ ہم چاہتے ہیں کہ آپ اس انسٹی ٹیوٹ کے بارے میں ہمارے ناظرین کو کچھ بتائیں۔'' اینکر خاتون نے صدف حسن سے کہا۔

''اس ادارے کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے تحت گاؤں کی خواتین ''اپنی مدد آپ'' کے اصول پر سب کچھ کرتی ہیں۔گاؤں کے باسی اپنا تھوڑا تھوڑا وقت دیتے ہیں اور میں اور میری رفیق خواتین ان کو سکھاتی ہیں ان کی رہنمائی کرتی ہیں۔ان میں تعلیم، تدریس، سلائی، کڑھائی، کاٹیج انڈسٹری اور دیگر شعبہ ہائے حیات سے متعلق شعبے شامل ہیں۔اب اس گاؤں کی یہ بہت بڑی خوبی ہے کہ آپ زیادہ تر خواتین کو پڑھا لکھا اور خود اعتماد پائیں گی۔''

''مرد حضرات کو اس پروجیکٹ سے دور رکھا گیا ہے۔'' اینکر خاتون نے ہنستے ہوئے سوال کیا۔

''جی ہاں۔۔۔یہ خواتین کا ادارہ ہے۔لیکن مرد حضرات نے بھی اس طرف توجہ دینی شروع کی ہے۔وہ بھی اپنے طور پر ادارے قائم کر رہے ہیں۔ صدف نے بھی ہنستے ہوئے جواب دیا۔

''اینکر خاتون نے بیگم صدف حسن کے بارے میں مزید تحسین سے معمور فقرے کہے اور بتایا بیگم صدف حسن اس انسٹی ٹیوٹ کے ساتھ ہی اپنے ایک چھوٹے سے خوبصورت گھر میں تنہا رہتی ہیں۔اور جاتے جاتے یہ کہہ کر میں آپ کو ان کے اس خوبصورت گھر کی ایک جھلک دکھاتی ہوں۔''

گیٹ پر ''حسن لاج'' کی تختی دیکھ کر کومل کے منہ سے ایک دم نکلا:

''حسان یہ تو اپنے گھر والی تختی ہے۔''

ٹی وی کھلا رہ گیا، اگلا پروگرام شروع ہو گیا۔دونوں میاں بیوی بت بنے بیٹھے رہے۔دونوں سے اٹھا نہیں جا رہا تھا۔ان کے بدن بوجھل ہو گئے تھے۔ دونوں اپنے آپ سے شرمندہ ہو رہے تھے۔ان کی آنکھوں کے آگے صدف کھڑی تھی، ان دونوں سے بلند و بالا اور بے نیاز۔۔۔!!

فتح کے ٹوٹتے کنارے

جمیل احمد عدیل
(گوجرانوالہ)

جب تاخیر کے باعث ذہنی تناؤ موذی ہونے لگے تو گھڑی کی طرف نہ دیکھنے کو اعلا درجے کی عیاشی قرار دیا جاسکتا ہے۔ زوّار کے لیے یہ کام بھلا کیا دشوار تھا کہ اسے تو غضِ بصر میں پختہ کار ہونے کا اعزاز نصیب ہو چکا تھا۔ دنیاداری کے لیے اسے اپنی آبائی کپڑے کی دکان پہ بیٹھنا پڑتا تھا، یوں سارا دن مردوزن سے معاملہ کرنا اس کا معمول تھا لیکن اس کا من اپنے مرشد کے آستانے میں اٹکا رہتا۔۔۔ پینتیس برس کیا عمر ہوتی ہے، سو، وہ اب بھی جوان ہی نہیں، جوانِ رعنا تھا لیکن جب وہ تیسویں سال کی ابتدا میں تھا، تو حضرت صاحب کے ہاتھ پر بیعت ہو چکا تھا۔۔۔ بی۔اے تعلیم عام سطح کی ملازمت کے لیے بھی ایسی مہربان ثابت نہیں ہوتی اور زوّار تو اس ضمن میں ایک بار بھی امیدوار نہ بنا تھا کہ نوکری اس کے لیے گویا گھٹن گھر تھا۔ پڑھنے کی لگن بھی دل میں کوئی بے تابی نہیں رکھتی تھی؛ چناں چہ ان حالات میں اپنے بزاز والد کی معاونت خود بخود ہی اس کی منزل بن گئی۔ اس کے دونوں بڑے بھائی ایک دوسرے کی ضد میں سی ایس ایس کر کے افسر شاہی کا حصہ بنے ازحد مسرور تھے۔ والد جیسے جیسے از کار رفتہ ہوتے چلے گئے، کاروبار کی ذمہ داری زوّار کے شانوں پر آتی گئی۔

ایک خوش شکل اور کھاتے پیتے گھرانے کا برسرروزگار فرزند شادی سے گریزاں رہے، بات تو بلاشبہ اچنبھے والی ہے! ممکن ہی نہیں یقیناً زوّار چہ میگوئیوں کی زد میں رہتا تھا لیکن کم از کم اس سے وابستہ تمام افراد خانہ جانتے تھے کہ اس رویے کا اساسی سبب اس کے مرشد کی روحانی تربیت ہے۔ دراصل وہ خالصتاً اپنی مرضی سے ایسے سلسلے میں بیعت ہوا تھا، جس میں سالک کو ازدواجی زندگی اپنانے سے باضابطہ روکا تو نہیں جاتا تھا مگر عائلی حیات اختیار کرنے والوں کی ایسی حوصلہ افزائی بھی نہیں کی جاتی تھی۔ مثال کے طور پر ان کے مرشد یا کوئی خلیفہ مجاز کبھی کسی معتقد کی شادی میں شرکت نہیں کرتے تھے۔ بعض مریدین نے بڑی ہی لجاجت کے ساتھ ان بزرگوں سے برائے برکت نکاح پڑھوانے کی گزارش کی لیکن انھوں نے صاف معذرت کر لی! مذکورہ آستانے کے مواعظ اور لٹریچر میں تاہل اختیار نہ کرنے والوں کی فضیلت ترجیحاً بیان ہوتی تھی اور اس نوعیت کے صوفیانہ اقوال کو بطور خاص پیش کیا جاتا تھا:

'عورت کی رفاقت زندگی کی جڑوں کو کتر ڈالتی ہے!'

'اگر اللہ اپنے کسی عبد پر مہربان ہوتا ہے تو اس کی بیوی کو مر جانے دیتا ہے اور اسے موقع عطا کرتا ہے کہ وہ خود کو پوری طرح اللہ کی عبادت کے لیے وقف کر دے!'

کسی نہ کسی سطح پر سینٹ اگسٹائن کی طرح اس مسلک کے اکابر بھی یہی محسوس کرتے تھے، شہوانی لذت اگر گناہ کی سزا نہ ہوتی تو جنسی عمل روحانیت کا پرتو ہوتا!

بانیٔ سلسلہ کے ضخیم سوانحی تذکرے میں مولف نے اپنے بسیط مقدمے کو ان منقول و معقول براہین سے التزاماً مزین کیا تھا جو شادی نہ کرنے کے بیانیے کو تقویت دیتے تھے۔ علاوہ ازیں اُمت کے ان اکابرین کے اسما پر مشتمل فہرست بھی موجود تھی جنھوں نے خود کو عیال و اطفال کے مدار سے دور رکھا تھا۔ اس سلسلے کے مبایعین کی بابت مشہور تھا کہ اگر کوئی شادی کر بھی لیتا ہے تو جلد ہی میاں بیوی میں علاحدگی ہو جاتی ہے۔ اگر ایسا نہ بھی ہو تو زوجین کے مابین قربت کا رجحان مشاہدے کا حصہ نہیں بنتا۔

زوّار نے صرف اپنے مرشد کے اسوہ ہی کو آئیڈیل نہیں بنایا۔ عورت سے فاصلہ رکھنے کے فیوض و برکات کو ریاضت و مجاہدہ کے ساتھ اپنے پورے وجود میں بھی جذب کر لیا۔ موجودہ سجادہ نشین اپنے اس خاص ارادتمند کی طرف سے پورے بے فکر تو نہیں تھے کہ اس باب میں ضمانت کوئی بھی فراہم نہیں کر سکا لیکن انھیں یہ تسلی ضرور رہتی تھی کہ اس صالح کے قدم جلد ڈگمگانے والے نہیں۔

نجویٰ زوّار کے لیے پہلی آزمایش نہیں تھی لیکن آزمایش بہرحال تھی اور دیگر آرزومندوں کے مقابلے میں کچھ بڑھ کر اس لیے بھی کہ اس کی دلکش نسوانی آواز کا سحر بے خود کر دینے والا تھا! زوّار کے ساتھ ایک قضیہ بے طرح جڑا رہا کہ آوازوں کا طلسم اسے بے بس کر دیتا تھا! کیا عجب کہ باصرہ پہ نافذ پہرہ سامعہ میں فعال ہو گیا ہو! لیکن یہ ضرور ہے کہ جس مصدر سے مترنم آواز برآمد ہوئی، ایک بار وہیں اس کے قدم تھم گئے اور اس کی روح نے اسے قبلہ تسلیم کر لیا۔ اس حوالے سے وہ بے تکلف ہو کر مرشد کے سامنے بھی اظہار کر دیتا تھا:

حضرت! مدھر آواز کے روبرو فنا ہونے کے قریب ہو جاتا ہوں: رفیع، لتا، ہیمنت کمار، مکیش، استاد امانت علی خاں، مہدی حسن، سلیم رضا، نیرہ نور۔۔۔ یہ سُروں کے ملائکہ ہیں! میری روح، میرے اعصاب، میرا دِل، میرا دماغ انھیں سننے سے باز نہیں رہ سکتا! کچھ کیجیے!

حضرت صاحب مسکرا اٹھتے:

میرے عزیز! مرشد مرید کو سنگی مجسمے میں نہیں ڈھالتے؛ دھڑکنوں کو ساکن نہیں کرتے؛ صرف اپنے نفس پر قابو پانے کا طریقہ بتاتے ہیں۔ باقی اپنا کام خود کرنا پڑتا ہے۔ خود کنواں کھود کر پانی نکالنے کی مشقت کرنا ہوگی کہ اسی پانی سے ہر قسم کی نار ٹھنڈی ہوتی ہے!!

زوّار اور اس کی کشاکش کو ہر ساعت کی جنگ کہا جاسکتا ہے! خلوت میں یہ کارزار کیسے دہکتا ہوگا؟ انگارے کیسے سرد ہوتے ہوں گے؟ جس تن لاگے وہی جانے! لیکن جب نجویٰ کی فون کال آتی تو ایک بار وہ یہی محسوس کرتا؛ ساری تپیارا کھو گئی ہے کہ پہلے مرحلے میں ہی آواز الفاظ پر حاوی ہو جاتی اور کچھ دیر کے لیے وہ اس سے یکسر بے نیاز ہو جاتا کہ نجویٰ کہہ کیا رہی ہے؛ اس کی سماعت ٹیون ہو کر لبھا لینے والے تکلم کے آگے سرنگوں ہو جاتی!

یہ بسہولت تصور کیا جا سکتا ہے کہ نجویٰ زوّار کی دکان پہ آتی جاتی رہی ہو گی لیکن زوّار کے لیے صرف آواز کی شناخت پر مرکوز ہو کر قطعی تعین کر لینا ایسا سہل نہ تھا کہ اس کا گمان یہی گواہی دیتا تھا، نجویٰ سے کبھی آمنے سامنے بات نہیں ہوئی۔ پھر اس جادوئی آواز کے مساوی کوئی جادوئی چہرہ بھی اس کے روبرو نہیں ہوا تھا، جسے دیکھ کر وہ دم بخود رہ جاتا! زوّار نے ایک روز اس تجسس کو ظاہر کر ہی دیا تو نجویٰ ہنستی چلی گئی:

آپ بہت معصوم ہیں، واقعی بہت معصوم!!

میں کئی بار آپ کی شاپ پہ آئی ہوں لیکن کبھی آپ سے ہمکلام نہیں ہوئی۔ خرید و فروخت کے سلسلہ میں ہمیشہ آپ کے سیلزمینوں سے مکالمہ ہوا ہے۔۔۔ اور ہاں! میں ایک مرتبہ بھی بغیر برقعے کے نہیں آئی لہٰذا میں کون ہوں؟ کیسی ہوں؟ یہ ایک راز ہے کہ 'نجویٰ' کہتے ہی 'راز' کو ہیں!!

مرشد نے 'توجہ' کا روحانی آموختہ سکھاتے ہوئے مریدین کو سدا متنبہ کیا تھا:

خبردار! کبھی کسی عورت کو توجہ دینے کی غلطی نہ کرنا!

یوں بعض کچے ذہنوں میں اس طاغوتی خیال کا کوندا لپک جاتا تھا کہ ایسا کرنے سے 'خاص مقصد' کا حصول گویا بھرپور امکان رکھتا ہے۔۔۔ رزوّار نے اس طغیانی کا رخ اس جانب کبھی نہیں ہونے دیا تھا، اسی لیے وہ مرشد کو بہتوں سے بڑھ کر محبوب تھا! لیکن یہ محبوب صرف مرشد ہی کو محبوب نہیں تھا، متعدد خواتین کی آنکھ کا بھی تارا تھا! زوّار کا والد بہت ہی زیرک اور جہاندیدہ آدمی تھا کہ وہ ٹیلر ماسٹر سے ترقی کر کے کلاتھ مرچنٹ بنا تھا۔ اسے بہت اچھی طرح خبر تھی، دکان چلنے کی ایک وجہ اس کا بیٹا بھی ہے کیوں کہ لیڈیز حصے کی سیل ہمیشہ زیادہ رہی مگر اسے اپنے نیکوکار فرزند پر اعتماد تھا ورنہ اتنی پیاری صورت اور عالم شباب میں: ڈھیلے ڈھالے کرتے، عمامے، ٹخنوں سے اوپر پائینچے، تسبیح کے منکے اور شرعی باریش ہونے کی طرف میلان کم کم ہی ظاہر ہوتا ہے۔

زوّار بہر طور تاجر تھا چنانچہ اس نے خود سے یہ تجارت طے کر لی، اس شرط پر نجویٰ سے بات ہوتی رہے گی کہ وہ ملنے کا کہے بھی تو ہاں نہیں کرنی! یعنی اس بھولے بھالے صوفی نے پھسلن پہ قدم رکھنے کی آمادگی کے لیے خود ہی جواز مہیا کر لیا۔ ایسا بھی نہیں وہ اس قول پہ قائم نہیں رہا لیکن ایسا بھی نہیں کہ وہ مستقل قائم رہا۔ بات نے آگے بڑھنا ہی تھا؛ سو، وہ آگے بڑھ کر رہی کہ خارش جلد میں تھوڑی ہوتی ہے، وہ تو ناخنوں میں بے چین ہوا کرتی ہے۔ اب ملاقات نجویٰ کے اصرار پر ہی طے ہوئی مگر مگر زوّار نے کب اپنی مزاحمت کو آزمایا تھا!

زوّار کے لیے یہ انکشاف کچھ زیادہ ہی حیران کن ثابت ہوا کہ نجویٰ لاہور کی رہنے والی نہیں ہے۔ زوّار کے دیدار سے خود کو سرشار کرنے کے لیے وہ ہری پور سے آتی تھی۔ اب بھی اس نے بتایا کہ وہ رات بھر سفر کر کے علی الصباح لاہور پہنچ جائے گی، چنانچہ ڈائیوو کے اسٹیشن پر وہ آٹھ بجے آ جائے! ایسے ملن سے جڑی رات نیند کے ہر عنصر سے تہی ہوا کرتی ہے۔ اُدھر نجویٰ تاریکی کو چیرتی ہوئی شہرِ جاناں کی جانب رواں رہی، اِدھر زوّار نے شب بیداری کے عمل کو حقیقت سے مجاز کے بیچ جھولا جھلانے کا خوب بہانہ بنایا یعنی کبھی نوافل میں مشغول تو کبھی میسیج کر کے اس سے دریافت کر لیتا کہ 'پالکی' کہاں تک پہنچی ہے؟

نماز فجر پڑھنے کے معاً بعد جاگنے کی سزا نے اس کے پپوٹوں کو اس قدر بھاری کر دیا کہ اسے پتا ہی نہیں چلا وہ کب آغوشِ نوم کی نرمی کے سپرد ہو گیا ہے! جب آنکھ کھلی تو اتنی دیر ہو چکی تھی کہ وہ اڑ کر بھی آٹھ بجے نہیں پہنچ سکتا تھا! بنیادی تیاریاں تو اہتمام کے مراحل سے گزر چکی تھیں لیکن پھر بھی۔۔۔ اور ناشتا کیے بغیر ہی اس 'پھر بھی' کو خود پہ لاد کے وہ گاڑی کو سڑکوں پہ دوڑاتا ہوا سوئے منزل روانہ رہا۔۔۔ یہی وہ مرحلہ تھا جب ذہنی تناؤ نے گھڑی کی طرف نہ دیکھنے کی عیاشی سے پہلی بار لطف اٹھایا۔۔۔ دیکھنے کی ایسی فکرمندی بھی لاحق نہیں تھی کہ اسے درک تھا، ہجوم بھی حجاب کی ایک قسم ہے لیکن یہ کسک بہر نوع اس کے مزے میں زہر گھول رہی تھی کہ ایک جلیل مقصد کی خاطر، کہاں شادی ایسے جائز اقدام سے انکار اور کہاں ایسی ملاقات جسے اندر باہر جسٹیفائی کرنا نرا پرا چیلنج تھا! وہ دیکھ رہا تھا کہ نیم تاریک کمرے کا 'نفی اثبات' اور ہے، دن کی روشنی میں یہ سفر اس کی دوسری شکل کو سامنے لا رہا ہے۔ بھلا اِس اضطراب کی اُس طمانیت سے کیا نسبت! وہاں اونگھ ممکن تھی یہاں پلک جھپکنے کا بھی یارانہ تھا! اسے ایسا لگ رہا تھا کہ راہوارِ شوق ایندھن کے احسان سے بے نیاز ہو چکا ہے۔ اپنی توانائی خود پیدا ہونے کی کیفیت مشاہدے میں جذب ہو رہی ہے اور گردوپیش راستہ دینے پر ایک حد تک مستعدی دکھا رہے ہیں لیکن سر کی نسوں میں قیدی بیٹ جب برداشت سے باہر ہونے لگی تو اس نے نہایت شدت سے طلب کی، اب صرف دو گام چلوں اور منزل خود چل کر سامنے آ جائے! اور ایسا ہی ہوا کہ وہ فیروز پور روڈ پہ واقع ڈائیوو اسٹیشن کے عین سامنے موجود تھا۔ فون پہ رابطہ ہوا تو نجویٰ نے مطلع کیا: بس دو چار منٹس میں آپ کے پاس ہوں گی! زمان و مکاں اپنی مادیتوں، روحانیتوں وغیرہ کو ملا جلا کر ایک ڈاٹ میں یوں سمیٹ چکے تھے کہ یہ نقطہ نئے بگ بینگ کے امکان سے چھلکنے کو بے تاب تھا!

مرکزی گیٹ سے مسافر باہر آ رہے تھے اور زوّار انتہائی متجسس کہ وہ کون ہو گی جو اس کی گاڑی کا رنگ اور نمبر دیکھ کر اس کا در وا کرے گی؟ نہایت پرکشش آنکھوں اور لچکتے بدن والی تین چار برقع پوش اور بے پردہ خواتین کی بابت اس نے سوچا کہ اس کی مطلوبہ یقیناً ان میں سے ہی کوئی ایک ہو گی! لیکن وہ چند ثانیوں میں ایک ایک کر کے وہاں سے چلی گئیں تو نجویٰ کو نہ پا کر اس کا دل بیٹھ گیا! اس نے اپنا سر جھکا کر آنکھیں موند لیں! اسی اثنا میں گاڑی کا دروازہ کھولا گیا اور کالے برقعے میں لپٹی ہوئی ایک عورت اس کے پہلو میں براجمان ہو گئی۔ خواب کو تعبیر مل چکی تھی لیکن زوّار کا ردعمل بالکل غیر متوقع رہا کہ اس نے آنکھ اٹھا کر بھی آنے والی کی طرف نہیں دیکھا اور بلا توقف گاڑی اسٹارٹ کر کے چل پڑا۔ تاہم ساتھ ساتھ بات کرتا گیا:

سفر کیسا رہا؟

مجھے کچھ تاخیر ہو گئی، جس کے لیے معذرت کہ آپ کو انتظار کرنا پڑا۔

نجوئی بھی ہر بات کا جواب دیتی گئی۔ وہی طلسمی آواز، وہی شیریں لہجہ، ہر لفظ اپنی اپنی صوتی اکائی کے ساتھ دل میں کھب جانے والا! زوّار اس کی جانب اس لیے نہیں دیکھ رہا تھا کہ اگر آواز اور شخصیت میں بُعد ہوا تو وہ یہ صدمہ کیسے برداشت کر پائے گا؟

ایک روحانی شخص کی صحبت نے اتنی روحانیت تو نجوئی میں منتقل کر ہی دی تھی کہ وہ ہنستے ہوئے بولی:

زوّار صاحب! فکر نہ کیجیے، آواز اور شخصیت میں فاصلہ نہیں ہوگا۔۔۔جب وہ یہ جملہ ادا کر رہی تھی تو عین اس گھڑی گاڑی کلمہ چوک سے برکت مارکیٹ والی سڑک میں داخل ہو رہی تھی۔۔۔اور نجوئی اپنے چہرے سے نقاب ہٹا چکی تھی۔ سرخ وسفید چہرے سے تابناک شعاعوں کی جھمک زوّار کو آن کی آن میں خیرہ کر گئی! اسے یقین کرنا پڑا، آواز جزو ہے کل نہیں!

برکت مارکیٹ کے قریب پہنچ کر، اس نے پہلی بار سوچا کہ وہ کون سی جگہ ہوگی جہاں طمانیت سے بیٹھا جا سکے؟ سخت سردیوں کے دن تھے، ہر طرف دھند چھائی ہوئی تھی۔ اتنی صبح کوئی ریسٹورینٹ، کوئی ہوٹل، کچھ بھی وہاں مہیا نہ تھا۔ ایسے مواقع میں گاڑی کا پرسکون کیبن میں تبدیل ہو جانا کسی مابعد الطبیعی کرشمے کا مطالبہ نہیں کرتا۔ مارکیٹ میں داخل ہو کر بائیں جانب، تقریباً درمیان میں، بند دکانوں کے سامنے سڑک سے اتار کر اس نے گاڑی روک لی۔ نجوئی کی طرف ٹھہر کر دیکھا اور کافی دیر دیکھتا چلا گیا! تیکھے نقوش کی مالک، ایک دبلی پتلی لمبی سی لڑکی لیکن اپنے بھرپور ممکنات سے آراستہ، گھبراہٹ میں تھوڑا سا زاید کاجل آنکھوں میں لگائے مسکرائی:

کچھ کہیے! کیسا لگا یہ سب؟

آپ نے اپنی عمر بتیس برس بتائی تھی جبکہ آپ کسی بھی طرح بائیس سے زیادہ نہیں ہیں۔ زوّار کے نیم فہمائشی انداز پر نجوئی کھلکھلائی:

تو یہ Compliment ہے؟

نہیں! Compliment ہوتا تو میں کہتا:

آپ بائیس برس کی لگ رہی ہیں جبکہ آپ حقیقت میں اس سے زیادہ کی نہیں ہیں۔ ایسا کیوں کیا آپ نے؟

نجوئی نے اپنے مخصوص پُراعتماد لہجے میں وضاحت کی:

آپ کا اندازہ بالکل درست ہے، میرا خیال تھا اگر میں نے اپنی اصل عمر بتائی تو کہیں میری کم عمری کو آپ سطحی جذباتیت سمجھ کر مجھے ٹھکرا نہ دیں۔ اس لیے آپ کی عمر کے قریب قریب رہنا ضروری تھا۔۔۔باقی جو آپ کی رضا!

زوّار نے تو 'راضی بہ رضا' رہنے ہی کو حرزِ جاں بنانا سیکھا تھا اور ان مہکتے لمحوں میں تو 'راضی بہ رضا' ہونے/رہنے کے لیے کسی روحانی زور آزمائی کی ایسی احتیاج بھی نہیں تھی۔ نجوئی نے پچھلی سیٹ سے اپنا بیگ اٹھایا اور ایک ایک کر کے جو بیش قیمت تحائف نکالنے شروع کیے تو زوّار کی جھولی بھر گئی! جبکہ زوّار کے کوٹ کی جیب میں اس کے لیے گولڈ کی صرف ایک چین تھی اور وہ بھی پیکنگ کے تکلف سے تہی، ہرے مہین کاغذ میں ملفوف، جسے عجز و نیاز کے ساتھ پیش کر دیا گیا۔

اس اثنا میں لوگوں کی آمد و رفت میں کچھ اضافہ ہونے لگا تو طے یہ ہوا کہ گاڑی کی پوزیشن ذرا بدلی جائے تاکہ اس کے سوار مشکوک نہ سمجھے جائیں۔ زوّار آہستہ آہستہ گاڑی کو آگے لے گیا اور اب وہ مارکیٹ کے بالکل سامنے والی بند دکانوں کے سامنے کار میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ دھند نے سکرین اور باقی شیشوں کو مسٹیفائیڈ کیا ہوا تھا۔ اس لیے گمان تھا کہ ان پر زیادہ دھیان نہیں دیا جائے گا۔ یوں بھی زوّار کا مولویانہ گیٹ اپ شاید فوری شک کا باعث نہ بنتا۔

زوّار نے نجوئی سے کہا کہ وہ دروازے لاک کر کے گاڑی میں بیٹھی رہے اور خود وہ قریبی بیکری سے ناشتے کا سامان اور گرما گرم کافی لے آیا۔ نجوئی نے پہل کی اور اپنے ہاتھ سے اسے یوں نوالہ دیا کہ عمداً اپنی انگلیوں کو اس کے ہونٹوں سے مس ہونے دیا۔ وہ خود کے لیے اسی ریسپانس کی توقع کر رہی تھی مگر زوّار ایسا نہ کر سکا! اسی طرح ہاتھ تھامنے کے مرحلے میں بھی نجوئی کو سبقت کرنا پڑی اور پھر وہ جتنی دیر گاڑی میں بیٹھے رہے؛ زوّار کا ہاتھ نجوئی کے ہاتھوں میں رہا؛ جسے وہ وقفے وقفے سے چومتی رہی۔ دونوں اس انتظار میں تھے کہ کسی طرح کوئی ریسٹورینٹ کھل جائے تاکہ باقی باتیں وہاں اطمینان سے ہو سکیں۔ اس دوران دکانوں کے شٹر اوپر اٹھنے شروع ہو چکے تھے۔ چھوٹے کاروباری برآمدوں کے ستونوں سے اپنے رزق کی ڈوری باندھے، شوارموں اور فنگر فرائز کی اشتہا انگیز خوشبو بکھیرنے پہ مستعد ہو چکے تھے۔ یوں لوگ باگ تعداد میں بڑھتے جا رہے تھے لہٰذا وہاں مزید رکنا مناسب نہ سمجھ کر وہ واپس مین روڈ پر آ گئے اور ایک بہتر ریسٹورینٹ کا دروازہ کھلا دیکھ کر جب اندر جانے لگے تو ایک ملازم نے کہا:

سر! ریسٹورینٹ کھلنے کا وقت ساڑھے بارہ ہے، ابھی تو گیارہ بھی نہیں بجے!

زوّار کو کچھ خجالت محسوس ہوئی کہ وہ اس مناسبت سے عمدہ بندوبست نہیں کر سکا تھا اور کرتا بھی کیسے کہ اس سے قبل کبھی اس رنگ میں کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

اب فیصلہ یہی ہوا کہ باقی وقت یوں ہی گاڑی میں گزارا جائے لیکن کسی ایک جگہ رک کر نہیں بلکہ 'حالت سفر' میں: پاسپورٹ آفس والی گلی، نیو گارڈن ٹاؤن، پنجاب یونیورسٹی، ٹاؤن شپ موڑ، مسلم ٹاؤن اور فیروز پور روڈ پر گاڑی مسلسل چلتی رہی۔۔۔زوّار کا ہاتھ بدستور نجوئی کے ہاتھ میں رہا۔۔۔نجوئی نے زیادہ باتیں کیں، زوّار نے کم بلکہ بہت ہی کم!!

غیر حتمی پروگرام تو یہی بنا تھا کہ اسی دن شام سے پہلے کسی وقت نجوئی ہری پور کی بجائے راولپنڈی اپنے ہوسٹل کے لیے روانہ ہو جائے گی لیکن زوّار کو جانے کیا ہوا، اس نے ان لمحوں میں شدت کے ساتھ چاہا کہ نجوئی جلد از جلد اب اس سے جدا ہو جائے۔۔۔جب اس موضوع پر بات ہوئی تو اس نے اپنی طرف سے بہت محتاط ہو کر یہ عندیہ دیا کہ آج کل دن چھوٹے ہیں، اس لیے رات کے سفر سے گریز کرنا چاہیے! نجوئی کو ایک دھچکا لگا! وہ یہ سوچ کر بالکل چپ ہو گئی کہ صبح سے اب تک جتنی بھی پیش رفت ہوئی تھی، ساری اسی کی جانب سے تھی۔ زوّار کی شمولیت بس یہیں

تک رہی کہ اس نے نجوئی کو کسی بھی اظہار سے روکا نہیں تھا۔ باقی ہر چاہت جیسے نجوئی کی ذمہ داری قرار پا گئی تھی لیکن اس کی زیرکی نے اپنے دل سے اٹھنے والی مایوسی کی لہروں کو کامیابی کے ساتھ چھپالیا اور اپنی خوش طبعی کو از سرِ نو بحال کرلیا۔

بکنگ آفس میں فون کرکے جب انفرمیشن لی گئی تو پتا چلا، اس کے بعد پہلی گاڑی ایک بجے روانہ ہوگی اور اس وقت سوا بارہ بجنے والے تھے۔ زوّار کو ایسا لگا کہ یہ پینتالیس منٹ کہیں سو سال میں جا کر ختم ہوں گے! وہ ایک ایک لمحہ گننے لگا اور دُعا کرتا جا رہا تھا: کسی طرح یہ وقت تیزی سے بیت جائے اور نجوئی کو الوداع کرکے وہ اپنے سکون کے منطقے میں لوٹ آئے، لیکن اس نے پوری قوت صرف کر ڈالی کہ یہ تاثر کسی طرح پکڑا نہ جائے مگر عورت کو قدرت نے ایسا بنایا ہی نہیں کہ وہ مرد کی روح کے خفیہ ترین پرت کی عبارت کو نہ پڑھ سکے۔ سو، نجوئی نے ایک لمحے کے لیے سوچا:

کہیں وجہ وہی نہ ہو کہ اس نے پینتیس برس کی عمر تک شادی نہیں کی؟

اب وہ ڈائیو کے اسٹیشن میں داخل ہو رہے تھے اور گاڑی کی روانگی میں پندرہ منٹ باقی تھے۔ زوّار نے کافی آگے جا کر پارکنگ میں گاڑی کھڑی کی تو نجوئی دل گرفتہ سی ہو کر بولی:

تو کیا میں خالی چلی جاؤں گی؟

مطلب؟

مطلب یہ کہ صوفی صاحب! میں آپ کی غلافی آنکھوں کو چومنا چاہتی ہوں!

زوّار مسکرایا!

اور نجوئی نے ایک بار نہیں بار بار اس کی آنکھوں کو چوما اور اپنے ہونٹوں کو اس کے ہونٹوں پہ رکھ دیا۔۔۔اس پر جو ہوا، اسے ساری خوش گمانی یکجا کرکے فرض ہی کرنا پڑا کہ زوّار نے اس کے لبوں پہ مہر بوسہ ثبت کی ہے!!

واپسی پر زوّار کا دل بوجھل تھا اور قدرے مطمئن بھی کہ اس کی تمنا کے مطابق نجوئی بہرحال جا چکی تھی۔۔۔اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ یہ سب ہوا کیا۔۔۔؟ وہ تو کبھی کبھی یہ سوچا کرتا تھا کہ کوئی عورت اپنے آپ اسے گھیر لے، یوں اس کی پارسائی پہ بھی حرف نہ آئے اور اس کے خاص جذبات کا نکاس بھی ہو جائے۔ اب جب اس کے جملہ اسباب جمع ہو گئے تھے تو وہ یکا یک شدید بیزاری کی گرفت میں آ گیا تھا۔

آنے والے دنوں میں زوّار کا نجوئی سے برابر رابطہ رہا۔ دونوں پہلے کی طرح باتیں کرتے رہے لیکن اس فرق کے ساتھ کہ ان باتوں میں زوّار کی طرف سے محبت کی گفتگو سے عمداً گریز تھا؛ جو نجوئی کے لیے واضح پیغام تھا؛ جس پر وہ آخر سٹپٹا اٹھی اور دوٹوک انداز اختیار کیا تو زوّار نے بھی صراحت کے لیے موقع مناسب جانا:

دیکھو نجوئی! میں اس میدان کا فرد نہیں ہوں۔ میں نے تیرہ سال دن رات بھاری ریاضت میں صرف کیے ہیں لیکن اس دن کے بعد میں تین میں رہا ہوں نہ تیرہ میں! یہ پہلی بار ہو رہا ہے کہ میں مرشد کی خدمت میں حاضر ہونے کی جرأت نہیں کر پا رہا۔ مجھے لگتا ہے انھوں نے توجہ کے ساتھ سب معلوم کرلیا ہوگا۔ میں صفر ہو گیا ہوں۔ گھاس کے سوکھے ہوئے تنکے سے بھی زیادہ بے وقعت۔ بیک وقت مرشد کا مجرم ہوں اور آپ کا بھی۔ مجھے اس پیش قدمی پر سخت احساسِ گناہ ہو رہا ہے! میں راتوں کو سو نہیں سکتا، روتا رہتا ہوں!! مجھے معاف کردو! آپ کی خوب صورتی اور جذبے میں کوئی کمی نہیں! میں آپ کے قابل نہیں ہوں کہ تجرد کے ساتھ میری بیعت مشروط ہے۔ میں اپنا معاہدہ توڑ کر خود کو برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ آپ سے شادی کرسکتا ہوں، نہ شادی کے بغیر کوئی تعلق رکھ سکتا ہوں!!

نجوئی نے ساری صورت حال جان لی تو ماننے سے پہلے بلک بلک کر رونا ضروری سمجھا لیکن زوّار نے اب استقامت سے دستکشی کرکے غلطی نہیں کی۔ نجوئی نے بھی ردِعمل میں ہی سہی اپنی انا کا خوب تحفظ کیا اور اس سے مکمل کنارہ کشی اختیار کرلی۔ یہ اسی کا صلہ تھا کہ اب زوّار کو طمانیت کی بحالی محسوس ہونے لگی تھی اور وہ مرشد کی بارگاہ میں معمول کے مطابق جانے لگا تھا۔ ایک شام آستانے کی طرف جاتے ہوئے جب وہ کلمہ چوک سے گزر رہا تھا تو یہ سوچ کر اس کے لبوں پہ مسکان پھیل گئی:

اُس دِن ڈائیو اسٹیشن میں جو حسین لڑکیاں نظر آئی تھیں، نجوئی اُن میں سے کوئی ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا!!

وحیدہ نسیم

ایک بار استاد قمر جلالوی کی ہم عصر شاعرہ وحیدہ نسیم (جو غربت کی وجہ سے استاد کو کسی حد تک کمتر سمجھتی تھیں) نے طنزاً استاد سے کہا کہ قمر شاعر تو میں تمھیں تب مانوں جب تم مشاعرے میں ایک ہی شعر پڑھو اور محفل لوٹ لو۔ استاد نے چیلنج قبول کرلیا۔ کچھ ہی دنوں بعد ایک مشاعرہ ہوا جس میں یہ دونوں بھی مدعو تھے۔ وحیدہ نسیم اگلی صفوں میں بیٹھی تھیں۔

استاد کی باری آئی تو استاد نے مائیک پر کہا:

خواتین وحضرات! آج کسی کے چیلنج پر صرف ایک ہی شعر پڑھونگا آگے فیصلہ آپ لوگوں پر۔ یہ کہہ کر استاد نے پہلا مصرع پڑھا:

پوچھتا رہا ہوں نبض دکھا کر حکیم کو

(بڑی واہ واشاوا ہوئی)

استاد نے پہلا مصرع پھر مکرر کیا لوگوں نے کہا

''پھر کیا کیا ہوا استاد۔ آگے بتایئے''

اب استاد نے مکمل شعر پڑھا

پوچھتا رہا ہوں نبض دکھا کر حکیم کو
نسخے میں لکھ دیا ہے وحیدہ نسیم کو

زندہ آتما

ڈاکٹر ذاکر فیضی
(نئی دہلی)

مُنّا لال کی کشمکش جاری تھی۔

وہ گاؤں کی گلیاں پار کر چکا تھا، اب تیزی سے کھیتوں کی طرف جا رہا تھا۔ اُس کے دماغ میں دو مختلف طوفان چل رہے تھے۔ ایک طوفان کہہ رہا تھا 'مُنّا لال! تجھے اس اندھیری رات میں سیما سے ملنے نہیں جانا چاہئے، گنگا کنارے نامعلوم کیا حالات ہوں۔'

دوسری جانب اس کا دماغ اپنے اس خیال کی تردید کر رہا تھا۔ کہتا تھا:

'اُسے سیما سے ملنے ہر قیمت پر جانا ہی ہوگا۔۔۔ ایسا موقع پھر کبھی نہیں آئے گا۔'

وہ موبائل کی روشنی کے سہارے کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر بہت احتیاط سے قدم بڑھا رہا تھا۔ چاروں طرف خوفناک سناٹا تھا۔ دور ہائی وے پر جا رہے ٹرک و بسوں کا شور اور جھینگروں کی ملی جلی آوازیں ماحول کو پُر اسرار بنا رہی تھیں۔ مئی کے اس مہینے میں دور دور تک کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا، جس کی وجہ سے فضا میں عجیب سی منحوسیت پیر پھیلائے سُستا رہی تھی۔

وہ جیسے جیسے گنگا کے کنارے کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ اُس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔ اُس کے دل و دماغ پر خوف اور خواہش کی کشمکش جاری تھی۔ کشمکش کی اس کشتی میں وہ کبھی ڈوب رہا تھا، کبھی اُبھر رہا تھا۔ جب وہ ابھرتا تو اسے سیما کا حسن اور پُرکشش نشیب و فراز یاد آتے۔ وہ تخیل میں سیما کے نشیب میں اُترتا چلا جاتا اور فراز میں چڑھائی چڑھ رہا ہوتا۔ اُس کے قدموں میں تیزی آجاتی اور وہ جلد سے جلد سیما کو اپنی بانہوں میں بھر لینا چاہتا۔

مگر۔۔۔

وہ ابھی سیما کے نشیب میں پوری طرح اُترا بھی نہیں پاتا تھا کہ فضا میں پھیلتی سیما کے بدن کی خوشبو ہوا میں معدوم ہو جاتی اور چاروں طرف خدشات کا خوف پھڑ پھڑانے لگتا۔

وہ عادت کے مطابق خود سے ہم کلام ہو جاتا۔

''ندی پر کوئی مل گیا تو۔۔۔؟''

''بے وجہ کی باتیں نہ سوچ، بُزدل۔۔۔ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔''

''اگر کوئی وہاں کسی لاش کو دھرتی میں گاڑ رہا ہو اتب۔۔۔''

وہ خود کو تسلّی دیتا۔۔۔ ''گنگا کے اس کنارے پر صرف ہمارے گاؤں کی لاشیں ہی دبائی جا رہی ہیں۔۔۔ اور ہمارے گاؤں میں آج کسی کے مرنے کی خبر نہیں ہے۔''

اس کا دماغ کشمکش میں اُلجھا ہوا تھا۔

مُنّا لال 'لائف کیئر ہسپتال' میں گذشتہ چھ برسوں سے وارڈ بوائے کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ یہ ہسپتال گاؤں کو قصبے اور شہر سے جوڑنے والی بڑی سڑک پر واقع تھا۔ جب اس نے ہسپتال میں ملازمت شروع کی تھی وہ صرف بیس برس کا تھا۔ والدہ کی موت اس کے بچپن میں ہی ہو گئی تھی۔ بی۔ ایس۔ سی۔ کی تیسرے سال کی فیس جمع نہیں ہونے کی صورت میں پڑھائی جاری نہیں رکھ سکا اور نوکری کر لی۔ وہ اپنے والد کی پانچ اولادوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ اس کے دو بڑے بھائی کھیتی کرتے تھے۔ تیسرا بھائی قصبے کی دوکان میں اینٹ، لوہا اور سیمنٹ کی دُکان چلاتا تھا۔ بہن بھی خوش حال زندگی گزار رہی تھی۔

مُنّا لال کا آشیانہ گھر کے اس کمرے میں تھا جو گھر کے دروازے میں داخل ہوتے ہی واقع تھا اور باپ کی زندگی میں بیٹھک مانا جاتا تھا۔ گھر میں دونوں بھائیوں کا پریوار رہتا تھا۔ مُنّا لال کے والد بھی ایک سال پہلے دنیا چھوڑ کر جا چکے تھے۔ کھانا پینا زیادہ تر ہسپتال کی کینٹین یا باہر ڈھابے میں ہی کرتا تھا۔ کبھی کبھی رات کا کھانا بڑے بھائی کے گھر سے آجاتا۔ اب مُنّا لال چھبیس سال کا ہو چکا تھا۔ ابھی تک اُس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ گاؤں کے حساب سے اس کی شادی کی عمر نکل چکی تھی۔ اس کے تینوں بھائی چھ فُٹ سے زیادہ لمبے تھے۔ جبکہ مُنّا لال کا قد محض پانچ فٹ تھا۔ وہ اپنے بھائیوں کی طرح پُرکشش شخصیت کا مالک نہیں تھا۔ بچپن میں گاؤں کے لوگ اسے 'بُڑھاپے کی اولاد' کہتے تھے۔ اس کی اور بڑے بھائی کی عمر میں اکیس سال کا فرق تھا۔ حالانکہ مُنّا لال کا جسم گٹھیلا اور صحت مند تھا مگر اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو بھائیوں کے مقابلے کمتر محسوس کرتا تھا۔

ان دنوں اس کی زندگی ہسپتال اور گھر کے اس سیلن زدہ بیٹھک والے کمرے میں سمٹ کر رہ گئی تھی۔ تنہائی پسند تو وہ بچپن سے تھا۔ لوک ڈاؤن کے دنوں میں زیادہ ہو گیا۔ اس کا واحد ساتھی اس کا موبائل تھا۔ اس کے پاس ہمیشہ قیمتی اور نئے انداز کا موبائل رہتا تھا۔ اُس کے ہم عمر بھتیجوں کا کہنا تھا کہ مُنّا چاچا کمرے میں گندی فلمیں دیکھتے ہیں۔ بھائیوں کا ماننا تھا کہ مُنّا لال کلپنا کے سنسار کا واسی ہو چکا ہے۔ کئی بار اُس کو خود سے باتیں کرتے دیکھا گیا ہے۔

ہسپتال میں بھی اس کا ربط و ضبط بہت کم لوگوں سے تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ مگر اپنا کام بہت محنت اور ایمانداری سے انجام دیتا تھا۔ کینٹین میں بھی وہ زیادہ تنہا نظر آتا۔ ایک کونے میں چائے یا بیڑی پیتا ہوا آہستہ آہستہ زیرِ لب کچھ بڑبڑاتا رہتا۔

مُنّا لال کھیتوں کو پار کر چکا تھا۔ اب ایک چھوٹے سے جنگل کو پار کرنا تھا۔ رات کے اندھیرے میں اسے جنگل سے گزرنے میں گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ اس لئے اس نے طے کیا کہ وہ جنگل کو پار کرنے کے لیے لکڑی کی پُلیا سے آگے بڑھے۔ جس میں اسے پندرہ بیس منٹ زیادہ ضرور لگیں گے۔ مگر جانوروں کا خطرہ نہیں ہوگا۔ وہ خوف زدہ تو تھا مگر سیما سے ملنے کی لگن اسے غیر معمولی حوصلہ دے رہی تھی۔ وہ خوف اور بے خوفی کا پنڈولم بنا ہوا تھا۔ کش مکش کا یہ پنڈولم کبھی اسے گھر واپس لوٹنے پر اُکساتا اور کبھی سیما کو حاصل کرنے کا حوصلہ عطا کرتا۔ اس کے اُوپر سیما کا نشہ سوار تھا۔

''چہارسُو''

ہسپتال میں ڈاکٹر منیش تیواری کی کورونا کے مریضوں کا علاج کرتے ہوئے سال بھر پہلے موت ہوگئی تو ہسپتال کے منتظمین نے ان کہ بیوی سیما تیواری کو ہسپتال میں سپروائزر کی نوکری دے دی۔ سیما کی عمر تیس سال تھی۔ وہ بے حد حسین اور متناسب جسم کی عورت تھی۔ جو مرد بھی ایک بار دیکھتا، خواہش کا ایک تیر اپنے دل و دماغ میں پیوست پاتا۔ وہ اپنی پانچ سال کی بیٹی کے ساتھ ہسپتال کے قریب ایک قصبے میں رہتی تھیں۔ ڈاکٹر منیش اور سیما کسی دوسرے صوبے کے رہنے والے تھے۔ آس پاس گاؤں، قصبے میں ان کا کوئی رشتہ دار نہیں تھا۔ شوہر کے انتقال کے بعد وہ گھر میں اکیلی رہتی تھیں۔ سب ان کی بہت عزّت کرتے تھے۔ ہسپتال اور اُن کے پڑوس کے لوگ ان کی ملنساری سے بہت متاثر تھے۔ ان کے اکیلے پن اور خوش مزاجی کو دیکھ کر کئی مرد غلط فہمی کا شکار ہو جاتے تو وہ ان لوگوں کو کبھی پیار سے اور کبھی سختی سے سمجھا دیتی تھیں۔ اُس کا سارا ذہن اور وقت اپنی معصوم بیٹی کی پرورش میں لگا ہوا تھا۔ اس کے باوجود منّا لال سیما کا دیوانا ہو گیا۔ سیما کو جب اس بات کا علم ہوا تو زور سے ہنسی اور کہنے لگی۔۔۔ ''وہ چھوٹے سے قد کا منّا بھی۔۔۔؟'' وہ ہنسی میں اڑا دیتی تھی۔

جب پہلی بار اس نے سیما کو دیکھا تھا تو اُس پر ایک دم ہی فریفتہ ہو گیا تھا۔ خوابوں کی دُنیا کے اس باشندہ کو یقین تھا کہ ایک دن یہ حسین بیوہ اُس کی محبوبہ ضرور بنے گی۔ وہ تصوّر کی دنیا میں اڑتا رہتا۔ جہاں وہ سیما کو اپنی گرل فرینڈ مانتا تھا۔

منّا لال نے اپنی محبت کا ذکر کسی سے نہیں کیا تھا سوائے بابو کے۔

بابو ہسپتال میں صفائی ملازم تھا۔ وہ منّا لال کا جگری یار تھا۔ جس نے منّا لال کو چپکے چپکے سیما کو دیکھتے ہوئے بھانپ لیا تھا۔ ایک دِن بابو نے منّا لال کو سمجھایا۔

''سیما میڈم ڈاکٹر کی بیوی تھیں۔ تیرے ہاتھ نہیں آنے والی۔''

مگر منّا لال بولا۔۔۔ ''سیما مجھ سے پیار کرتی ہے۔ تب ہی تو مُجھ سے مُسکرا مُسکرا کر بات کرتی ہے۔''

بابو نے کہا۔ ''وہ تو سب سے ہنس بول لیتی ہیں۔ تو کیا نرالا ہے۔''

مگر منّا لال نہیں مانا اور بولا۔۔۔ ''سب کی بات اور ہے بھائی۔ وہ مجھ سے واقعی پیار کرتی ہیں۔ تو نہیں سمجھ سکتا۔ یہ صرف میرے اور اُس کے بیچ کی بات ہے، پیارے۔'' منّا لال نے اِس انداز سے کہا کہ بابو خاموش ہو گیا۔

رات۔ وہ بھی اندھیری رات اور صرف موبائل کی روشنی۔۔۔

اُس کے قدم پھر رُک گئے۔۔۔ وہ بڑبڑایا۔۔۔ ''سوچ لے۔۔۔ اب بھی واپس لوٹ سکتا ہے۔۔۔''

''نہیں۔۔۔'' اُس نے خود سے پُرعزم لہجے میں کہا۔۔۔ ٹھٹھکتے قدم پھر آگے بڑھنے لگے۔۔۔ سیما کا خوب صورت جسم اُس کی آنکھوں میں لہرانے لگا۔ وہ ایک بار پھر سیما کے نشیب و فراز میں اُلجھتا ہوا آگے بڑھا۔

اب اسے لکڑی کی پُلیا سے گزرنا تھا۔ اچانک اُسے خیال گُزرا۔۔۔ گنگا کنارے سینکڑوں لاشیں دفن کی گئیں ہیں۔ کیا کسی کی آتما تو وہاں نہیں ہوگی۔۔۔ اس کے سارے جسم میں جھرجھُری پیدا ہوگئی۔

اُس نے اپنے دل کو سمجھایا: ''تو کب سے آتماؤں کو ماننے لگا۔۔۔ جانے کتنی بار جب بھی کسی سے آتما کے تعلق سے بحث ہوئی تو، تُو نے یہی کہا کہ آتما۔۔۔ واتما کچھ نہیں ہوتی۔۔۔ آدمی ختم۔۔۔ سب کُچھ ختم۔۔۔''

جنگل پار کرنے کے لیے لکڑی کی پُلیا سے نیچے اُترتے ہوئے اچانک اس کی نظر سامنے گئی جہاں چاند کی آدھی ادھوری روشنی میں اسے کُچھ نظر آیا۔۔۔ وہ لرز کر رہ گیا۔ اُس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔۔۔ اُسے لگا جیسے کوئی چُڑیل زمین پر لیٹی ہوئی ہے۔ وہ اپنا تمام حوصلہ سمیٹ کر آگے بڑھا۔ اُس نے غور کیا تو پایا کہ چھوٹی سی ناؤ اُلٹی پڑی ہوئی تھی۔ جس کے دونوں چپّو دائیں بائیں ایسے پڑے تھے، جیسے کوئی چڑیل پیٹ کے بل لیٹی ہوئی ہے۔

اب گنگا کا کنارہ زیادہ دور نہیں تھا، جہاں سیما اُس کی منتظر تھی۔ وہ بہت سنبھل سنبھل کر چل رہا تھا کیونکہ ریت میں سینکڑوں لاشیں دبی ہوئی تھیں۔۔۔ اُس کا ڈر تھوڑا کم ہونے لگا تھا۔ اُس کے ماتھے پر پسینہ ضرور تھا، مگر سیما سے ملنے کا جوش و خروش اپنے شباب پر تھا۔ منّا لال اب چاروں طرف بہت غور سے دیکھ رہا تھا، جیسے کُچھ پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ ایک درخت کو پہچان کر تیزی سے اُس طرف بڑھنے لگا۔ چالیس پچاس قدم چلنے کے بعد وہ پیڑ کے نزدیک پہنچا۔ یہاں اندھیرا زیادہ تھا۔ وہ بہت احتیاط سے قدم بڑھاتا ہوا پیڑ کی چوڑی جڑ کی پیچھے والے حصّے کی طرف گیا۔ وہ نیچے جھکا۔ پیڑ کی جڑ میں کچھ ٹٹولنے لگا۔ تھوڑی دیر کی جستجو کے بعد اُسے بوری ملی۔ جس کو اُس نے گھسیٹا اور واپس اس طرف چلنے لگا۔ جہاں بہت سارے مُردے دفن تھے۔

اب اُس کے ایک ہاتھ میں موبائل تھا اور دوسرے ہاتھ میں بوری تھی جسے وہ گھسیٹتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ موبائل کی روشنی میں وہ ایک ایک قبر کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر کی جستجو کے بعد وہ ایک قبر پر رُک گیا، جس پر پلاسٹک کے پھولوں کا گلدستہ رکھا ہوا تھا۔

چند لمحے وہ چاروں طرف دیکھتا رہا جیسے، جائزہ لے رہا ہو، کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا۔ پھر اُس نے بوری سے پھاوڑا نکالا۔ بوری کو ایک طرف اُچھال کر، بنا کسی دیری کے پھاوڑے کو سر سے اوپر اٹھا کر پوری طاقت سے سیما کی قبر پر وار کیا۔

ایک جھماکے کے ساتھ رات کے دس بجے کے وقت میں سات گھنٹے پہلے کا حادثہ مکمّل منّا لال کی آنکھوں کے سامنے روشن ہو گیا۔

منّا لال آج صبح آٹھ بجے ہی ہسپتال پہنچ گیا تھا۔ ان دنوں ہسپتال میں بہت بھیڑ رہتی تھی۔ کورونا کے مریضوں کا تانتا لگا ہوا تھا۔ صفائی ملازمین ہوں یا نرسیں، وارڈ بوائے ہوں یا سینئر و جونیئر ڈاکٹر، سب سولہ سولہ گھنٹے کام کر رہے تھے۔ ہر وارڈ میں مریضوں کی کراہٹیں تھیں تو ریسپشن کاؤنٹر پر تیمارداروں، رشتہ داروں کا شور و غل۔ افراتفری کا عالم تھا۔ لوگ برابر اپنے مریضوں کو لا رہے تھے۔

دوپہر دو بجے سے اوپر کا وقت تھا۔ منّا لال ہسپتال کے باہر ایک ڈھابے پر کھانا کھا کر بیڑی پی رہا تھا۔ تب ہی بابو دوڑتا ہوا آیا اور بولا۔۔۔ ''سیما

میڈم کے سر پر چوٹ آئی ہے۔۔۔بلیڈنگ ہو رہی ہے۔۔۔''

یہ سُن کر مُنّا لال تیزی سے ہسپتال کی طرف بھاگا۔

آدھے گھنٹے پہلے ہسپتال کے ایک ڈاکٹر سے کسی مریض کے تیماردار کا جھگڑا ہو گیا تھا۔ معاملہ یہ تھا کہ ہسپتال میں آکسیجن نہیں تھی۔ مریض کو آکسیجن کی ضرورت تھی۔ مریض کے بیٹے سے آکسیجن لانے کو کہا گیا۔ بیٹا دوسرے دن، چھوٹا سلنڈر ہاتھ میں لیے واپس آیا تب ہسپتال والوں نے بتایا کہ آپ کے مریض کی موت ہو چکی ہے۔

ریسپشن پر مریض کے بیٹے اور اس کے دوست ورشتے داروں نے ہنگامہ شروع کر دیا۔ فوراً ہی ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ مرنے والے کے رشتے داروں اور دوستوں سے ڈاکٹر اور اِسٹاف کی بحث شروع ہو گئی۔

ڈاکٹروں نے بہت سمجھانے کی کوشش کی۔ اسٹاف نے صفائی دینی چاہی مگر وہ لوگ بات چیت سے گالیوں پر اُتر آئے۔ ہسپتال کے منتظمین نے سیکیورٹی کو بلا لیا۔ ہاتھا پائی شروع ہو گئی۔ اسی درمیان مریض کے بیٹے نے وہ سیلنڈر جو مریض کے لیے لایا گیا تھا اٹھا کر ڈاکٹر کی جانب اُچھال دیا اور گالیاں بکتا ہوا بولا:

''ابے۔۔۔تو چار لاکھ روپے ڈکارنے کے بعد میرے پاپا کی لاش مجھے دے رہا ہے۔۔۔اس سلنڈر کا اب کیا کروں۔۔۔لے یہ بھی اپنی۔۔۔گھسیڑ لے۔۔۔''

ڈاکٹر سیلنڈر سے بچنے کے لیے پیچھے ہٹا تو پیچھے کھڑی سیما ڈاکٹر سے بچنے کے لیے لڑکھڑائی اور اپنا بیلنس سنبھالنے کی کوشش میں برابر والی سیڑھیوں پر گری۔ سات سیڑھیاں گرنے کے بعد اس کا سر دیوار سے ٹکرایا۔

ڈریسنگ روم میں اُس کی حالت بگڑنے پر ایمرجنسی وارڈ میں لے جایا گیا۔۔۔ جہاں اسے آکسیجن کی ضرورت تھی۔۔۔مگر ہسپتال میں آکسیجن سلینڈر نہیں ملا۔ وہ سیلنڈر جو مرنے والے کا بیٹا ڈاکٹر کے اُوپر پھینک کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ فرار ہو گیا تھا، وہ سیلنڈر بھی اس افراتفری میں کسی نے غائب کر دیا۔

سیما کی موت ہو گئی۔ ہسپتال کے منتظمین کے کہنے پر اسے اُسی حالت میں سفید کپڑے میں لپیٹ کر گنگا کنارے دبا دیا گیا۔

جس وقت مُنّا لال اور تین چار ہسپتال کے ملازم سیما کی لاش کو گنگا کنارے پر دبانے کے لیے لے جا رہے تھے تو ہسپتال کے گیٹ پر کسی چینل کا رپورٹر اپنے چینل کو اطلاع دے رہا تھا:

''لائف کیئر ہسپتال کی سُپر وائزر اور کورونا سے مر چکے ڈاکٹر منیش تیواری کی بیوی کی کورونا سے موت ہو گئی ہے۔''

مُنّا لال اور ہسپتال کے دوسرے ملازم گنگا گھاٹ پر پہنچے تو ایک اور رپورٹر اپنے چینل کے نیوز روم میں بیٹھے اینکر سے کہہ رہا تھا:

''سوچنے والی بات یہ ہے کہ بنا اگنی دیے، کسی مُردے کا اَنتم سنسکار کیسے ہو سکتا ہے؟ اگر ہاں تو کیا اس کی آتما کو شانتی ملتی ہے یا نہیں۔۔۔کیا مرتکوں کی آتما مُکتی پراپت کر پاتی ہے؟ اس سلسلے میں بات کرنے کے لیے ہمارے ساتھ ہیں۔۔۔آچارئے۔۔۔''

مُنّا لال نے گردن گھُما کر بہت غور سے رپورٹر کی طرف دیکھا اور کسی فکر میں ڈوب گیا۔

گنگا کنارے پر ہزاروں لاشیں دفن تھیں۔ وہیں ایک مقام پر سیما کو تین فُٹ گڈھے کے نیچے گاڑ دیا گیا۔ مُنّا لال نے ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے اپنے ساتھیوں کو واپس بھیج دیا اور خود اس کی قبر پر پہچان کے لیے پلاسٹک کے پھول کا گلدستہ رکھ دیا اور قبر کھودنے والے پھاوڑے کو بوری میں بند کر کے ایک پیڑ کی جڑ میں چھپا دیا۔

مُنّا لال گڈھا پوری طرح کھود چکا تھا اور اب وہ سیما کی لاش کو گڈھے سے باہر کھینچ رہا تھا۔

جب وہ لاش کو باہر نکال چکا تو زمین پر بیٹھ گیا اور ماتھے کا پسینہ پونچھنے لگا۔۔۔اسی درمیان وہ چاروں طرف نگاہیں بھی دوڑاتا جا رہا تھا۔

اس نے اپنی سانسوں کو درست کیا اور بولا۔۔۔''میری سیما، میری جان، میں تُم سے بہت محبت کرتا ہوں۔۔۔پریشان مت ہو، میں تمہیں۔۔۔'' وہ سیما کی لاش پر جھکنے ہی والا تھا کہ۔۔۔دور سے آ رہی کتّوں کے بھونکنے کی آواز بالکل نزدیک آ گئی۔ اسے پتہ ہی نہیں چلا کے تین چار کتّوں نے اسے گھیر لیا ہے اور اس پر زور زور سے لگاتار بھونکے جا رہے ہیں۔ وہ میدان چھوڑ کر بھاگنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے مورچا سنبھالتے ہوئے چاروں طرف گھوم گھوم کر آس پاس پڑی اینٹوں کو اُٹھا کر کتّوں کو مارنا شروع کر دیا۔ مگر کُتّوں کا حملہ زبردست تھا۔ کتّوں نے اپنا گھیرا تنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔ مُنّا لال کو لگا۔۔۔بھاگو۔۔۔جان بچی تو۔۔۔پھر کبھی۔۔۔وہ گاؤں کی طرف دوڑا۔

منا لال کھیتوں کو پار کر چکا تھا۔ اب تیزی سے گلیوں سے نکلتا ہوا گھر کی طرف دوڑ رہا تھا۔ اُس کے دماغ میں اب بھی دو مختلف طوفان چل رہے تھے۔

کبھی وہ سوچتا۔۔۔کتّے سیما کے جسم کو نوچ نوچ رہے ہوں گے؟

کبھی خیال آتا۔۔۔وہ سیما کے جسم کی حفاظت کر رہے ہوں گے؟

منّا لال کی کشمکش جاری تھی۔۔۔!!!

مقابلہ

دنیا کے بہترین اردو بولنے والوں میں مقابلہ تھا۔

سوال نہایت ہی مشکل پوچھا گیا تھا:

سکون، اطمینان، خوشی، خاموشی اور ذہنی یکسوئی کو زیادہ سے زیادہ پانچ الفاظ کے جملے میں بیان کریں۔

مقابلہ جیتنے والے کا جواب تھا:

''میری بیوی سو رہی ہے''

نئی صدی کا کربلا

ڈاکٹر صوفیہ شیریں
(کلکتہ)

جوڈی کے پپوٹوں کے نیچے آنکھ کی پتلیاں تیزی سے حرکت کررہی تھیں۔اس کے چہرے کا زاویہ بگڑ رہا تھا۔وہ پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔ دھیرے دھیرے اس کی بے چینی میں اضافہ ہوتا گیا۔پتلیوں کی بے چینیاں پورے جسم میں پھیل گئیں۔

''نہیں نہیں! میں نے کچھ نہیں کیا۔یقین کرو میرا۔مجھے جو کہا گیا میں نے وہی کیا۔اس میں میرا کیا قصور؟''

وہ چیختے ہوئے اٹھ بیٹھا۔اس کی چیخ سے ہڈاسا بھی گھبرا کر اٹھ گئی۔ خوف سے جوڈی کا سارا وجود لرز رہا تھا۔آنکھیں بھی پھٹی پڑی تھیں۔شب خوابی کا لباس پسینے سے بھیگ چکا تھا۔

''پیارے جوڈی! کیا ہوا؟ کیا تم نے پھر وہی خواب دیکھا؟ بھول جاؤ جو کچھ ہوا ڈیئر۔''

ہڈاسا نے اسے سینے سے بھینچ لیا اور اس کی پیٹھ سہلانے لگی۔ دھیرے دھیرے وہ نارمل ہونے لگا۔

''میں چینج کر لیتا ہوں۔''

وہ اٹھ کر لڑکھڑاتے قدموں سے واش روم کی طرف بڑھا۔ہڈاسا بھی اٹھی اور دوسرا نائٹ گون نکال کر اسے دیا۔تھوڑی دیر میں وہ واپس آ گیا۔اس کی حالت قدرے بہتر تھی۔اس نے دراز کھول کر نیند کی گولیاں نکالیں۔ہڈاسا نے فوراً ٹوکا۔

''انہیں مت کھاؤ جوڈی۔حد سے زیادہ سلیپنگ پلز کھانا موت کو دعوت دینا ہے۔اپنی حالت کو دیکھو۔کتنے کمزور ہو گئے ہو؟''

''نہ کھاؤں تو کیا کروں؟ وہ مجھے چین سے سونے نہیں دیں گے اور اگر آج بھی میں نہ سویا تو پاگل ہو جاؤں گا۔پلیز مجھے سونے دو۔

جوڈی نے گولی منہ میں ڈالی اور غٹاغٹ پانی کا گلاس خالی کر بستر پر دراز ہو گیا۔ہڈاسا اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی جب تک کہ وہ سو نہ گیا۔وہ دو مہینے قبل ہی واپس آیا تھا۔جب سے آیا تھا، ہر رات ایک ہی طرح کے خواب دیکھ کر گھبرا کر اٹھنا اس کا معمول بن چکا تھا۔نیند کی گولیاں نہیں کھاتا تو دوبارہ نیند بھی نہیں آتی۔دن بھر بت کی طرح خاموش بیٹھا نہ جانے کیا سوچتا رہتا۔اس کا ہر عمل میکانیکی ہو گیا تھا جیسے بے روح کا جسم ہو۔

''کل جوڈی کو ڈاکٹر کے پاس ضرور لے جاؤں گی۔''

اسی ارادے کے ساتھ وہ بھی سو گئی۔صبح سویرے اٹھ کر اس نے جوڈی کی پسند کا ناشتہ بنایا اور چائے کا کپ تھامے بالکنی سے باہر کا نظارہ کرنے لگی۔چائے کی ہر چسکی کے ساتھ اس کا ذہن ماضی کے اوراق پلٹنے لگا۔چند سالوں پہلے جوڈی سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ملاقات محبت اور محبت شادی میں بدل گئی۔شادی والے دن جوڈی نے دوزانو بیٹھ کر سبھوں کی موجودگی میں اس کا خیال رکھنے اور خوش رکھنے کا وعدہ کیا تھا۔دونوں کی ماؤں نے پلیٹ توڑ کر ان کو سدا کے لئے ایک رہنے کی دعائیں دی تھیں۔ہڈاسا نے جوڈی کے گرد سات چکر لگائے۔یہ شادی کی وہ رسم تھی جس کے ذریعہ میاں بیوی کے درمیان کی تمام رکاوٹیں اور دیواریں گر جاتی ہیں۔دونوں نے گلاس توڑ کر اپنے رشتے کے معاہدے کو مضبوط کیا ور ایک دوسرے کو انگوٹھیاں پہنائیں۔شادی کی تمام رسمیں اور قسمیں ہڈاسا کو ایسے یاد تھیں جیسے یہ کل ہی کی بات ہو۔وہ ماضی کی حسین وادیوں میں محو خرام تھی کہ اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ محسوس کر پلٹی اور جوڈی پر نظر پڑتے ہی اس سے لپٹ گئی۔

''اٹھ گئے ڈیئر؟ امید ہے کہ بہتر محسوس کر رہے ہوگے۔چلو جلدی کرو، میں نے ناشتہ میں تمہارا من پسند شکشولا بنایا ہے۔''

اس نے چہکتے ہوئے جوڈی کی پیشانی کا بوسہ لیا۔اس کا چہرہ زرد پڑ رہا تھا۔تمام رونقیں اور شادابیاں ان قیامت خیز مناظر کی نذر ہو گئیں تھیں، جن کے درمیان وہ رہ کر آیا تھا۔ہڈاسا نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔جہاں عجیب قسم کی وحشت کا بسیرا تھا۔اس وحشت کو محسوس کر اس کی ہڈیوں میں بھی سہرن دوڑ گئی۔وہ بنا کوئی تاثر دئے فریش ہونے چلا گیا۔

''تم وہ جوڈی نہیں ہو میری جان جو چند مہینوں پہلے مجھ سے الگ ہوا تھا۔تمہیں کیا ضرورت تھی وہاں جانے کی؟ نہ تم جاتے نہ تمہاری یہ حالت ہوتی۔ خوشیوں اور امنگوں سے بھری تمہاری شخصیت نہ جانے کس آگ میں جھلس گئی۔ نیست و نابود ہو جائیں وہ لوگ جو تم جیسے نوجوانوں کی زندگیوں کو آگ اور خون کے حوالے کر دیتے ہیں۔جن کی ہوس اور تکبر نے ہماری ہنستی کھیلتی زندگی کو جہنم بنا دیا۔''

وہ سوچنا چھوڑ کر جلدی سے شکشولہ گرم کرنے لگی اسے محسوس ہو گیا تھا۔ کہ جوڈی واش روم سے نکلنے ہی والا ہے۔کچھ ہی لمحوں میں وہ ڈائننگ ٹیبل پر آمنے سامنے بیٹھے ناشتہ نوش فرما رہے تھے۔ہڈاسا چہک چہک کر اس سے باتیں کر رہی تھی تا کہ کچھ دیر کو ہی سہی اس کا من بہل جائے۔ناشتہ ختم ہوتے ہی اس نے پوچھا:

''چلو آج تمہارے سائیکالوجسٹ سے مل لیں۔''

''کیوں؟ کیا ضرورت ہے؟'' جوڈی نے سپاٹ، لہجے میں جواب دیا۔

''اگر یہی حالات رہے تو تم ڈپریشن کا شکار ہو جاؤ گے۔اعصابی نظام بھی متاثر ہوگا۔'' اس نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''میری تکلیف کا علاج ماہر نفسیات کے پاس نہیں۔انہوں نے کتنی کوششیں کیں کہ مجھے ان خوابوں سے نجات ملے، پر کیا نتیجہ نکلا؟ دراصل کسی ڈاکٹر

کے پاس ایسی کوئی دوانہیں جوضمیر کوسلا دے۔احساسات وجذبات کا گلا گھونٹ دے۔جب تک میرا ضمیر جاگتا رہے گا، میں چین سے نہیں سو پاؤں گا''

جوڈی اس کی گود میں سر رکھ کر پھوٹ پڑا۔ ہڈاسا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسے ایک معصوم بچے کی طرح اپنی گود میں چھپالے۔اس کی آنکھوں سے وہ وحشت ناک خواب چرا کر پریوں اور چاند ستاروں کے خواب بھر دے۔روشن مستقبل کے خواب بھر دے،لیکن وہ بے بس تھی۔

''تم ان چند دنوں کو اپنی زندگی سے نکال کیوں نہیں دیتے؟ پلیز!جو کچھ دیکھا ہے فراموش کر دو۔کبھی کبھی روشن مستقبل کیلئے سیاہ ماضی کو بھولنا پڑتا ہے مائی ڈیئر۔''

ہڈاسا نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

''بھولنا تو میں بھی چاہتا ہوں لیکن لہو میں لت پت ان لاشوں کا کیا کروں جو مجھ سے سوال کرتے ہیں۔''

''تمہیں تو پتہ ہی تھا کہ یہ سب بھی ہوسکتا ہے۔تم نے اپنی مرضی سے یہ راستہ چنا تھا۔''

''ہاں چنا تھا مگر مجھے دھوکا ہوا۔میں سمجھتا رہا کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں یا کرنے جا رہا ہوں وہ اپنی قوم کے تحفظ کیلئے ہے۔ہماری بقا اسی میں ہے۔مجھے پتہ نہیں چلا کب میں سپاہی سے غلام اور غلام سے ایک جنگی ہتھیار بن گیا۔ہم انسانوں نے اپنے مفاد کیلئے پہاڑ کاٹے جنگل کاٹے،اب سر کاٹ رہے ہیں۔ بڑی طاقتوں کا یہی ماننا ہے کہ جو سر جھکے گا نہیں کاٹ دیا جائے گا۔لیکن میں نے دیکھا ہے۔ان کی آنکھوں میں موت کا ذرا بھی خوف نہیں تھا۔ان کے بوڑھے بچے ہم سے آنکھ ملا کر بات کرتے ہیں۔ہنستے ہنستے موت کو گلے لگاتے ہیں جیسے موت نہ ہو کوئی انعام ہو۔''

''ڈیئر!اتنا مت سوچو۔محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔''

ہڈاسا نے ایسا کہہ کر اس کے دل کا بوجھ کم کرنے کی کوشش کی۔

''نہیں!یہ جنگ نہیں ہے۔جنگ برابر والوں میں ہوتی ہے۔ہم نے انھیں محصور کر کے جنگ کیلئے مجبور کیا ہے۔انہوں نے ہمیں پناہ دی اور ہم نے ان کی زمینوں پر غاصبانہ قبضہ کر لیا۔ان کی زمینوں کو ان کے ہی لہو سے رنگ دیا۔ بھلے ہی دنیا کی بڑی طاقتیں ہمارے ساتھ ہوں لیکن غمزدہ دلوں کی دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔تاریخ میں جب ہماری داستان لکھی جائے گی تو وہ شہید اور ہم قاتل کہلائیں گے کیونکہ ہم نے کئی نہتوں پر وار کیا ہے۔ایئر اسٹرائک کر کے ان کی رہائشی عمارتیں ایک پل میں ڈھا دی ہیں۔آج بھی ان کے بچوں کے اعضاء ان ملبوں میں دفن ہیں۔ہم نے ان کے معصوم بچوں تک کو نہیں بخشا۔بڑا خوفناک ہوتا ہے وہ منظر جب ان بچوں کے خون میں ڈوبی لاشیں خواب میں آکر مجھ سے پوچھتی ہیں۔

''دنیا کے کس قوم کے بچے دہشت گرد ہوتے ہیں؟ تم نے ہمیں کیوں مارا؟ ہم تو انتظار کر رہے تھے کہ حالات بدل جائیں اور ہم پھر سے اسکول جائیں،پارک جائیں،کھیلیں کودیں اپنے دوستوں سے ملیں۔لیکن تم نے ہمیں موت کی آغوش میں سلا دیا' ہڈاسا یہ خواب نہیں آسیب ہیں جو کبھی میرا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔''

جوڈی زاروقطار روئے جا رہا تھا اور اپنے دل کا غبار نکال رہا تھا کہ شاید اعترافِ جرم سے ہی کچھ سکون ملے،پر اب شاید ہڈاسا چین سے نہ سو پائے کیوں کہ اس کا ضمیر جاگ چکا تھا۔''

توبتہ النصوح

اب سے دُور ایک سال دہلی میں ہیضے کا اتنا زور ہوا کہ ایک حکیم بقا کے کوچے سے ہر روز تیس تیس چالیس چالیس آدمی چھیجنے لگے۔ایک بازار موت تو البتہ گرم تھا ورنہ جہاں جاؤ سناٹا اور ویرانی۔جس طرف نگاہ کرو وحشت و پریشانی۔جن بازاروں میں آدھی آدھی رات تک کھوے سے کھوا چھلتا تھا ایسے اجڑے پڑے تھے کہ دن دوپہر جاتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا تھا۔کٹوروں کی جھنکار موقوف،سودے والوں کی پکار بند۔ملنا جلنا،اختلاط و ملاقات،آمد و شد،بیمار پرسی و عیادت،بازدید و زیارت،مہمانداری و ضیافت کل رسمیں لوگوں نے اٹھا دیں،ہر شخص اپنی حالت میں مبتلا،مصیبت میں گرفتار۔زندگی سے مایوس،کہنے کو زندہ پر مردہ سے بدتر۔دل میں ہمت نہ ہاتھ پاؤں میں سکت۔یا تو گھر میں اٹوانٹی کھٹوانٹی لے کر پڑ رہا،یا کسی بیمار کی تیمارداری کی،یا کسی یار آشنا کا مرنا یاد کر کے کچھ رو پیٹ لیا۔مرگ مفاجات حقیقت میں ان ہی دنوں کی موت تھی۔نہ شان نہ گمان،اچھے خاصے چلتے پھرتے یکایک طبیعت نے مالش کی،پہلی ہی کلی میں حواس خمسہ مختل ہو گئے۔الا ماشا اللہ کوئی جزئی بچ گیا تو بچ گیا ورنہ جی کا متلانا اور قضائے مبرم کا آجانا۔پھر وصیت کرنے تک کی مہلت نہ تھی۔ایک پاؤ گھنٹے میں تو بیماری،دوا،دعا،جانکنی اور مرنا سب ہو چکتا تھا۔غرض کچھ اس طرح کی عالمگیر وبا تھی کہ گھر گھر اس کا رونا پڑا تھا۔دو پونے دو مہینے کے قریب وہ آفت شہر میں رہی مگر اتنے ہی دنوں میں شہر کچھ ادھیا سا ہو گیا۔صدہا عورتیں بیوہ ہو گئیں،ہزاروں بچے یتیم بن گئے۔جس سے پوچھو شکایت جس سے سنو فریاد۔

نئی کھڑکی

رعنا کوثر
(نیویارک)

کسی گھر کے کونے میں ایک کھڑکی ہو جہاں سے ٹھنڈی ہوا بھی آئے اور قدرت کے نظارے بھی ہوں تو وہ کھڑکی مکین کو بہت عزیز ہو جاتی ہے۔

مدیحہ کے باورچی خانہ میں بھی کھڑکی کا رخ اتنا اچھا تھا کہ جو بھی وہاں جاتا ایک نظر باہر ضرور دیکھتا اور خوش ہوتا۔ یہ کھڑکی پیچھے کے لان میں کھلتی تھی جو تھا تو چھوٹا سا مگر باورچی خانے کا دروازہ کھول کر وہاں آسانی سے جایا جا سکتا تھا۔ لکڑی کے فرش کو مدیحہ نے سرخ رنگ کروایا تھا اور اُس پر رکھے پودے اچھے لگتے۔ ایک طرف ہری گھاس تھی۔ گیندے کے پھول دوسری طرف لگے تھے۔ اسے باغبانی زیادہ آتی نہیں تھی یہ شوق بھی اسے مس جونز نے دلوایا تھا۔ اصل بہار تو ان کے لان کی تھی جو اُس کے گھر سے ملحق تھا۔ وہاں موسم بہار آتے ہی پھول پودے خوب بہار دکھاتے۔ سب سے خوبصورت وہ حصہ تھا جہاں سفید اور سرخ گلاب کثرت سے آتے۔ بڑے بڑے پھولوں سے درخت بھر جاتے اور اس کے گھر کی طرف جھک کر اپنی خوبصورتی کا احساس دلاتے۔ یوں جیسے کوئی معصوم بچی اپنے گھر سے چپکے چپکے آپ کے گھر میں جھانک رہی ہو۔

مدیحہ اس گھر میں بیس سال سے رہ رہی تھی۔ یہاں آنے کے بعد سب سے پہلی ملاقات مس جونز سے ہوئی تھی۔ وہ برابر والے گھر میں رہتی تھیں۔ گرمیوں میں جب وہ باہر لان میں آتیں تو ان سے زیادہ بات چیت ہوتی۔ وہ پھول پودوں کی شوقین تھیں اس لیے مالی ضرور آتا اور پودے لگاتا۔ وہ خود جوڑوں کے درد میں مبتلا ہو کر وہیل چیئر پہ آ چکی تھیں مگر سارے کام اپنی نگرانی میں کروانا پسند کرتیں ان کے کوئی اولاد نہ تھی۔ میاں کا بھی انتقال ہو گیا تھا مگر بہت زندہ دل ہر وقت گھر سجا رہتا۔

مدیحہ ان کا خیال رکھتیں۔ وہ اسّی سال کی ہونے کو آئیں تھیں۔ کانوں سے بھی اونچا سنتیں۔ مس جونز کے برابر والا گھر مس ماؤ کا تھا وہ چائنیز تھیں۔ وہ تقریباً پچاس پچپن کی تھیں ہر طرح کی سبزیاں لگانے میں ماہر تھیں۔ مدیحہ ان کی محنت دیکھ کر حیران رہ جاتی۔ کبھی بڑا سا لکڑی کا منڈپ بن رہا ہے۔ اس پر ککڑی اور لوکی کی بیل چڑھا رہی ہیں۔ کبھی گھاس کاٹ رہی ہیں کبھی مٹی ڈالی جا رہی ہے۔ جیسے جیسے موسم گرما آتا ان کا باغ سبزیوں سے بھر جاتا جس کو مس ماؤ ایک ٹوکری میں رکھ کر اس کے گھر بھی بھیج دیتیں۔ یہ اجنبی دیس کی اجنبی عورتیں اُس کی دوست تھیں، پڑوسی تھیں۔

مدیحہ کو یاد تھا کہ جب اس نے امریکہ کی سرزمین پر قدم رکھا تو اس تبدیلی پر وہ بہت گھبرائی تھی۔ اس کی ماں، بہن بھائی دوست سب وہیں رہ گئے تھے بہت دل گھبرایا۔ وقاص کے پیدا ہونے کے بعد دل بہل گیا۔ اس کی تعلیم و تربیت پہ توجہ رہی پھر کرن پیدا ہوئی تو سب بھول گئی۔ جب وقاص آٹھ سال کا اور کرن چار سال کی تھی تو انہوں نے ایک خاموش علاقے میں ایک چھوٹا سا گھر خرید لیا۔ اچھا صاف ستھرا محلّہ تھا گھر سے گھر ملے تھے۔ وقاص اور کرن اسی گھر میں بڑے ہوئے۔ مدیحہ نے کبھی نوکری تو نہیں کی مگر کبھی ضرورتاً کہیں جانا ہوتا تو مس جونز جو اُس وقت ساٹھ باسٹھ کی صحت مند عورت تھیں بچوں کو اپنے پاس بیٹھا لیتیں کھلاتی پلاتیں۔ اب دونوں بچے بڑے ہو گئے تھے۔ دوسرے شہروں میں جا بسے تھے۔ مدیحہ اور ان کے میاں علیم اکیلے رہ گئے تھے۔ مدیحہ بہت بور ہوتیں علیم صاحب تو اپنے کام پر چلے جاتے۔

اچانک وقت نے ایک ایسی کروٹ لی کہ دنیا ہی بدلی ہوئی محسوس ہوئی۔ گھروں سے عام فون رکھنے کا رواج ختم ہوا اور جدید فون آ گئے کیا بات ہے اس فون کی۔ مدیحہ خوشی سے ہاتھ میں پکڑے سرخ رنگ کے کیس میں جکڑا سیل فون دیکھ رہی تھی جو آج ہی ان کے بیٹے وقاص نے مدرڈے کا تحفہ دیا تھا اور تمام باتیں بھی سمجھا دی تھیں۔ وہ ماں کے ساتھ بیٹھا انہیں ہر بات بتلا رہا تھا

''مما یہ بٹن آپ کے واٹس ایپ کا ہے، اس میں آپ اپنی سہیلیوں سے دنیا بھر میں باتیں کر سکتی ہیں'' وقاص بولا۔ اچھا انہوں نے فون پر ہاتھ یوں پھیرا جیسے کسی سہیلی سے ہاتھ ملا رہی ہوں۔ اور مما آپ دن بھر بغیر فون کیے لکھ کر بھی ان سے بات کر سکتی ہیں۔ وقاص نے انہیں بتایا۔

''واہ'' وہ بے ساختہ بولیں۔

اور مما یہ ''فیس بک'' ہے آپ اپنی تصویریں اس میں ڈالیں اور اپنی دوستوں خاندان والوں اور سب کو حالاتِ حاضرہ کی سیر کرائیں۔ وقاص بولا۔ وہ کیسے انہوں نے پوچھا۔ وقاص نے اُن کی اور اپنی تصویر کھینچی اور اپنے فیس بک پر بھیج کر انہیں دکھائی۔ سب کو پتہ چل گیا۔ آپ کا بیٹا آپ کے ساتھ بیٹھا ہے وہ ہنس کر بولا۔ ''مما آج کے لیے اتنا ہی سبق کافی ہے۔'' وقاص نے کہا۔ یہ سیکھ لیں پھر اور کچھ بتاؤں گا۔

مدیحہ کی بوریت دور ہو چکی تھی۔ اب تو وہ تھیں اور ان کا فون۔ اب تو دور رہنے والے تمام دوست رابطے میں آ چکے تھے۔ پاکستان میں روز بہن بھائی سے بات ہوتی۔ یہ تک پتہ تھا کس کے گھر میں کیا پک رہا ہے۔

آہستہ آہستہ دنیا سمٹتی رہی۔ ستاروں پہ کمند ڈالنے والا انسان کچھ زیادہ ہی سمٹ کر گھر میں بیٹھ گیا۔ مدیحہ بھی گھر میں بند تھیں۔ ایک تو سردیاں پھر ایک نئی وبا جیسے جیسے انسان کو ایک چھوٹا سا جراثیم مار رہا تھا ویسے ویسے انسان اپنے گھر میں دبک کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر ایک رنگین دنیا میں اپنے اس معصوم ساتھی میں کھویا ہوا تھا جسے لوگ سیل فون کہتے ہیں۔

مدیحہ نے پوری سردیاں گھر میں گزار دیں باہر جھانکا تک نہیں۔ اس تمام عرصے میں خوب دوست ملے۔ دوبئی، آسٹریلیا، کینیڈا سب جگہ دوست احباب موجود تھے۔ وقت کیسے گزرا پتہ ہی نہ چلا۔ فیس بک پر موسم بدلنے کے

ساتھ پھول پودوں کی تصویریں لوگ ڈالنے لگے تو مدیحہ نے بھی اپنے پیچھے والے صحن میں قدم رکھا باہر نکل کر اچھا لگا۔

کتنے عرصے بعد سر اٹھا کر اوپر دیکھا تھا۔ ہلکا نیلا آسمان اور اس میں تیرتے بادلوں کے سفید گالے اچھے لگ رہے تھے۔ چوں چوں ان دیکھی چڑیاں اوپر کہیں درختوں پر چہچہا رہی تھیں۔ ایک گلہری دیوار پر بیٹھی یوں لگ رہی تھی جیسے اُسے ہی دیکھ رہی ہو۔ انگور کی بیل خوب بڑھ گئی تھی۔ اُس نے فون ہاتھ سے رکھ دیا تھا اور ٹھنڈی ہوا کا لطف لے رہی تھی۔ اچانک نظر مس جونز کے باغیچے پر پڑی۔ گلاب کا سفید درخت پھیکا پن لیے جھکا ہوا تھا۔ گھاس بڑھی ہوئی تھی۔ سرخ گلاب کی پتیاں سوکھ کر بکھری ہوئی تھیں۔ مس ماؤ نے اس دفعہ اپنے سبزیوں کے منڈپ پر کچھ بھی محنت نہیں کی بہت خالی سا ڈھانچہ نظر آ رہا تھا۔

مدیحہ کے لیے حیرت کی بات تھی۔ اُس نے اپنے کپڑے بدلے اور باہر نکل کر مس جونز کی کھڑکی کی جانب دیکھا جو اکثر وہاں بیٹھ کر باہر سڑک پر چلنے والوں کو دیکھا کرتیں۔ اور ہر گزرتے ہوئے پڑوسی کو ہاتھ ہلاتیں۔ مدیحہ نے ان کے گھر کی گھنٹی بجائی۔ فرینک ان کے گھر کے نیچے والے حصے میں رہتا تھا وہ باہر نکل کر آیا ''ہائے مس موحی'' وہ لوگ مدیحہ کو اسی نام سے پکارتے تھے ''ہائے کیسے ہو تم'' مدیحہ نے پوچھا ''میں ٹھیک ہوں'' فرینک نے دھیمی آواز سے کہا ''یہ مس جونز کہاں ہیں'' اس نے پوچھا۔

''تقریباً چار ماہ ہو گئے مس جونز کا انتقال ہو گیا۔ ہارٹ اٹیک ہو گیا تھا۔'' فرینک بولا۔

''اوہ نو'' مدیحہ کے منہ سے نکلا۔ اور مس ماؤس نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔ ''وہ بھی وبا سے متاثر ہو کر چل بسیں۔'' وہ بولا۔ دونوں کو ہسپتال سے ہی ان کے دوستوں اور عزیزوں نے لے جا کر دفنا دیا۔ مدیحہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

فرینک بولا۔ موحی مس جونز اکثر کھڑکی میں بیٹھ کر آپ کو دیکھتیں شاید آپ نظر آئیں۔ آپ کو تو پتہ ہے وہ کانوں کی وجہ سے فون استعمال نہیں کرتی تھیں اور آنکھوں سے بھی کم دکھتا تھا۔ وہ بولتا رہا اور مدیحہ روتی رہیں۔ آپ کہاں تھیں؟ فرینک نے پوچھا۔ یہیں تھی۔ مدیحہ نے کہا۔ کیا آپ بہت مصروف تھیں؟ فرینک بولا۔ ہاں! مدیحہ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''مس جونز اور مس ماؤ میں دور کی کھڑکیاں کھولنے اور بند کرنے میں ایسی مصروف رہی کہ پاس والی کھڑکی کھولنا بھول گئی۔ جہاں میری اجنبی دوستیں رہتی تھیں۔ فرینک نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا ''مس موحی اداس نہ ہوں مس جونز نے بہت اچھی زندگی گزاری۔ وہ آپ کے بچوں کی بچپن کی شرارتیں یاد کر کے اب بھی ہنستی تھیں اور مس ماؤ ان کے قصے سناتی تھیں۔ مدیحہ کو اپنی امی کی بات یاد آئی وہ اکثر پوچھتیں بیٹا وقاص اور کرن کا بچپن تو ہم نے دیکھا ہی نہیں کیا وہ بہت شریر تھے'' آہ! ہم اپنوں کے ملتے ہی کیسے اپنے اجنبی دوستوں کو بھول جاتے ہیں فرینک، مدیحہ سے کہا اور فرینک نے یوں سر ہلایا جیسے سب کچھ سمجھ آ گیا ہو۔ مدیحہ کا فون بہت دیر سے بج رہا تھا اس نے فرینک کو خدا حافظ کہا۔ مس جونز کی کھڑکی کی جانب دیکھا اور اپنے فون کی کھڑکی دوبارہ کھول لی مگر نہ جانے کیا ہوا اُس نے فون بند کیا۔ پلٹ کر فرینک کی طرف آئی اور بولی۔

''تم بیمار ہو، اکیلے ہو۔ مس ماؤ کے شوہر بھی بیمار اور اکیلے ہیں۔ کیا میں تم دونوں کی خبر گیری کر سکتی ہوں۔ مجھے اپنا نمبر دے دو۔ ضرور فرینک بولا اور مدیحہ نے اس کا نمبر نوٹ کرنے کے بعد بے حد سکون محسوس کیا۔

بقیہ : خاکِ شفا

''بندہ پرور، بندہ نواز، جان کی امان پاؤں تو عرض کروں! (خلیفہ عبدالرشید کا سوانگی بیدار ہو گیا) یہ ناچیز آپ کو کیسے بتلائے، اپنی کس کس صلاحیت اور خوبی کا بیان اپنے منہ سے کرے، آپ تو ہمیں نرا گاؤدی سمجھ بیٹھے ہیں۔''

''آپ کا اشارہ کس طرف ہے؟'' (قاضی شہاب الدین نے ہاتھ اُٹھا کر دریافت کیا)

''بھائی میاں! کوچہ دلدار خان کے چپّے چپّے پر ہماری کڑی نگاہ ہے۔ (خلیفہ عبدالرشید رازدانہ انداز میں) ہمارے گُرگے چاروں طرف خفیہ پولیس کی مانند پھیلے ہوئے ہیں۔ جب بھی کوئی اہم واقعہ رونما ہوتا ہے اُس کی اطلاع سب سے پہلے ہم تک پہنچتی ہے۔''

''واللہ یقین مانیئے، ہمیں آپ کی پوشیدہ صلاحیتوں کا آج سے پہلے قطعی علم نہ تھا۔ ہم تو دل سے قائل ہو گئے آپ کے، شکر خدا کا، ہم پیری مرید میں یقین نہیں رکھتے وگرنہ دوزانو ہو کر کورنش بجالاتے۔'' (مرزا سلامت علی نے اس قدر پکّا منہ بنا کر ٹھول کیا کہ خلیفہ عبدالرشید گومگو کی کیفیت میں مبتلا ہو کر ٹھوڑی سہلاتے رہ گئے)

''چلئے مان لیا آپ کی کشف و کرامات کا سلسلہ بہت دراز ہے مگر آپ کی ناک کے نیچے کیا ہو رہا ہے اس کی بھی خبر رکھا کیجیے۔''

''مطلب!''

''اماں آستانہ انوار آج کل مقفل رہتا ہے، اس کی کوئی خیر خبر ہے کہ نہیں''

''اچھا، اچھا، تو آپ کی نظرِ کرم آج کل پیرزادہ صاحب کے دولت کدے کی جانب ہے (خلیفہ عبدالرشید مفکرانہ انداز میں، پان کی گلوری کو ایک سمت سے دوسری سمت سیر کراتے ہوئے گویا ہوئے) فکر مت کیجیے، یہ عقدہ بھی جلد حل ہو جائے گا۔

(جاری ہے)

" قربِ قیامت "

خمار بارہ بنکوی

(●)

وہی پھر مجھے یاد آنے لگے ہیں
جنہیں بھولنے میں زمانے لگے ہیں

وہ ہیں پاس اور یاد آنے لگے ہیں
محبت کے ہوش اب ٹھکانے لگے ہیں

سُنا ہے ہمیں وہ بھلانے لگے ہیں
تو کیا ہم اُنہیں یاد آنے لگے ہیں

ہٹائے تھے جو راہ سے دوستوں کی
وہ پتھر میرے گھر میں آنے لگے ہیں

یہ کہنا تھا اُن سے محبت ہے مجھ کو
یہ کہنے میں مجھ کو زمانے لگے ہیں

ہوائیں چلیں اور نا موجیں ہی اٹھیں
اب ایسے بھی طوفان آنے لگے ہیں

قیامت یقیناً قریب آ گئی ہے
خمارؔ اب تو مسجد میں جانے لگے ہیں

○

عبداللہ جاوید

(کینیڈا)

غم کی پرچھائیں درخت رہا
اب کے موسم ہی سخت سخت رہا

جیسے دریا کے دو کنارے ہوں
ہم رہے ، درمیان وقت رہا

زندگی انتظار میں کاٹی
اور یہ انتظار، سخت رہا

تخت پر کون تھا۔۔۔ نہ دیکھ سکے
بعد میں وہ رہا نہ تخت رہا

کیا رہا اپنے ساتھ زادِ سفر
زخم خوردہ بدن ہی رخت رہا

سب رویّے انا کی بھینٹ رہے
جو رویّہ تھا سخت، سخت رہا

دُکھ تو یہ ہے کہ یہ ہمارا وطن
ایک ہو کر بھی لخت لخت رہا

ایک ہو کر بھی ہم نہ ایک ہوئے
ڈالیوں سے جدا درخت رہا

باہمی گفتگو تھی لاحاصل
سب کا لہجہ بڑا کرخت رہا

وقت کی بات گو زباں پہ رہی
ہاتھ میں اپنے، اپنا وقت رہا

ہم بھی جاوؔید وقت سے روٹھے
ڈھونڈتا ہم کو، اپنا وقت رہا

نواز دیوبندی
(بھارت)

چراغوں کو جلاتا ہوں ہوا ناراض ہوتی ہے
میں قندیلیں اڑاتا ہوں ہوا ناراض ہوتی ہے

میں جگنو ہوں اندھیروں کی حکومت کا نہیں قائل
اگر میں جھلملاتا ہوں ہوا ناراض ہوتی ہے

یہ واقف ہے مری پرواز کے ماضی سے اے پنجرے
ذرا سا پھڑپھڑاتا ہوں ہوا ناراض ہوتی ہے

چراغوں کی حمایت میں جو لکھے تھے کبھی میں نے
میں جب وہ گیت گاتا ہوں ہوا ناراض ہوتی ہے

بجھا پاتی نہیں وہ آندھی بن کر جن چراغوں کو
میں پھونکوں سے بجھاتا ہوں ہوا ناراض ہوتی ہے

چراغوں کے بھڑکنے میں ہوا کا ہاتھ ہوتا ہے
کسی کو یہ بتاتا ہوں ہوا ناراض ہوتی ہے

کسی پتے میں ہلکی سی بھی جنبش اور بلا مرضی
میں پتوں کو ہلاتا ہوں ہوا ناراض ہوتی ہے

ہوا اڑتی پتنگوں سے بھی ویسے خوش نہیں رہتی
میں بارش میں اڑاتا ہوں ہوا ناراض ہوتی ہے

○

سلیمان خمار
(لکھنؤ)

یوں بظاہر گل و سبزے سے سجائی ہوئی ہے
یہ جو دُنیا ہے وہ کانٹوں میں بسائی ہوئی ہے

اِس کی چاہت میں اسیری کے سوا کچھ بھی نہیں
اِس کی زلفوں سے بھلا کس کی رہائی ہوئی ہے

میہماں بن کے کبھی آتے ہیں لمحاتِ نشاط
مُستقل کب یہاں خوشیوں کی رسائی ہوئی ہے

عہدِ نو ہم کو دکھاتا ہے مناظر بھی نئے
آگ کی فصل سمندر میں اُگائی ہوئی ہے

خوبصورت ہے بہت زیست یہ سچ ہے، لیکن
یہ بھی سچ ہے کہ یہ اشکوں میں نہائی ہوئی ہے

دل میں اک ڈر ہے جو ہر وقت سمایا ہوا ہے
سر پہ اک خوف کی بدلی ہے جو چھائی ہوئی ہے

رات نے پہرے بٹھا رکھّے ہیں ہر سمت خمار
تیرگی ہے کہ یہاں رنگ جمائی ہوئی ہے

○

جاوید زیدی

(نیویارک)

سب نیک و بد حضور گنہگار دل میں ہے
یہ خاک کا پُتلا ہے خطا کار دل میں ہے

سودا دماغ میں ہے خریدار دل میں ہے
جو مل سکا کبھی نہ طلبگار دل میں ہے

بُزدل بھی ہے چھپا ہوا اس غارِ خوف میں
بے باک بہادر بھی اک دلدار دل میں ہے

جو آنکھ دیکھتی ہے جو سُنتے ہیں تیرے کان
جو چھپ سکا کبھی نہ وہ اخبار دل میں ہے

ہاں، روز و شب ہی اُٹھتی ہے طوفانِ غم یہ موج
لشکر ہے یادؔ سایہ اک انبار دل میں ہے

دیر و حرم میں مل نہ سکا زیدؔی جو ہمیں
اے صاحبو وہ اعلیٰ فسوں کار دل میں ہے

O

آفتاب مضطر

(کراچی)

اجنبی شہر میں کس کے لیے جاتا ہُوا میں
خود کو یہ کس کے بھروسے لیے جاتا ہُوا میں

ایک آواز لیے جاتی ہے چھینے مرا دل
ایک آواز کے بوسے لیے جاتا ہُوا میں

کسی دل کے کھُلی چھتری، کہ بُلاتی ہے مجھے
دل ، کبوتر سا اڑائے لیے جاتا ہُوا میں

موجِ دریا کے مخالف، کیے اک دُھن سی سوار
کسی کی کشتی کنارے لیے جاتا ہُوا میں

شوق نے دل کو سہارا جو ہُوا ہے یارو!
شوق کو دل کے سہارے لیے جاتا ہُوا میں

ہجر فتراک کُشائی سے، اُسے لے کر پرے
وصل کے پر پہ اُڑائے لیے جاتا ہُوا میں

ملکہ کون ہے وہ چشم بہ راہی کو مِری؟
نین دیدار کو پیاسے لیے جاتا ہُوا میں

یہ بھلا کس کی طرف گامزنی ہے یہ مِری
بَدرقہ کس کو بنائے لیے جاتا ہُوا میں

توشۂ جاں میں اُسے باندھے ہوئے خود میں، رواں
مارے باندھے نہیں، باندھے لیے جاتا ہُوا میں

کون بیٹھا ہے مِری اشک شُوئی کو اُس پار
کس کے دامن کو یہ گِریے، لیے جاتا ہُوا میں

کس لیے کس کے لیے آنکھ میں مضطرؔ لیے اشک
کس طرف خود کو اٹھائے لیے جاتا ہُوا میں

O

بشیر احمد بشیر

(جموں، کشمیر)

شبِ تاریک نے دنیا میں گر وحشت بڑھائی ہے
مگر ہر شب کے بعد اک صبحِ نور بھی مسکرائی ہے

حضورِ گل میں شبنم تو ازل سے روتی آئی ہے
مگر اس کا صلہ گل کی وہی بے اعتنائی ہے

یہ بگڑی غم نصیبوں کی کسی نے کب بنائی ہے
یہاں قسمت کے ماروں کا مقدّر بے نوائی ہے

کسی کی حرصِ نفسانی نے جب کی رہنمائی ہے
جہاں میں پھر بھی کبھی اُس نے کوئی عزّت نہ پائی ہے

یہاں آفت زدوں نے جب بھی قسمت آزمائی ہے
تو محرومی سدا ان کا مقدّر بن کے آئی ہے

جہاں میں ہے نہایت اہمیت تخلیق کاری کی
مگر اس میں تو لازم پہلے نیّت کی صفائی ہے

بنا ہے عالمی داروغہ اب امریکہ دنیا میں
سُپر طاقت ہے یا نمرودِ ملعوں کی خدائی ہے

کسی کو حق نہیں جا کر کرے اوروں پہ بمباری
یہ امریکہ کی دہشت گردیوں کی کارروائی ہے

بپا ہے کیا قہر یہ آج ان مقبوضہ قوموں پر
خدایا دیکھ نمرودوں نے کیا آفت مچائی ہے

بشیؔر اس دور میں مانا کہ انساں نے ترقی کی
مگر انسانیت مظلوم بن کر روتی آئی ہے

○

عبدالقادر تاباں

(راولپنڈی)

دلِ اہلِ حسد میں رہتا ہوں
اس لیے پورے قد میں رہتا ہوں

آپ اپنے ہی رد میں رہتا ہوں
سر پھروں کی مدد میں رہتا ہوں

مسخ کرتا نہیں کبھی لہجہ
اپنے ہی خال و خد میں رہتا ہوں

کچھ تو ایسے جگہ بناتے ہیں
جیسے اُن کی لحد میں رہتا ہوں

بے نیازی نہ کیسے ہو مجھ میں
اُس نگاہِ صمد میں رہتا ہوں

حد سے آگے نکل نہ تیرہ شبی
میں دیا ہو کے حد میں رہتا ہوں

دل ہیدلدادہء جنوں تاباں
اور میں اہلِ خرد میں رہتا ہوں

○

اشرف جاوید

(لاہور)

چلا، تو رستہ نہیں چلا مرے ساتھ
دگرنہ کیا کیا نہیں چلا مرے ساتھ

وہ صورتِ سایہ آگے پیچھے چلا
یہی گلہ تھا نہیں چلا مرے ساتھ

اشارہ کرتا تھا، رخ بتاتا تھا
چراغ رہ کا نہیں چلا مرے ساتھ

کبھی نہ ضد کے حصار سے نکلا
بہت انا تھا نہیں چلا مرے ساتھ

قدم، قدم سے ملا کے رکھتا تھا
قدم بڑھایا، نہیں چلا مرے ساتھ

بزرگ کہتے تھے سچ کو آنچ نہیں
مگر یہ سکّہ نہیں چلا مرے ساتھ

کبھی زمانے سے خود گریز کیا
کبھی زمانہ نہیں چلا مرے ساتھ

اب اس سے بڑھ کر غریبی کیا ہوگی!
کوئی بھی اپنا نہیں چلا مرے ساتھ

میں آخرِ کار اکیلا چل پڑا ہوں
اُسے کہا تھا نہیں چلا مرے ساتھ

○

فیصل عظیم

(کینیڈا)

نباہ، قرب، سہارے، سارے
بس آج بوجھ اُتارے سارے

کہیں سے اٹھی تری موجِ سبک
مچل گئے ہیں کنارے سارے

حدودِ شہرِ طلب کا پھیلاؤ
سمیٹ لے گا نظارے سارے

یہ چند کرنوں کی تہمت بھی کیوں
بجھا نہ دوں یہ ستارے سارے!

لکیریں جھوٹی، کتابیں جھوٹی
سو ہاتھ آئے خسارے سارے

غریب لفظ چھپاتے کیا کیا!
عیاں ہیں چہرے تمھارے سارے

بکھرتے رہتے ہیں پتہ پتہ
خود اپنے سائے کے مارے، سارے

ہیولے دستِ طلب پر نہ بنا
ہمیں وہ چہرے دکھا رے! سارے

○

ایک پلیٹ بریانی اور ایک کپ کوفی

امجد طفیل
(لاہور)

وہ دونوں ڈھلکتی جوانی کی عورت اور ڈھلتی عمر کا مرد اُس پُرتعیش ریسٹورنٹ کے مخصوص گوشے میں لگی چار آدمیوں والی میز پر آمنے سامنے کی کرسیوں پر براجمان اِدھر اُدھر کی بیکار باتوں میں کئی گھنٹے بسر کر چکے تھے۔ نہایت نفاست سے سجے اس ریسٹورنٹ میں جس کی دیواروں پر شہر کی نمایاں ہستیوں کی آویزاں تصاویر سے ایک مخصوص ثقافتی رنگ دے رہی تھیں۔ کی کوشش کی گئی تھی وہ دونوں برسوں سے مہینے میں ایک دو بار ملتے، کچھ کہی کچھ اَن کہی ایک دوسرے کو سناتے۔ دنیا کی باتیں، دوستوں کے قصے، اغیار کی حکایتیں، گزرے دن اور آنے والی راتیں۔ سب کچھ اُن کی گفتگو میں شامل ہوتا۔

اپنی ابتدائی ملاقات سے وہ اس مخصوص میز پر بیٹھنے کو ترجیح دیتے تھے۔ اگر کبھی اُن کی پسندیدہ میز خالی نہ ہوتی تو وہ کسی بھی میز پر بیٹھ جاتے مگر اُن کی نگاہیں مسلسل اُسی گوشے پر مرکوز رہتی، جیسے ہی مذکورہ میز خالی ہوتی وہ اُٹھ کر وہاں آ جاتے۔ اس میں ریسٹورنٹ کے ویٹرز بھی اُن کی مدد کرتے۔ جو نہ صرف اس بات سے واقف تھے کہ انہیں کہاں بیٹھنا پسند ہے بلکہ اُن کے کھانے پینے کے معمولات کو بھی جان چکے تھے۔ اُن کے آتے ہی پانی کی بوتل اور دو گلاس میز پر سجا دیے جاتے۔ اس کے بعد کبھی کبھی فرنچ فرائز کا آڈر دیا جاتا۔ پھر دونوں اپنے لیے بریانی منگواتے۔ پھر چائے یا اکثر کافی۔ کبھی کبھی معمولات میں فرق بھی آ جاتا لیکن بریانی اور کافی تقریباً ہر ملاقات پر اُن کی میز پر رکھے نظر آتے۔ ایسا اس کے باوجود ہوتا تھا کہ ڈھلتی جوانی کی عورت سدا کی سبزی خور تھی اور ڈھلتی عمر کے مرد کو ڈاکٹروں نے چاول کھانے سے منع کر رکھا تھا۔

یوں تو ان کے درمیان دلچسپی کے بہت سے پہلو تھے جن میں گھنٹوں باتیں کرتے وہ تھکتے نہ تھے۔ دونوں الگ الگ دفاتر میں کام کرتے تھے۔ دونوں کے درمیان کئی دوست مشترک تھے۔ زندگی میں دکھ سکھ بھی وہ ایک دوسرے سے بانٹ لیتے تھے۔ کئی مشکلات میں ایک دوسرے کا ساتھ دے چکے تھے بلکہ ایک آدھ بار تو ایسا بھی ہوا کہ اُس عورت نے مرد کے لیے ایسا کام بھی کر دیا جو شاید کبھی کبھار ہی کوئی عورت ایک مرد کے لیے کرتی ہے۔

مرد بھی اُس ڈھلکتی جوانی کی عورت کا بہت دھیان رکھتا تھا اور کوشش کرتا تھا کہ اُس کی پسند ناپسند کا مکمل خیال رکھے۔ کوئی ایسی بات نہ ہو جو کسی طرح کی ناخوشگواری کا باعث بنے۔ اس لیے دونوں جب بھی ملتے ایک عجیب سی خوشی اور انبساط اُن دونوں کے وجود کا احاطہ کر لیتا۔ اُس کے درمیان گہرے تعلق اور لاتعلقی کے رنگ بکھرنے لگتے۔ اُن جسموں کی حرکات وسکنات نگاہوں کے انداز، ہونٹوں پر بکھری مسکراہٹیں، سب اس بات کا پتہ دیتیں کہ وہ ایک دوسرے کی قربت سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس لیے کبھی کبھار یہ سوچنے کے باوجود کہ یہ سب سعی لاحاصل ہے وہ کچھ دنوں کے بعد پھر وہیں موجود ہوتے۔ یہ سب کچھ اس لیے بھی آسان تھا کہ زندگی کی بہت سی بہاریں دیکھنے کے باوجود دونوں ابھی تک کنوارے تھے۔

اُن کی پہلی ملاقات بس اتفاقی انداز میں ایک ایسی محفل میں ہوئی جو ڈھلتی عمر کے مرد کے لیے سجائی گئی تھی اور اُس عورت کا وہاں موجود ہونا حسن اتفاق ہی کہا جا سکتا تھا۔ محفل کے اختتام پر، عورت مرد کے پاس آئی اُس کے لیے اچھے جذبات اور نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ دونوں کے درمیان موبائل نمبروں کا تبادلہ ہوا۔ چند دن کے بعد مرد کے دل میں نجانے کیا آئی کہ اُس نے عورت کا نمبر ملایا۔ دوسری جانب دو تین بار گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی پھر اُس کے کانوں نے عورت کی آواز سنی۔ اُس نے اپنا نام بتایا۔ دونوں نے حال احوال پوچھا اِدھر اُدھر کے جملوں کا تبادلہ ہوا اور پھر مرد نے کسی قدر تردید کے بعد اُس سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ دوسری جانب سے ہچکچاہٹ کے بعد ملنے پر آمادگی ظاہر کر دی گئی۔ بہت بعد میں عورت نے بتایا کہ ابتدائی ملاقات کے دن جب وہ بیرونی دروازے سے باہر جا چکی تھی۔ اپنی عادت کے خلاف وہ واپس آئی تھی تاکہ اس سے بات کر سکے۔

جب وہ پہلی بار اس ریسٹورنٹ میں ملے تھے تو اُن دونوں نے خود کو یہ یقین دلانے کی پوری کوشش کی تھی کہ اُن کی سرسری ملاقات، ایک شعبے میں کام کرنے والے دو افراد کے درمیان باہمی دلچسپی کے امور پر اظہار خیال کا بہانہ ہے۔ رفتہ رفتہ اُن کے درمیان تعلقات نے کئی شکلیں اختیار کیں۔ اس میں دو تین بار کے لڑائی جھگڑے، تند و تیز جملوں کے تبادلے اور ایک آدھ بار ایک دوسرے کے انتہائی قریب آنے کا رنگ بھی شامل تھا۔

لیکن ان دونوں کے درمیان ایک میز کی دوری کا جو تعلق پہلے دن بنا تھا آخر تک قائم چلا آتا تھا۔

ریسٹورنٹ کی فضا میں وہ اکثر ایک دوسرے کے ساتھ اتنے کھوئے ہوتے کہ انہیں اپنے اردگرد کا خیال بھی کم ہی آتا۔ مگر ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ دوسروں سے بالکل ہی بے خبر ہو جاتے ہیں۔ جب بھی ریسٹورنٹ میں زیادہ رش ہوتا اور کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تو وہ اکٹھے سوچتے کہ بیٹھنے کے لیے یہ کوئی معقول جگہ نہیں۔ یہاں اس قدر شور ہے کہ اُن کے لیے ایک دوسرے کی خاموشی کو سننا بھی ممکن نہیں ہو پا رہا مگر ایسا کم کم ہی ہوتا تھا۔ کبھی کبھی ایسے مناظر بھی دیکھنے کو ملتے جو انہیں کچھ کرنے کے لیے اکساتے۔ جیسے ایک دن اُن کی بائیں جانب کی میز پر بیٹھے نوجوان لڑکی لڑکا ایک دوسرے میں اس حد تک کھوئے تھے کہ انہیں

ریسٹورنٹ کے عوامی مقام ہونے کا احساس بھی نہیں رہا۔لڑکی نے سینڈل سے اپنا پاؤں نکالا اور میز کی دوسری جانب بیٹھے لڑکے کی پنڈلی کو اپنے پاؤں کی انگوٹھے سے سہلانا شروع کر دیا۔ بعد میں عورت نے مرد کو اس بارے میں بتاتے ہوئے پوچھا تھا کہ کیا آپ نے دیکھا تھا۔مرد نے صاف انکار کر دیا تھا۔جبکہ حقیقت یہ تھی کہ سارا منظر اُس نے خود بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا۔اُس کے دل میں بھی شدید خواہش پیدا ہوئی تھی کہ کاش اُس کے سامنے بیٹھی عورت کے پاؤں کا انگوٹھا اُس کی پنڈلی کو اُس کے ہونے کا احساس دلائے یا وہ خود اپنے پاؤں کی ہلکی سی تھاپ سے اس سامنے بیٹھی عورت کے اندر کے وجود کو جگائے۔ایک بار تو اس نے اپنا بایاں پاؤں جوتے سے نکال بھی لیا تھا لیکن اُسے یاد آیا کہ اس نے موزے پہن رکھے ہیں۔

ریسٹورنٹ میں ایک دن عجیب بات ہوئی تھی۔ایک نوعمر لڑکی کو دیکھ کر اُس کے چہرے کے رنگ بدلے تھے۔مرد کی بدلتی کیفیات کو عورت کی آنکھوں نے فوراً بھانپ لیا تھا۔مرد کی نظروں کے تعاقب میں اُس نے نوجوان لڑکیوں کے جھرمٹ کو دیکھا اور ایک لمحے کے لیے اُس کے چہرے پر مردنی چھا گئی۔اُسے اپنی عمر کے ڈھلنے کا شدت سے احساس ہوا۔اُس نے شگفتہ لہجے میں مرد سے پوچھا کیا ہوا۔پہلے تو وہ چپ رہا پھر قدرے سنبھلتے ہوئے کہا کہ آپ اپنے بائیں جانب بیٹھی لڑکیوں میں جین کی پینٹ اور گلابی قمیض والی لڑکی کو دیکھ رہی ہیں۔کیا آپ کو بہت اچھی لگی ہے۔عورت کی بات نے مرد کو چونکا دیا۔اُس نے آہستہ آہستہ ٹھہر ٹھہر کر کہا نہیں۔لیکن یہ مجھے کسی اور کی یاد دلا رہی ہے۔ایک بھولے بسرے واقعے کی جو آج بھی میری رگ جاں کو کھینچتا ہے۔اس کے جواب نے عورت کو چونکا دیا۔مرد اپنے آپ میں گم ہو چکا تھا۔عورت کو اپنا وجود بے معنی لگا۔سامنے بیٹھے مرد کے لیے شاید اُس کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔آپ اُسے جی بھر کر دیکھ لیں۔عورت کے اصرار کے باوجود مرد نے دوبارہ اُس لڑکی کی جانب نہیں دیکھا۔وہ اُسے کیا بتاتا کہ یہ لڑکی اُسے جس کی یاد دلاتی ہے اُسے دیکھنے کے لیے چہرے پر لگی آنکھوں کی ضرورت نہیں۔

بعض اوقات تو اُن کی ملاقات اتنی دلچسپ اور بھرپور ہوتی کہ دونوں کافی دن تک اس کے خمار میں ڈوبے رہتے۔وہ کافی دیر تک ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے۔ایک دوسرے کے گلاس سے پانی پیتے۔ایک دوسرے کی بریانی کی پلیٹ سے اپنی بھوک مٹاتے۔لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ انہوں نے ایک دوسرے کے کافی کے کپ اپنے ہونٹوں سے لگائے ہوں۔اُس دن اُن کے جسموں کی تال الگ ہوتی،اُن کے ہونٹوں کی ہلکی ہلکی لرزش کسی نئے سفر کی تمنائی ہوتی۔ایسے میں وہ عورت بڑے اطمینان سے کہتی آپ کے پاس پندرہ منٹ بچے ہیں۔وہ بالکل نہ سمجھ پایا کہ وہ اپنے جانے کے وقت کا اعلان کر رہی ہے یا اُسے کچھ کرنے پر اکسا رہی ہے۔بس وہ محتاط سا اپنی جگہ بیٹھا کرسی پر کسمساتا اور گھسے پٹے شعروں سے اُس کا دل پرچانے کی کوشش کرتا۔یہ تعلق جیسا بھی اور جتنا بھی تھا وہ اسے جاری رکھنا چاہتا تھا۔

وہ دونوں الگ الگ ملاقات کے لیے پہنچتے۔کبھی مرد پہلے آ جاتا تو کبھی عورت۔ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ انہوں نے ملنے کا طے کیا ہو اور ملاقات نہ ہو پائی ہو۔اگر عورت پہلے آ جاتی تو مرد کے آنے پر ہلکے پھلکے انداز میں اُسے خوش آمدید کہتی۔اگر مرد پہلے سے موجود ہوتا تو کھڑے ہو کر عورت کا استقبال کرتا۔میز پر مرد اور عورت کی کرسیاں طے تھیں ہمیشہ اپنے لیے مخصوص کرسی پر بیٹھتے باتیں کرتے ہوئے وہ زیادہ تر اپنی اپنی کرسی سے ٹیک لگائے رہتے مگر کبھی کبھی آگے جھک کر قدرے آہستہ آواز میں بھی ایک دوسرے سے مخاطب ہوتے۔اتفاق سے کبھی دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے سے چھو جاتے تو وہ غیر ارادی طور پر پیچھے ہٹا لیتے۔واپسی کے لیے اٹھتے ہوئے کبھی دونوں اکٹھے ریسٹورنٹ سے باہر آتے کبھی الگ الگ۔مرد کو یہ جرأت کبھی نہ ہوئی کہ وہ عورت کو دعوت دے کہ وہ اُسے اس کے گھر تک اپنی کار میں لے جانا چاہتا ہے اور نہ کبھی اُس عورت نے ایسی خواہش کا اظہار کیا۔

اُن کے تعلقات میں ایک ٹھہراؤ اور سکون تھا۔کئی کئی دن اُن کا آپس میں رابطہ نہ ہوتا۔موبائل پر پیغامات کا تبادلہ ہوتا بھی تو بس سرسری باتیں۔کبھی کبھی دونوں ایک دوسرے سے اپنی کسی ضرورت کا اظہار بھی کر دیتے۔ایک دن باتوں باتوں میں عورت نے فون پر بتایا کہ آج وہ گھر میں مچھلی خرید کر لائی ہے۔مرد کے منہ سے نکل گیا کہ اُسے تلی ہوئی مچھلی بہت پسند ہے۔بات ختم ہو گئی دوسرے دن عورت نے مرد سے ملنے کا اظہار کیا۔دو دن بعد کا طے پایا۔تیسرے دن مرد وقت سے تھوڑا پہلے پہنچ گیا۔عورت جب آئی تو اُس کے ہاتھ میں ایک نفیس سا بیگ تھا۔مرد نے سمجھا کہ شاید شاپنگ کر کے آ رہی ہے۔کھانے کے وقت عورت نے بیگ سے چھوٹا سے ہاٹ پورٹ نکالا۔اُس میں تلی ہوئی مچھلی کے قتلے تھے۔

کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ وہ ایک دوسرے کے پیروں کی تعریف کر دیتے یا بالوں کے انداز کے بارے میں پسندیدگی کا اظہار کرتے۔مگر ایسا کم ہی ہوتا کہ انہیں اگلی ملاقات تک یاد رہا ہو کہ پچھلے بار کس نے کس کے کپڑوں کی تعریف کی تھی۔بس ایک بار ایسا ہوا تھا کہ عورت تین چار ملاقاتوں پر ایک ہی لباس پہن کر آئی مرد نے اس بات کو محسوس تو کیا لیکن اپنا وہم جان کر چپ رہا۔ایسا اُن دونوں کے درمیان اُس اکلوتے واقعہ کے بعد ہوا تھا جس نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا تھا۔

دونوں ایک دوسرے سے دبی دبی کہیں اور ملنے کی خواہش کا اظہار تو وقتاً فوقتاً کرتے رہتے تھے مگر ایسا بس سرسری انداز میں ہوتا تھا۔پھر نجانے کیوں مرد کے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اس عورت سے اکیلے میں کہیں ملے۔اُس طرح جیسے ایک مرد ایک عورت سے ملتا ہے۔پھر اس کا ایک بہانہ بھی پیدا ہو گیا۔پہلے تو عورت نے آنے سے انکار کیا لیکن جب مرد کا اصرار بڑھا تو وہ راضی ہو

باقی صفحہ ۱۱۰ پر ملاحظہ کیجیے

دخمہ کے گدھ

ایم مبین
(مہاراشٹر)

شام کو خبر آئی کہ کاوس نے زخموں کی تاب نہ لاکر آخر موت سے شکست تسلیم کرلی اور زندگی کی جنگ ہار گیا۔

ایک دو گھنٹوں میں قانونی کاروائی اور پوسٹ مارٹم کے بعد لاش مل جاے گی۔لاش لانے والوں کو اسپتال روانہ کار دیا جاے۔

یہ بات سن کر سائرس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ بے اختیار اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔اس کا گلا رندھ گیا۔اس نے اپنی آنکھوں میں آئے آنسو صاف کیے اور رندھے گلے کو کھنکھار کر صاف کرتے ہوئے اگیاری کے خادم سے کہا۔

''سب سے کہہ دینا کاوس کا انتقال ہوگیا ہے۔لاش لانے والے اسپتال جاکر اس کی لاش لانے کی تیاری میں لگ جائیں۔کل کاوس کی آخری رسومات انجام دی جاے گی۔کل کاوس کا دخمہ ہوگا۔''

اس کے بعد اس نے پارسی پنچایت کے تمام ممبران کو فون کر کے کاوس کی موت سے مطلع کیا۔ان میں سے بیشتر لوگوں کو پہلے ہی اس بات کی خبر ہو چکی تھی۔دیگر اہم لوگوں کو خبر دینے کے بعد وہ مایوس سا آکر کرسی پر بیٹھ گیا۔

دن بھر اس کی آنکھوں کے سامنے کاوس کا خون آلود چہرہ اور خون آلود جسم گھومتا رہا تھا۔اُف اُس کا چہرہ اور جسم کتنا خوفناک تھا۔اس کے جسم کے کپڑے تار تار تھے۔اور خون میں شرابور تھے، کاوس کے خون میں۔جگہ جگہ سے ان پھٹے ہوے کپڑوں سے کاوس کے جسم کا سرخ سرخ گوشت جھانک رہا تھا۔

اس کے جسم کو جگہ جگہ سے گدھوں نے نوچ کر سارے جسم کو زخموں سے بھر دیا تھا۔اس کے کانوں میں اب بھی کاوس کی درد بھری چیخیں گونج رہی تھیں۔وہ کس طرح مدد کے لیے چیخ رہا تھا۔خود کو ان خونخوار گدھوں سے بچانے کے لیے مدد مانگ رہا تھا اور گدھوں کے حملوں سے خود کو بچانے کی کوشش کرتا چھٹ پٹا رہا تھا۔

یہ کاوس کی درد بھری دردناک چیخیں تھیں جن کو سن کر اس کی عبادت میں خلل پڑا تھا اور وہ مقدس کتاب رکھ کر دوڑتا ہوا باہر آیا تھا۔

کاوس کی چیخیں اس جگہ سے آرہی تھیں جہاں وہ روزانہ سویرے دس بجے کے قریب گدھوں کو کھانا ڈالتا تھا۔

اور اپنے ہاتھوں سے گدھوں کو بکرے کے گوشت کے ٹکڑے ڈالتا تھا۔

ٹاور آف سائیلنس برج خموشی کے سارے گدھ کاوس سے مانوس تھے۔

وہ برسوں سے انھیں باقاعدگی اور بلاناغہ ان کو کھانا کھلا رہا تھا۔وہ سارے گدھ اگیاری اور برج خموشی کے اطراف کے بڑے بڑے درختوں پر رہتے تھے۔

وہ زیادہ تر خاموش ہی رہتے تھے۔

لیکن دس بجتے ہی وہ آوازیں نکالنا شروع کر دیتے تھے۔کیونکہ یہ ان کے کھانے کا وقت ہوتا تھا۔وہ اپنے منہ سے آوازیں نکال کر جیسے کاوس کو یاد دہانی کراتے تھے کہ ان کے کھانے کا وقت ہوگیا ہے۔ابھی تک ان کو کھانا نہیں دیا گیا ہے۔ان کا کھانا نہیں آیا ہے۔

ایک بڑے سے پتیلے میں بکرے کے گوشت کے ٹکڑے لیکر جب وہ میدان میں اس جگہ کی طرف بڑھتا، جہاں وہ گدھوں کو کھانا کھلاتا تھا تو اس پر نظر پڑتے ہی، اس کو میدان کی طرف بڑھتے دیکھ کر درختوں پر بیٹھے سارے گدھ میدان میں اتر آتے تھے۔

اس کے بعد کاوس پتیلے سے گوشت کے ٹکڑے نکال نکال کر ان کی طرف پھینکتا تو وہ ان گوشت کے ٹکڑوں کو حاصل کرنے کے لیے ان پر جھپٹتے اور انہیں حاصل کرنے کی کوشش میں ایک دوسرے سے لڑنے لگ جاتے تھے۔ان کے آپس میں لڑنے کی خوفناک آوازوں سے پورا برج خموشی گونجنے لگتا تھا۔

جن کو کھانا نہیں مل پاتا تھا وہ کھانے کے لیے کاوس کے کافی قریب آجاتے تھے۔اس سے پہلے کہ وہ اپنا کھانا حاصل کرنے کے لیے کاوس پر جھپٹے، کاوس ان کی طرف گوشت کا ایک ٹکڑا اچھال دیتا تھا۔وہ اس پر جھپٹتے اور اسے اپنی چونچ یا پیروں میں دبا کر اڑ کر سامنے کے درختوں پر جا بیٹھتے۔

وہ اکثر اگیاری کے دریچہ میں کھڑے ہو کر اس منظر کو دیکھا کرتا تھا۔

جس دن کوئی میت آجاتی یا آنے والی ہوتی تھی۔کاوس گدھوں کو کھانا نہیں ڈالتا تھا۔کیونکہ اس دن تو ان کو ان کی قدرتی خوراک ملنے والی ہوتی تھی، جس کے لیے انھیں پالا گیا تھا۔

کیونکہ دخمہ کا کام ان کو ہی انجام دینا ہوتا تھا۔ان کے بنا یہ کام تو ممکن ہی نہیں تھا۔

موت کے بعد انسانی جسم نجس ہو جاتا ہے اور اس پر بدروحیں قبضہ کر لیتی ہیں۔کیونکہ زمین اور آگ دونوں پاک چیزیں ہیں۔اس لیے اس جسم کو زمین میں دفن کرنا زمین کو نجس کرنا ہے۔اور اس کو آگ میں جلانا مقدس آگ کو نجس کرنا ہے۔اس لیے اس جسم کو ختم کرنے کا قدرتی طریقہ یہی ہے کہ اسے اسی حالت میں چھوڑ دیا جائے۔۔سورج کی گرمی اور پرندے مردار خور جاندار اس جسم کو کھا کر اس کا وجود ختم کر دیں۔

کیونکہ مرنے کے بعد انسانی جسم نجس ہو جاتا ہے اس لیے اس کو کوئی چھو نہیں سکتا۔اس کو چھونے والے اور اس کا خاتمہ کرنے والے کاوس کی طرح لوگ ہوتے ہیں جن کا کام مرنے کے بعد مردہ جسم کو لا کر دخمہ کرنا ہوتا ہے۔کیونکہ وہ لوگ ایک نجس کام انجام دیتے ہیں۔اس لیے وہ لوگ نہ تو کسی سے مل جل سکتے ہیں اور نہ سماج میں رہ سکتے ہیں۔برج خموشی میں ان کے لیے الگ سے کمرے

ہوتے ہیں۔وہ ان کمروں میں ہی دنیا سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔

برج خموشی کی دنیا الگ ہی دنیا ہے۔جس میں کاوس کے قبیل کے لوگ رہتے ہیں۔اوراس قبیل کے لوگ جو اگیاری کے پجاری ہوتے ہیں۔

اس دنیا میں آج ایسا واقعہ ہوگا،اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ کیونکہ کاوس کی چیخیں سن کر جب وہ اگیاری سے باہر آیا تھا تو اس نے ایک ایسا منظر دیکھا تھا جس کا کبھی اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔اسنے دیکھا تھا کہ برج خموشی کے سارے گدھ جو دخمہ کا کام انجام دیتے تھے،جن کو روزانہ کھانے کے لیے کاوس گوشت دیتا تھا۔کاوس پر ٹوٹ پڑے ہیں اور اس کے جسم کا گوشت جگہ جگہ سے نوچ رہے تھے۔

کاوس چیخ رہا تھا۔اپنے آپ کو ان سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔لیکن گدھوں پر جیسے پاگل پن سوار ہو گیا تھا۔وہ اس سے تھوڑی دیر کے لیے الگ ہو جاتے اور پھر اس پر ٹوٹ پڑتے۔

''دوڑو۔۔ دوڑو۔۔ بچاؤ۔۔ بچاؤ۔۔گدھوں نے کاوس پر حملہ کر دیا ہے۔وہ اس کے جسم کا گوشت نوچ رہے ہیں۔۔''

وہ زور زور سے چیخنے لگا۔

اس کی چیخیں سن کر کاوس کے دیگر ساتھی جو کاوس کے ساتھ دخمہ کا کام انجام دیتے تھے،دوڑتے ہوئے اپنے اپنے کمروں سے باہر آئے۔

انھوں نے میدان میں جو منظر دیکھا اس کو دیکھ کر گھبرا گئے۔

وہ فوراً چیخ چیخ کر، منہ سے طرح طرح کی آوازیں نکال کر گدھوں کو بھگانے کی کوشش کرنے لگے۔لیکن جب انھوں نے دیکھا اس طرح ڈرانے کا گدھوں پر کوئی اثر نہیں ہو رہا ہے تو انہوں نے ہاتھوں میں بڑے بڑے ڈنڈے اٹھا لیے اور وہ انہیں لیکر ان گدھوں کو ڈرا کر مار مار کر بھگانے لگے۔ڈنڈوں کی مار سے گدھ گھبرا گئے اور اڑ کر آس پاس کے درختوں پر جا کر بیٹھ گئے۔

تب تک کاوس بیجان ہو کر زمین پر گر پڑا تھا۔وہ بیہوش ہو گیا تھا۔اسے فوراً کار میں ڈال کر اسپتال لے جایا گیا۔کاوس کو اسپتال لے جایا جا چکا تھا لیکن وہ دن بھر اس خوفناک منظر کے اثر سے خود کو آزاد نہیں کر سکا۔

کبھی اس کی آنکھوں کے سامنے کاوس کا خون میں لت پت چہرہ آ جاتا تو کبھی زخموں سے بھرا جسم۔جس سے کاوس کا سرخ سرخ گوشت جھانک رہا ہوتا تھا۔کبھی کاوس پر حملہ کر کے اس کے جسم کو نوچنے والے گدھ۔

اس نے اپنی زندگی میں پہلی بار ایسا خوفناک منظر دیکھا تھا۔

دن بھر وہ اس واقعہ کے اثرات میں الجھا رہا اور ان کے بارے میں سوچ سوچ کر تڑپتا اور کانپتا رہا۔اور آخر شام میں کاوس کے مرنے کی خبر آ گئی۔

کاوس کی لاش رات کو ہی اسپتال سے آ گئی تھی۔اس کا سارا جسم پٹیوں سے بندھا ہوا تھا۔جس سے اب تک خون رس رہا تھا۔

دوسرے دن اس کے دخمہ کی تقریب رکھی گئی تھی۔۔دخمہ سے قبل کی دیگر مقدس رسومات کا آغاز ہو گیا تھا۔جس میں وہ بھی شریک تھا۔کیونکہ اس میں سے بیشتر رسومات کو اس نے ہی انجام دینا تھا۔

کاوس کے دخمہ میں شہر کے کئی معزز پارسی شریک ہوے۔دخمہ کی تقریب میں عام طور پر لوگ شریک نہیں ہوتے ہیں۔مگر کیونکہ کاوس ایک مقدس ہستی تھی۔ وہ دخمہ کا مقدس کام انجام دیتا تھا۔اس وجہ سے معاشرے کے تمام اہم لوگوں نے اس کے دخمہ میں شریک ہونا ضروری سمجھا۔

دخمہ کی مکمل تقریب میں کوئی بھی شریک نہیں ہوتا ہے۔

اگیاری میں جب تک لاش ہوتی ہے اور اس لاش پر جو مقدس رسومات انجام دی جاتی ہیں۔اس وقت تک لوگ اسے دور سے دیکھ سکتے تھے۔

ورنہ عام طور پر پارسیوں میں یہ روایت ہے کہ مرنے کے بعد مرنے والے کے جسم کو چھونا تو دور میت کا چہرہ دیکھنا بھی لوگ گوارہ نہیں کرتے ہیں۔اور جب میت کو برج خموشی میں لے جایا جاتا ہے تو اس کے بعد تو کسی کو بھی لاش دیکھنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔

کاوس کی لاش کو جیسے ہی دخمہ کرنے والے لوگ خموشی کے کنویں پر رکھ کر جیسے ہی ہٹے،دخمہ کے وہ گدھ جو آس پاس کے درختوں پر بیٹھے ہوے تھے،ان کے ہٹتے ہی وہ کاوس کی لاش پر ٹوٹ پڑے اور اس کے جسم کو نوچ نوچ کر کھانے لگے۔اس گوشت سے کچھ کچھ وہ کل ہی آشنا ہو گئے تھے۔جب اس پر انہوں نے حملہ کیا تھا اور اس کے جسم کے گوشت کو نوچ کر کھانے کی کوشش کی تھی۔

وہ کاوس کی لاش کا گوشت نوچنے میں کچھ ایسے دیوانے تھے کہ دو چار کوّے جو لاش کے گوشت کے لالچ میں وہاں آ گئے تھے ان کو بھی انھوں نے لاش کے پاس آنے نہیں دیا اور ان پر اپنی نوکیلی چونچوں سے حملہ کر کے انہیں بھگانے لگے۔

اس کے آگے کا منظر سائرس نہیں دیکھ سکا۔جبکہ اس طرح کے مناظر دیکھنا اس کے لیے عام سی بات تھی۔اپنی زندگی میں وہ سینکڑوں ہزاروں بار یہ منظر دیکھ چکا تھا۔

دو چار دن میں پھر زندگی معمول پر آ گئی۔دو چار دن کاوس کی موت کا چرچا ہوتا رہا۔اگیاری کے تمام پجاری، ملازمین، دخمہ کرنے والے ملازمین جہاں بھی بیٹھتے کاوس اور اس کی موت کے بارے میں ہی گفتگو کرتے رہتے تھے۔

دوسرے دن سے دخمہ کے گدھوں کو کھانا کھلانے کے لیے ایک دوسرے ملازم کو مقرر کر دیا گیا۔

کیونکہ ان کو کھانا کھلانا بھی ضروری تھا۔ایک طرح سے وہ مقدس گدھ تھے۔ان کو بھوکا نہیں رکھا جا سکتا تھا۔اور اس بات کا بھی ڈر تھا کہ اگر ان کو بھوکا رکھا گیا تو کھانے کی تلاش میں وہ کہیں اور نہ چلے جائیں۔اور جب ان کی ضرورت محسوس ہو اور وہ نہ آئے تو مسئلہ کھڑا ہو سکتا ہے۔اس لیے ان کی دیکھ بھال، پرورش،کھانا کھلانے کی ذمہ داری بھی اگیاری یا برج خموشی کی ہی تھی۔

انھوں نے جس طرح کاوس پر حملہ کیا تھا، اس کی وجہ تو کوئی بھی نہیں سمجھ سکا۔ بحث مباحثہ کے بعد سب اس نتیجہ پر پہونچے تھے کہ ان گدھوں کو کھانا تو روز ہی مل جاتا ہے۔ لیکن کیونکہ وہ دخمہ کے گدھ ہیں۔ ان کی فطری خوراک انسانی گوشت اور انسانی خون ہے جو ان کے منہ کو لگ چکا ہے۔

اب پارسی لوگ روز روز تو نہیں مرتے۔ کبھی کبھی تو چار چار چھ چھ مہینے میں کوئی میت آتی ہے۔ ایسی صورت حال میں ان کی مرغن غذا تو ان کو ملنے سے رہی۔ شاید اسی لیے، اس مرغن غذا کو حاصل کرنے کے لیے ان پر جنون طاری ہو گیا تھا۔ اور انہوں نے کاوس پر حملہ کر دیا تھا۔

اس بات سے کوئی انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔

مشکل یہ تھی کی اگر وہ گدھ اب کسی پر حملہ کر دیں تو انہیں جان سے بھی مارا نہیں جا سکتا تھا۔ کیونکہ وہ مقدس گدھ ہیں۔ انہیں صرف ڈرا کر ہی بھگانے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔

کاوس کی موت کو ایک مہینہ ہو گیا۔ بہت سے لوگ تو اس کی خوفناک موت کو بھول بھی گئے۔ اس درمیان کوئی قابل ذکر واقعہ نہیں پیش آیا۔

ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے سب کچھ اپنے معمول کے مطابق چل رہا ہے۔

اچانک ایک دن اگیاری کا ایک ملازم دوڑتا ہوا اس کے پاس آیا اور خوفزدہ لہجے میں کہنے لگا۔

''مجھ پر ایک گدھ نے حملہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے شور مچایا تو وہ بھاگ گیا۔''

اس کی بات سن کر اس کے جسم میں خوف کی ایک لہر دوڑ گئی اور ماتھے پر پسینے کی بوندیں ابھر آئیں۔

اس کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا اور وہ کچھ سوچ میں ڈوب گیا۔

پھر اس نے ملازم کو ڈانٹتے ہوئے وہاں سے بھگا دیا۔

''تم کو دھوکہ ہوا ہوگا۔ وہ گدھ زمین پر پڑی کوئی چیز لینے کے لیے درخت سے اترا ہوگا۔ اور تم کو محسوس ہو رہا ہوگا کہ وہ تم پر حملہ کر رہا ہے۔ وہ مقدس گدھ ہیں۔ زندہ انسانوں پر حملہ نہیں کر سکتے۔ اور خاص طور پر یہاں رہنے والے لوگوں پر تو بالکل نہیں۔ کیونکہ وہ سب کو پہچانتے ہیں۔ جاؤ اپنا کام کرو۔ اور اس بات کو ذہن سے نکال دو۔

لیکن ایک دو دنوں میں ہی گدھوں کے حملہ پھر گفتگو کا موضوع بن گئے۔

دو چار ملازموں نے اس بات کی تائید کی تھی کہ گدھوں نے ان پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اور وہ کسی طرح انہیں بھگانے میں کامیاب رہے تھے۔

یہ بات سن کر اس کا سارا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا۔

اسے کاوس کی موت اور کاوس پر گدھوں کا کیا گیا حملہ یاد آ گیا۔ اسے محسوس ہونے لگا۔ اس بات میں کچھ نہ کچھ حقیقت تو ہے۔

ایک مہینہ سے زائد عرصہ ہو گیا ہے، کوئی میت نہیں آئی ہے۔ بھلے ہی گدھوں کو روز کھانا مل رہا ہے۔ لیکن جس انسانی گوشت اور لہو کی لذت ان کے منہ کو لگ چکی ہے۔ وہ انہیں نہیں مل رہی ہے۔ اس لیے شاید وہ اسے حاصل کرنے کے لیے، اگیاری اور برج خموشی کے ملازمین پر حملہ کر رہے ہیں۔

اس بات کا وہ کس سے ذکر کرے؟ اس مسئلہ کا کیا حل نکالے؟ اس کی تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

دو دن بعد وہ اگیاری کے باغ میں اکیلا ٹہل رہا تھا کہ اچانک دو گدھوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ گدھوں کے حملہ سے وہ گھبرا گیا اور چیختا ہوا اگیاری کی طرف بھاگا۔ گدھوں نے اس کا تعاقب کیا اور اس کے جسم کے کئی مقام پر اپنی نوکیلی چونچیں اور پیر گاڑھ دیے۔ جس کی وجہ سے اس کا جسم کئی جگہوں پر زخمی ہو گیا اور زخموں سے خون بہنے لگا۔

اس کی چیخیں سن کر اگیاری کے دو چار ملازم وہاں آ گئے اور انہوں نے گدھوں کو مار بھگایا۔ اور اسے زخمی حالت میں اگیاری میں لے آئے۔

ڈاکٹر آیا۔ اس نے اس کے زخموں کی مرہم پٹی کی۔

زخم معمولی تھے۔ لیکن اگر وہ خود کا بچاؤ نہیں کرتا تو گہرے بھی ہو سکتے تھے۔

اس نے فوراً برج خموشی، اگیاری اور پارسی پنچایت کے ممبران کی خصوصی میٹنگ اس سلسلے میں بلائی۔ میٹنگ میں تمام ممبران حاضر ہوئے۔ ان کے سامنے کاوس کی موت سے گذشتہ ایک مہینے میں پیش آنے والے واقعات پیش کیے گئے۔ اور اس کی وجہ بھی بتائی گئی۔ اور اس مسئلہ کا حل ان سے پوچھا گیا۔

''اگر معاملہ وہی ہے جو بتایا گیا ہے۔ اور ایسا لگتا ہے کہ ان واقعات کی وجہ بھی وہی ہے جو بتائی جا رہی ہے۔ تو ہم سمجھتے ہیں اس معاملے میں ہر کوئی اپنے آپ کو بڑا بے بس محسوس کرے گا۔ کیونکہ ہمیں محسوس ہو رہا ہے۔ ہم سب ملکر بھی اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں نکال سکتے ہیں۔'' ممبران نے بے بسی سے کہا۔

''لیکن آپ لوگوں کو اس مسئلہ کا کوئی نہ کوئی حل تو نکالنا پڑے گا۔ ورنا ممکن ہے دو چار دن بعد پھر برج خموشی کے کسی فرد کے ساتھ کاوس سا حادثہ پیش آئے۔ اور برج خموشی کے تمام فراد اسی طرح موت کا لقمہ بن جائیں۔ اس کے بعد شاید پھر باہر والوں کا نمبر آئے۔ تب آپ کیا کریں گے۔ یہی حال رہا تو کوئی بھی یہاں آنے کو تیار نہیں ہوگا۔ تو یہاں کا کاروبار کس طرح چلے گا۔'' اس نے زور دیکر کہا تو سارے ممبران کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

پھر اسے میٹنگ سے یہ کہہ کر باہر نکال دیا گیا کہ وہ اس سلسلے میں ایک خفیہ میٹنگ کرنا چاہتے ہیں۔

اس خفیہ میٹنگ میں کیا ہوا اسے کچھ پتہ نہیں چل سکا۔

ایک گھنٹے کے بعد تمام ممبران اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔

دو دن بعد اچانک رات کو اسے فون آیا۔

''شہر میں ایک بوڑھے پارسی کا خون ہو گیا ہے۔ دخمہ کرنے والوں کو لاش لانے کے لیے بھیج دیا جائے۔''

اوس میں بھیگتی لڑکی

رومانہ رومی
(کراچی)

اس کے گھر کی ٹیرس سے سامنے سمندر کا نظارہ بہت دلکش تھا اور یہی اس کی کمزوری بھی۔۔۔اس لیے شاید وہ اپنا زیادہ تر وقت ٹیرس پر ہی گزارتا تھا۔۔۔کچھ پڑھنے کا موڈ ہوتا یا لکھنے کی تحریک ہوتی وہ اسی تنہائی اور پُرسکون ماحول کا انتخاب کرتا اب تو تمام گھر والوں کو بھی اس بات کی اچھی طرح سمجھ آ گئی تھی کہ جب وہ ٹیرس پر ہوتا تو کوئی بھی اس کی تنہائی میں مداخلت نہیں کرتا تھا اور وہ دنیا سے بے خبر اپنی کہانی میں ڈوب جاتا تھا اور آج بھی ایسا ہی ہوا۔۔۔وہ اپنی کہانی کے کلائمکس پر پہنچ چکا تھا اور کہانی کی سانولی لڑکی اس کے سامنے جیسے جیتی جاگتی کھڑی تھی وہ اس کے طلسم میں ایسا کھویا ہوا تھا جیسے کوئی موکل اپنے آقا کے حضور ہاتھ بندھے کھڑا ہو۔۔۔اس کے ذہن نے اسے لڑکی کے اندر مکمل ڈوبا ہوا محسوس کر کے اس کے اس طلسم کو توڑنے کے لیے اسے سگریٹ کی طلب کی جانب موڑ دیا اور اس نے بے اختیار سگریٹ کا ڈبہ اُٹھایا جس میں سے اب آخری سگریٹ جھانک رہا تھا اس نے غنیمت جانا اور اسے جلا کر ایک لمبا کش لے ڈالا۔۔۔ذہن میں جیسے سکون سا بھر گیا اور وہ پھر سے کہانی میں ڈوب گیا۔۔۔وہ جب بھی کوئی کہانی لکھنا شروع کرتا تو اس وقت تک تنہائی میں رہتا جب تک وہ اسے مکمل نہ کر لیتا۔۔۔وہ ایک جانا مانا قلم کار تھا اس کے افسانے جدید طرزِ تحریر کے لاجواب شاہکار مانے جاتے تھے۔۔۔اور وہ ان پر کام بھی بہت لگن سے کرتا تھا۔۔۔رات کا آخری پہر اپنے جوبن پر تھا اور پورے ماحول پر ایک نادیدہ سکوت طاری تھا۔۔۔ہلکی ہلکی سردی میں اس وقت اوس کی نمی ماحول پر طلسم طاری کیے ہوئے تھی۔۔۔وہ چونکا کہ کہیں دور سے کسی مرغ کی بانگ نے زمین پر قابض خاموشی کے راج کو توڑ کر زندگی کے نئے تر و تازہ دن کی نوید دی، وہ تھک چکا تھا اس نے ایک طویل انگڑائی لی اور سگریٹ کے ڈبے کو افسردہ نظروں سے دیکھا۔۔۔اسے اس وقت سگریٹ کی طلب نے ایسا بے بس کیا کہ وہ کسی روبوٹ کی طرح کرسی سے اُٹھا اور سگریٹ کی جستجو میں چل پڑا۔۔۔سڑک کے کنارے کچھ دوری پر پان والا اپنے کھوکھے کا شٹر گرائے اندر بے خبری کی نیند سویا ہوا تھا اور اس کے خراٹوں کی آواز خاموشی میں دور سے سنائی دے رہی تھی۔۔۔اس نے دروازے کو پہلے ہلکے اور بعد میں تیزی سے بجایا تو پان والا غراّتے ہوئے اُٹھا۔۔۔اس سے پہلے کہ پان والا بے قابو ہوتا کہانی کار نے اس کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے معذرت طلب لہجے میں سگریٹ طلب کی۔۔۔کہانی کار کی آنکھوں میں سگریٹ کے لیے بے چینی۔۔۔درد اور شدتِ طلب کو دیکھ کر پان والے نے منہ میں آئے لفظوں کو اپنے اندر ہی گلہ دبا کر مار دیا اور نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا طلب کردہ برانڈ اس کے ہاتھوں میں تھما دیا۔۔۔کہانی کار نے بے صبری سے سگریٹ کا پہلا کش ہی اتنا طویل لگایا کہ پان والے نے بھی اسے حیرت سے دیکھا۔۔۔اب اس کے چہرے پر اطمینان آیا اور وہ خراماں خراماں گھر کی جانب پلٹا۔۔۔سگریٹ کے کش کے بعد اسے چائے کی طلب ہوئی اور وہ کچن میں جا کر اپنے لیے چائے بنانے لگا۔۔۔اس نے سوچا کہ پہلے صوفے پر بیٹھ کر آرام سے چائے پی لوں پھر کہانی کا اختتام لکھوں گا۔۔۔اور وہ چائے بنا کر کاؤچ پر، پُرسکون انداز میں پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا اور آرام سے چائے کی چسکیاں لینے لگا۔۔۔آخری گھونٹ کا بھر پور مزا لیتے ہوئے اُس نے کپ ٹیبل پر رکھا اور یہ سوچ کر ایک اور سگریٹ سلگائی کہ پھر سکون سے کہانی مکمل کروں گا ایک لمبا کش لگا کر اس نے صوفے کی پشت پر اپنی گردن گرائی اور پھر اسے کچھ خبر نہ رہی۔۔۔دن اُگ چکا تھا، اس کی آنکھ کسی نا معلوم آواز کی شدت پر کھلی پہلے تو وہ حیرت سے اپنے اردگرد دیکھنے لگا پھر آہستہ آہستہ اس کے اعصاب بحال ہونا شروع ہوئے۔۔۔اور اب اسے رات والی کہانی کی یاد آئی۔۔۔اس نے ایک تھکن زدہ انگڑائی لی اور باتھ روم کی طرف بڑھتے ہوئے ذہن کو مکمل طور پر جگانے کی کوشش کرنے لگا منہ دھونے کے بعد اسے یاد آیا کہ رات وہ اپنی کہانی تو ٹیرس پر ہی چھوڑ آیا تھا وہ جلدی سے باہر لپکا اور ٹیرس کا دروازہ کھول کر دیکھا تو اس کا دل یہ دیکھ کر بیٹھ ہی تو گیا کہ کہانی پر اوس نے اپنا قبضہ جما دیا تھا کاغذ پر لفظ آپس میں الجھے پڑے تھے۔۔۔سفیدی اور سیاہی میں گھمسان کی جنگ چھڑی ہوئی تھی۔۔۔اور کہانی والی سانولی لڑکی ٹیرس کے کونے میں اُداس کھڑی۔۔۔ویران نظروں سے خود کو سورج کی کرنوں سے بھاپ میں تحلیل ہوتا دیکھ رہی تھی۔۔۔وہ اسے سورج کی کرنوں سے بچانے کے لیے لپکا مگر اوس بھاپ بن چکی تھی اور وہ اپنی تخلیق کو ہوا میں غائب ہوتا دیکھ رہا تھا۔۔۔!!!

بلغ العلیٰ بکمالہٖ

حسن و خوبی دیکھنا چاہو مجسم تم اگر
ہے وہ ہستی ایک ہی جس کو کہیں خیر البشر
رتبہ اعلیٰ اُس کو اللہ سے ملا ایسا کہ ہیں
پیچ اُس کے سامنے سب ساکنانِ بحر و بر

حافظ محمد احمد
(راولپنڈی)

فاصلے اور دُوریاں

شاہینہ یوسف
(گاندربل، کشمیر)

میں زندگی میں اتنا کسی چیز سے خوف زدہ نہیں ہوتی جتنا میں اپنوں کے خفا ہونے سے ہوتی ہوں' لیکن یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ انسان جس چیز سے جتنا ڈرتا ہے وہ چیز زندگی میں بار بار اس سے ڈراتی ہے۔ میں نزدیکی پارک میں ان ہی خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ اسی دوران عالیہ اچانک سامنے آ گئی۔ اسے دیکھتے ہی مجھ پر خوشگوار کیفیت طاری ہوئی اور میں نے مسکراتے ہوئے دھیمے لہجے میں پوچھا:

''کہاں تھی اتنے دنوں سے؟''

میری بات سنتے ہی وہ بھڑک اٹھی اور بولی ''آپ کو کیا؟۔''

مجھے عالیہ کا لہجہ ناشائستہ لگا۔ ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اس کی آواز میں ایک خنجر تھا جو سیدھا میرے دل میں جا لگا۔ لیکن میں نے جب تحمل سے کام لیکر حق دوستی ادا کرتے ہوئے اپنا سوال پھر سے دہرایا تو وہ زاروقطار رونے لگی اور میرے گلے لگ کر مجھ سے فون نہ کرنے کی شکایت کر بیٹھی۔ مجھے اس کے رونے سے اپنی غلطی کا احساس تو ہوا لیکن مجبوریوں میں جکڑا انسان آخر کرے بھی تو کیا کرے۔ میں عالیہ کو کیا بتاتی کہ ہمارے گھر میں کئی دنوں سے کھانا نہیں بنا ہے اور تو اور جو فون میرے پاس تھا جس سے ہم کبھی کبھار باتیں کیا کرتے تھے' اُس کو بیچ کر کچھ دِن فاقہ کشی سے نجات حاصل کی۔ خیر عالیہ کی ناراضگی ہمیشہ کی طرح چند ہی لمحوں میں رفو چکر ہوگئی اور وہ اپنے منگیتر کے قصے سنانے میں مشغول ہوگئی لیکن میں نہ جانے کس دنیا میں کھونے لگی۔ میں اس کی باتیں یوں تو سن رہی تھی لیکن ان باتوں کے معنی سمجھنے سے قاصر تھی۔ میں دل ہی دل میں کسی ایسی جگہ جانے کی تمنا کر رہی تھی جہاں میرے ساتھ میرا کوئی اپنا، اور وہ اپنا بھی ایسا جو صرف اور صرف میرا ہو، جو میرے دل کی اُداسی سمجھ لیتا اور تو اور جس کے کندھے پے سر رکھ کر میں عالمِ بے ہوشی میں چلی جاتی۔ لیکن میری قسمت میں یہ سب شاید نہ لکھا تھا۔ میری قسمت میں کسی ایسے انسان کی آمد شاید ایک خواب ہی تھا۔ عالیہ اس معاملے میں نہایت خوش نصیب تھی جو اُسے اتنا پیار کرنے والا جیون ساتھی ملا تھا۔ خیر یہ بات تو اپنے اپنے مقدر کی ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد ہم دونوں اپنے اپنے گھروں کی طرف چل دئے اور جاتے جاتے ایک دوسرے سے دوبارہ ملنے کا وعدہ کیا۔

رات کو میں نے خواب میں دیکھا کسی انجان راستے پر ہم دونوں کی ملاقات ہوگئی۔ بات کرتے کرتے عالیہ کچھ اجنبیوں سا رویہ دکھا رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ اجنبی پن کی وجہ پوچھوں لیکن میرے ضمیر نے مجھے اجازت نہ دی اور ہم دونوں ایک ساتھ چلتے رہے لیکن محتاط انداز سے۔ شاید یہی وقت وہ ہوتا ہے جب انسان سب کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی بالکل اکیلا ہوتا ہے۔ اسی اثنا میں ایک خوبصورت جوڑا سڑک پر نمودار ہوا۔ ان کے مسکراتے چہرے دیکھ کر لگ رہا تھا کہ وہ ہر چیز سے بے نیاز ہو کر زیست کا مزہ لے رہے ہیں اور اس مستی میں چل رہے تھے کہ انہیں دیکھ کر دوسرے لوگوں میں زندگی جینے کا حوصلہ جاگ رہا ہو۔ ان کے پیچھے پیچھے کئی لوگ کھوے سے کھوا ملا رہے تھے۔ سب ہی لوگ اپنے اپنے حال میں مگن تھے۔ یہ لوگ جوں جوں آگے بڑھتے گئے ان لوگوں کی تعداد جیسے کم ہوتی گئی اور ایک لمحہ ایسا آیا جب ان سارے لوگوں کا وجود ہی نیست و نابود ہوگیا۔ یہ منظر دیکھ کر میں بے حد رنجیدہ ہوگئی اور میں نے عالیہ سے ان لوگوں کے بارے میں ذکر کرنا چاہا لیکن عالیہ اس معاملے میں بے خبر تھی' نہ جانے وہ آج ایسی کیوں بن گئی تھی کہ جس کا سروکار اپنے آپ کے سوا کسی سے بھی نہ تھا۔ میں نے وقت ضائع کیے بغیر ان لوگوں کا پیچھا کرنا چاہا لیکن بہت مسافت طے کرنے کے بعد بھی میں ان لوگوں کا کوئی سراغ نہ لگا پائی۔ شاید یہ لوگ اب ایسی دنیا میں چلے گئے تھے جہاں سے ان کا واپس لوٹنا محال تھا۔

''ان لوگوں کے ساتھ آخر ہوا کیا؟''

''آخر ان لوگوں کی غلطی کیا تھی؟''

''ابھی تو چاروں طرف رونق تھی؟''

''یہ لمحہ بھر میں سب کچھ کیسے بدل گیا؟''

''یہ لوگ صرف ایک ساتھ چل رہے تھے اس کے علاوہ تو ان کی کوئی غلطی نہ تھی۔ پھر۔۔۔ پھر۔۔۔ یہ کیا ہوگیا۔''

میں زور زور سے بڑبڑانے لگی۔ کیا انسان ہمیشہ سے ایسے ہی اللہ کے فیصلوں کے سامنے سرخم کرنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے۔ میں نے عالیہ کو بہت سمجھانا چاہا کہ ہم اس قافلے کے بارے میں کسی سے بات کریں گے۔ لیکن اس کی سرد مہری دیکھ کر میں خاموش ہوگئی۔

صبح نیند سے بیدار ہو کر میں نے اپنے چھوٹے بھائی وصی سے سب کچھ کہنا چاہا' وصی یوں تو میرا بھائی ہے اور ہمارے درمیان بھی ہر ایک بھائی بہن کی طرح روز لڑائی ہوتی رہتی ہے۔ لیکن جب بھی مجھے کوئی پریشانی ہوتی ہے تو وصی میرا ہمدرد بن جاتا ہے اور ہم سکھ دکھ میں ایک دوسرے کی ڈھال بن جاتے ہیں۔ جوں ہی میں نے وصی سے خواب میں ان لوگوں کا ذکر کیا جن کا وجود میری نظروں کے سامنے ماضی بن گیا تھا تو اس نے مجھے چپ رہنے کا مشورہ دیا اور مجھ سے کہا کہ اپنے کام سے کام رکھو۔ میں نے کئی بار وصی سے پوچھا آخر کیوں؟ ہم تو یہاں اس دنیا میں ایک دوسرے کا دکھ سکھ بانٹنے آئے ہیں پھر آپ اس طرح کے الفاظ استعمال کر کے زندگی کا اصلی مقصد کیوں بدل رہے ہیں۔

ناشتہ کرنے کے بعد میں نے عالیہ کے گھر کی راہ لی۔ عالیہ

نے جوں ہی میری آمد کا سنا وہ بیدار ہو کر مجھے گھر میں اندر بلانے کی بجائے اپنے صحن میں لے گئی۔ میں نے خواب کا ماجرا اسے بھی سنایا۔ وہ حیران ہو کر مجھ سے کہنے لگی تم؟ تم یہاں اتنے سویرے کیسے؟ تم اندر کیسے آئی؟ میں نے عالیہ سے ہاتھ ملانا چاہا لیکن اُس نے مجھ سے ہاتھ نہ ملایا۔ میں جتنا اس کے قریب ہونے کی کوشش کرتی وہ اتنا ہی مجھ سے دور ہو جاتی۔ میں نے اس کی اس بے اعتنائی کے بارے میں کئی بار پوچھا۔ جس کا وہ ایک ہی جواب دیتی رہی:

''سب ختم۔ اب ایک دوسرے سے فاصلے رکھنے میں ہی بھلائی ہے۔ ورنہ وہ دن دور نہیں جب ہم سب کا وجود اس کُرہ ارض سے بہت جلد مٹ جائے گا اور ہمارے ساتھ بھی۔۔۔''

''کیا ہمارے ساتھ بھی۔۔۔ ہمارے ساتھ بھی کیا۔۔۔'' میں نے عالیہ کی بات کاٹ کر پوچھا۔

''ہاں... ورنہ ہم بھی اسی جگہ پہنچ جائیں گے جہاں وہ قافلہ گیا'' عالیہ نے جواب دیا۔ ''اس قافلے کو بھی وہی بے وقوفی لے ڈوبی جس کی زد میں شاید ہم بھی آنے والے ہیں، اگر ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ فاصلہ نا رکھا تو۔''

میں یوں تو عالیہ کی باتیں غور سے سن رہی تھی لیکن میرے پلے کچھ نہ پڑ رہا تھا۔ اتنے میں مجھے کوئی زور زور سے آوازیں دینے لگا میں نے غور سے سنا تو میرا بھائی مجھے ڈھونڈنے آیا تھا۔ میں اسے دیکھ کر دنگ رہ گئی کیوں کہ اس کا مجھے بلانے آنا معمول کے خلاف تھا۔ وہ زور زور سے آوازیں لگا رہا تھا کہ ''لاک ڈاون ''شروع ہوا ہے گھر جا کر رہو ورنہ سخت کاروائی ہوگی۔ یہ سن کر میں بھائی کے ساتھ گھر چلی گئی اور حسبِ معمول اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔ شام کا کھانا کھا کے ہم سو گئے۔ صبح نیند سے بیدار ہونے کے بعد میں نے اپنے آپ کو ایک انجان کمرے میں بند پایا۔ میرے اردگرد کوئی بھی نہ تھا اور تو اور میرے کمرے کا دروازہ کسی نے باہر سے ہی بند کر دیا تھا۔ میں نے کافی آوازیں لگائی لیکن کوئی ٹس سے مس نہ ہوا۔ جب میں اس تنہائی میں خوفزدہ ہوئی تو میں نے کمرے میں بھائی کا فون دیکھا اور امی جان کو فون کر کے غصے سے اس حالت کے بارے میں پوچھتی رہی۔ امی جان نے اس بے اعتنائی سے میری باتیں سنی جیسے وہ اس کے بارے میں پہلے سے جانتی تھی۔ وہ بولی تُو پرسوں پارک میں جن لوگوں سے ملی تھی وہ باہر کے ممالک سے آئے ہوئے تھے۔ جو اپنے ساتھ ''کوئی وبائی بیماری لے کے آئے تھے اس لیے ان لوگوں کی موت کے بعد پولیس نے اس قافلے کے قریب جانے والے ہر شخص کو ''کورنٹائین'' میں رکھا ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ تو بھی اسی قافلے کے کافی نزدیک گئی تھی اس لیے تیرا یہ حال ہے۔ اور تجھ سے جڑی ہر چیز کو ''سینیٹائز'' کیا گیا ہے۔ یہ کہہ کر امی جان نے فون کاٹ دیا۔ میں کھڑکی کے نزدیک چلی گئی اور آسمان کی جانب نظر دوڑائی، آج آسمان بھی بے رونق لگ رہا تھا، گلیاں کوچے، سماو ارض سب جیسے میری طرح ''کورنٹائین'' میں رکھے گئے تھے۔ اور میں خواب کی تعبیر میں کھو گئی۔

Arabic Friendship

1. Zameel - someone you have a nodding acquaintance with
2. Jalees - someone you're comfortable sitting with for a period of time
3. Sameer - you have good conversation with them...this is where things get serious
4. Nadeem - a drinking companion (just tea) that you might call when you're free
5. Sahib - someone who's concerned for your wellbeing ... now we're in the real ranks of friendship
6. Rafeeq - someone you can depend upon. You'd probably go on holiday with them
7. Sadeeq - a true friend, someone who doesn't befriend you for an ulterior motive
8. Khaleel - an intimate friend, someone whose presence makes you happy
9. Anees - someone with whom you're really comfortable and familiar
10. Najiyy - a confidant, someone you trust deeply
11. Safiyy - your best friend, someone you've chosen over other friends
12. Qareen - someone who's inseparable from you. You know how they think (and vice versa)

افسانچے

ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا

(دہلی)

فرار

آشرم میں ہلچل مچ گئی۔ چین سے ایک ایسی بیماری آئی ہے کہ آدمی چلتے پھرتے، کھڑے کھڑے بیمار ہوتا ہے اور مرجاتا ہے، جو اسے چھولے وہ بھی مرجاتا ہے۔ ساری دنیا میں لاک ڈاؤن ہو چکا ہے اب بھارت میں بھی ہونے والا ہے۔ سوامی جی نے سنا تو ان کے چہرے پر خوف کا سایہ سا گذر گیا۔ جان کسے پیاری نہیں ہوتی۔ اسی سال کی عمر میں بھی مایا موہ سے آزاد نہیں ہوئے تھے۔ سینکڑوں آدمی دن میں ان کے چرن اسپرش کرتے ہیں! جان بچانے کا ایک ہی طریقہ نظر آیا۔ معلوم کیا لاک ڈاؤن کب تک چلے گا؟ بتایا گیا ''دو تین مہینے تو لگ ہی جائیں گے۔'' انھوں نے اعلان کیا ''ہم بھگتوں کے کلیان کے لیے سمادھی لیں گے۔''

آناً فاناً خبر چاروں طرف پھیل گئی۔ انتظامیہ سے اجازت ملتے ہی مقررہ دن، تاریخ اور وقت پر ضلع کلکٹر، پولیس اور ڈاکٹروں کی ٹیم کے علاوہ بھگتوں کی موجودگی میں ٹھیک تین بج کر دس منٹ پر یوگ اوستھا میں بیٹھے ہوئے سوامی جی کو سمادھی میں اتار کر سمادھی کو پاٹ دیا گیا۔ نشانی کے لیے بانسوں پر زعفرانی جھنڈوں سے گھیرا بنا دیا گیا۔ بھجن، کیرتن شروع ہو گئے دو تین بھگتوں نے وہیں ڈیرا ڈال دیا۔

تین ماہ گزر گئے۔ نہ کورونا گیا اور نہ لاک ڈاؤن کھلا لیکن سوامی جی کی سمادھی کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ انتظامیہ کے افسران اور ڈاکٹروں کی موجودگی میں مقررہ وقت پر سوامی جی کو سمادھی سے نکال کر ان کے کٹیا میں پہنچا دیا گیا۔ سانسیں بحال ہو چکی تھیں ڈاکٹر جانچ میں جٹ گئے۔ ان میں ایک ڈاکٹر Asymtamatic کورونا پازیٹو بھی تھا جو قریب سے ان کی سانسوں اور دل کی دھڑکن پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

تیسرے دن سوامی جی کے پران پکھیرو اڑ گئے۔

ہوم کورنٹائن

وشال اپنے بچوں کو ان کے ننیہال سے لینے جا ہی رہا تھا کہ اس کے موبائیل پر پیغام کا اشارہ موصول ہوا اور پیغام پڑھ کر تو لگا جیسے کسی نے اس کے اعصاب کی ساری طاقتیں سلب کر لی ہوں۔ پاپا کی کورونا رپورٹ پازیٹو تھی۔ انھیں دو تین دن سے بخار تھا اس لیے اس نے احتیاطاً کورونا کا ٹیسٹ کروالیا تھا۔ رپورٹ دیکھ کر تو ہاتھ پاؤں سُن ہو گئے لیکن دماغ نے تیزی سے کام کرنا شروع کر دیا۔ پاپا اپنی خواب گاہ میں شاید سو رہے تھے۔ اس نے جلدی جلدی ان کا ضروری سامان سمیٹا اور تیسری منزل پر بنے 6x6 کے سروینٹ کواٹر میں پہنچا دیا۔ پاپا کو جگا کر صورت حال بتائی تو وہ فق رہ گئے۔ انھوں نے کانپتی آواز میں پوچھا ''کیا اسپتال لے جا رہے ہو؟''

''نہیں پاپا سرکاری اور آرمی اسپتالوں میں جگہ نہیں ہے اور پرائیویٹ اسپتال بہت مہنگے ہیں۔ آپ گھر میں ہی آرام سے کورونٹائن میں رہیں گے۔'' وشال نے انھیں سروینٹ کواٹر میں پہنچایا تو اسے لگا ان کے پلکوں پر ایک ستارہ جھلملا رہا تھا۔

''بچوں کا خیال رکھنا''۔

اس نے پانی کا کین اور کھانے کا سامان ایک ڈبے میں ڈال کر کمرے کے باہر چوکھٹ پر رکھ دیا۔ گھر کو سینا ٹائز کیا، غسل کیا کتے کے کھانے کا پیالہ ڈائننگ ٹیبل پر رکھ کر اسے آرام سے بٹھایا۔

گاڑی باہر نکالتے ہوئے اس کی نظر دو منزلہ شاندار عمارت کے پھاٹک پر لگی پیتل کی نیم پلیٹ پر پڑی جو دھوپ کی کرنوں میں کندن بنی ہوئی تھی۔ ''بریگیڈیر مہندر پرتاپ سنگھ''۔

''مجھے کیا برا تھا مرنا اگر......''

بادشاہِ وقت نے جب محسوس کیا کہ فرہاد نامی یہ آدمی تو شہزادی شیریں کے پیچھے ہی پڑ گیا ہے اور شہزادی بھی اس کے عشق میں دیوانی ہوئی جا رہی ہے تو اس نے اپنے وزیر کو جو عقل و دانش میں لقمان کا ورثہ تھا بلایا اور مشورہ کیا۔ وزیرِ باتدبیر نے ایک رام بان تجویز پیش کی۔

اگلی صبح بادشاہ نے فرہاد کو بلایا اور پوچھا ''تم شیریں کو پانے کے لیے کیا کر سکتے ہو؟'' فرہاد نے جواب دیا ''جان بھی دے سکتا ہوں جہاں پناہ! پہاڑوں کو کاٹ کر دودھ کی نہریں بہا سکتا ہوں۔ صحرا کو گلزار بنا سکتا ہوں'' بادشاہ نے کہا ''نہیں نہیں! ہمیں یہ سب کچھ نہیں چاہئے۔ یہاں سے مشرق کی طرف سمندر پار ایک ملک ہے ہندوستان۔ وہاں کے دارالسلطنت دہلی چلے جاؤ۔ جدوجہد کرو، ایک ماہ میں دس لاکھ روپیہ کما کر ہماری خدمت میں پیش کرو۔ شیریں تمہاری ہے۔''

فرہاد خوشی خوشی فوراً روانہ ہو گیا۔ دہلی پہنچ کر دیکھا کہ یہاں تو قیامتِ صغرا کا منظر ہے۔ وبا نے قہر مچا رکھا ہے۔ گھر کے گھر بیماروں سے بھرے ہیں۔ صاحب روزگار بے روزگار ہو گئے ہیں۔ اسپتالوں میں لوگ دواؤں اور دیگر اشیاء کی کمی سے مر رہے ہیں۔ قبرستان اور شمشان میں جگہ نہیں ہے۔

بصورتِ مجنوں ایک ماہ دردر کی ٹھوکریں کھانے کے بعد، جو پونجی لایا تھا وہ بھی ختم ہو گئی۔ وبا کا شکار ہو کر بھوکے پیٹ ڈاکٹر، دوا اور آکسیجن کی عدم دستیابی سے جھوجھتے ہوئے ایک سرکاری اسپتال کے سامنے فرہاد نے آخری سانسیں لیتے ہوئے سوچا ''کاش جہاں پناہ نے کوہ کنی کی شرط رکھی ہوتی۔''

"دائمی نقش ونگار"

ڈاکٹر ریاض احمد
(پشاور)
(نذرِ مرحوم یوسف خان المعروف دلیپ کمار)

کیسے کیسے لوگ مل جاتے ہیں راہ زیست میں
چھوڑ جاتے ہیں وہ دل پر دائمی نقش و نگار

اور کچھ ایسے بھی ملتے ہیں خلوص و پیار سے
جب بچھڑتے ہیں تو رہ جاتی ہیں یادیں خوشگوار

رنجشیں شکوے تو تھے لیکن مروّت پھر بھی تھی
خود چلے آتے تھے ملنے، دل کو تھامے بے قرار

خویش اور احباب کے ہوتے ہیں لازم کچھ حقوق
میں رہا غافل ہمیشہ، معذرت جانِ بہار

یاد آتے ہیں وہ دن جب سامنے آتے تھے وہ
بھول جاتا ہوں میں سب کچھ، لے کر آنکھیں اشکبار

لوٹ سکتا پھر نہیں جو چل پڑا اس راہ پر
یہ سفر یکطرفہ ہے کوئی کرے نہ انتظار

اِس جہاں میں امتحاں ہے جو بھی آتا ہے یہاں
آگ سے کھیلے یا بچ نکلے ہے اسکو اختیار

کامیابی پا سکو گر اِس جہاں میں تم ریاضؔ
منتظر ہیں نعمتیں پھر اُس جہاں میں بے شمار

احمد سراج فاروقی
(راجستھان)

اب کے دل پر وہ حادثہ ٹوٹا
اس کے غم کا بھی آسرا ٹوٹا

ہو گئے ختم سارے افسانے
اس سے ملنے کا سلسلہ ٹوٹا

زندگی کی بکھر گئیں کڑیاں
میرے اندر نہ جانے کیا ٹوٹا

زندگی ہو گئی ہے بوجھل سی
جیسے جینے کا حوصلہ ٹوٹا

گر چکے ہیں بلندیوں سے مگر
پھر بھی اپنا کہاں نشاں ٹوٹا

ہم نے اپنی انا بچائے رکھی
دل کا کیا دل تو بارہا ٹوٹا

ڈھونڈتے پھر رہے ہیں خود کو سراج
جب سے اس دل کا آئینہ ٹوٹا

انیس الرحمٰن
(سکھر)

جب تری یاد کا مہتاب نکل آتا ہے
موسمِ ہجر کا منظر ہی بدل جاتا ہے

تیری مخمور نگاہوں میں جو آ جائے، وہ
ہوش میں کب بھلا آتا ہے، سنبھل پاتا ہے!

تیری باتوں سے سجا لیتا ہوں محفل اپنی
تیری یادوں کا دِیا شام سے جَل جاتا ہے

بھول سکتا ہی نہیں ساتھ گزارا ہوا وقت!
تیری فرقت سے یہ دِل اب بھی مچل جاتا ہے

مشکل اوقات گزارو تو گزر جاتے ہیں
صبر کی فصل میں کچھ دیر سے پھل آتا ہے

جاناں ملک
(راولپنڈی)

رات گئے کتنی آوازیں آتی ہیں
رونے والوں کی آوازیں آتی ہیں

اپنے دل پر کان دھروں تو سنتی ہوں
سب بھولی بسری آوازیں آتی ہیں

روشندان کھلا رکھتی ہوں کمرے کا
صبح پرندوں کی آوازیں آتی ہیں

جب تتلی پھولوں کو گیت سناتی ہے
کان میں رس بھرتی آوازیں آتی ہیں

روشنیوں کے پیچھے اک تاریکی ہے
لہجوں سے مرتی آوازیں آتی ہیں

کون یہاں ڈوبا، جو پار نہیں اترا
پانی سے گہری آوازیں آتی ہیں

کیا کیا لوگ یہاں پر جاناں تھے آباد
مٹی سے کیسی آوازیں آتی ہیں

○

ذکی طارق بارہ بنکوی
(بھارت)

مناتا ہوں مگر ویسے ہی بس روٹھے ہوئے سے ہیں
وہ شاید ترکِ الفت کی قسم کھائے ہوئے سے ہیں

تمہارے ہجر کے صدموں نے حالت یہ بنا دی ہے
نہ ہم سوئے ہوئے سے ہیں نہ ہم جاگے ہوئے سے ہیں

بس اتنے سے سمجھ لو کوئے جاناں کے فضائل تم
گلوں کے مثل ہی کانٹے وہاں مہکے ہوئے سے ہیں

اے میرے صبر زندہ باد اے میری پیاس زندہ باد
جو پیمانے کہ خالی تھے وہ سب چھلکے ہوئے سے ہیں

مری پرواز پہلے جیسی رفعت کیوں نہیں پاتی
ذرا دیکھو تو کچھ پر کیا مرے کترے ہوئے سے ہیں

بظاہر اور بہ باطن میں یہی اک فرق ہے صاحب
وہ میرے ساتھ میں تو ہیں مگر بچھڑے ہوئے سے ہیں

ترے دل میں بھی کیا چاہت کے نرم احساس جاگ اٹھے
ترے انداز آخر آج کیوں بدلے ہوئے سے ہیں

ضرور ان سے جنوں بردوش دیوانے گئے ہونگے
پہاڑوں اور چٹانوں پہ جو رستے ہوئے سے ہیں

○

انجم جاوید
(کراچی)

مری پلکوں پہ جب اشکوں کے دھارے رقص کرتے ہیں
گماں ہوتا ہے یوں جیسے ستارے رقص کرتے ہیں

کوئی جب چھیڑتا ہے گیت اپنے دل کے تاروں پر
فضائیں جھوم اٹھتی ہیں نظارے رقص کرتے ہیں

نچھاور شمع پر کرتے ہیں اپنی جان پروانے
سمجھتی ہے یہ دنیا غم کے مارے رقص کرتے ہیں

مرے ساقی کبھی چلتے نہیں خود ساغر و مینا
نگاہ مست کے پا کر اشارے رقص کرتے ہیں

ادھر مفلس کے گھر میں بھوک اور افلاس ہیں رقصاں
ادھر قصر طرب میں ماہ پارے رقص کرتے ہیں

مرے دل کو جلے تو ایک مدت ہو گئی لیکن
ہوا کے دوش پر اب بھی شرارے رقص کرتے ہیں

کسی کی یاد میں سیماب پا تم ہی نہیں انجم
وفور کرب میں ہمیشہ تو پیارے رقص کرتے ہیں

○

ملک زادہ جاوید

(نوئیڈا)

ہم اندھیروں کا مقدر ہو گئے — جب اجالے بھی ستمگر ہو گئے
نفرتیں در نفرتیں در نفرتیں — موم جیسے لوگ پتھر ہو گئے
اُنکی نظروں میں ہماری کیا بساط — مفت میں جنکو میسر ہو گئے
جنکو میرے در سے ملتا تھا نمک — حیثیت میں مجھ سے بہتر ہو گئے
تُم ہماری آنکھوں میں جب سے بسے — ہم کسی کے دل سے باہر ہو گئے
چلئے اے جاوید کھودیں پھر کنواں — جتنے پیسے تھے برابر ہو گئے

ارشد سعید

(آسٹریلیا)

گر میں رنج وغم اشعار میں سارے سجا دوں تو — پھر اس کے بعد دل کا غم، غمِ دوراں بنا دوں تو
عروسِ زندگی تم ہو دھنک کے رنگ ہیں تم سے — لکھی تھی جو غزل تم پر وہ محفل میں سنا دوں تو
مسرت کے دنوں میں یہ اداسی کس لئے آخر — ذرا مسکان چہرے پر تمہارے میں کھلا دوں تو
وہ پتھر پھر بھی برسیں گے جنوں ہوگا وہاں پر بھی — اگر صحرائے الفت سے میں تم کو اک صدا دوں تو
جو باہم رنجشیں ہیں اس طرح شاید وہ مٹ جائیں — اگر دل پر لکھی اپنی محبت میں دکھا دوں تو
عجب سا وہم ہے دل میں عجب سا خوف ہے ارشد — نجانے کیا بنے میرا اگر تم کو گنوا دوں تو

اشفاق اسانغنی

(ممبئی)

رونق وہ محفلوں کی ہوا کرتے تھے کبھی — اب حال یہ کہ پوچھنے والا نہیں کوئی
مل کر کبھی گمان کو بدلو یقین میں — مثلِ سراب اور نہ بھڑکاؤ تشنگی
اُونچائیوں کو چُھونا شغل تو رہا مگر — وابستگی زمیں سے ہماری نہ کم ہوئی
شاید دیئے نے بھانپ لیا ہے مزاجِ وقت — لَو پھڑپھڑا رہی ہے ہوا کے بغیر بھی
رنجیدہ کل کو ہوگا جو مسرور آج ہے — خوشیاں جہاں میں کس کو میسر ہیں دائمی
سو جائے قوم گر تو جگانا محال ہے — دُکھتی رگوں پہ اُنگلی دبائے رکھو ابھی
بے چہرگی کا عیب وبا بن گیا ہے اب — محروم آئینوں سے ہُوا جائے آدمی
کبتک دبائے رکھو گے مکر وفریب سے — خود اپنے دم پہ اُبھریگی اک روز راستی
اشفاق شاعری کا تقاضہ ہے یہ اہم — فکر و شعور کو ملے قاری کے تازگی

احمد سوز

(ممبئی)

اچھا ہوتا ہے ہارنا بھی کبھی — نفس کو اپنے مارنا بھی کبھی
آئینے سے الگ ہے یہ منظر — اپنے بھیتر نہارنا بھی کبھی
دو بدو آئینے سے ہو جانا — اپنا غصہ اتارنا بھی کبھی
میرا کمرہ بھی عشقیانہ ہے — سنگ میرے گزارنا بھی کبھی
اپنی بانہوں میں مجھ کو بھر لینا — ہاتھ اپنے پسارنا بھی کبھی
اچھی لگتی ہو سج سنور کے تم — اپنے دل کو سنوار نا بھی کبھی
لفظ و معنی سے آگے ہے دنیا — سرحدیں سوز پارنا بھی کبھی

○

ارشد مرشد

(نیویارک)

اے محبت ترا جمال ہیں ہم — عشق کا مرکزی خیال ہیں ہم
کیوں ستاتے ہو ہم فقیروں کو — دیکھو پہلے ہی خال خال ہیں ہم
شاہ کو مات ہونے والی ہے — چلنے والے اک ایسی چال ہیں ہم
بھوک کے چانٹے کھائے ہیں ہم نے — خلق کا بدنصیب گال ہیں ہم
جس نے لا کو اِلا بنا ڈالا — ہاں وہی ندرتِ خیال ہیں ہم
سنگ باری میں سارے دوست ہمیں — آگے رکھتے ہیں جیسے ڈھال ہیں ہم

○

اوصاف شیخ

(کراچی)

یوں تیرے ہجر کا وظیفہ کیا — پل میں رات کو لپیٹ دیا
زندگی کا تو جام تھا بھر پور — میں نے شاید بس ایک گھونٹ پیا
رات جو ادھڑی کھینچا تانی میں — پھر سے اک دن پکڑ کے رات کیا
شام کاسے میں بھر کے لائی سوال — رات بھر ایک اک جواب سیا
جب میں اوصاف لڑکھڑانے لگا — اپنے سائے کو میں نے تھام لیا

○

ڈاکٹر نبیل احمد نبیل

(لاہور)

وفا کا وہ جو تقاضا تھا یاد بھی نہ رہا
جنوں کو حسن پہ اب اعتماد بھی نہ رہا

مجھے ستانے میں جس بے وفا نے عجلت کی
مجھے رُلا کے کسی پل وہ شاد بھی نہ رہا

سخن شناس کوئی مجھ سے پیش تر بھی نہ تھا
سخن شناس کوئی میرے بعد بھی نہ رہا

میں اُس جنوں کے علاقے میں آ گیا ہوں جہاں
جو کام یاب نہیں نامراد بھی نہ رہا

ہر ایک شخص ہے پھر بھی لہو میں ڈوبا ہوا
تری زمیں پہ اگرچہ فساد بھی نہ رہا

جَلا دیں اُس کی جدائی میں ساری غزلیں نبیلؔ
کتاب کیسے چھپے جب مواد بھی نہ رہا

○

احسان گھمن

(جلالپور جٹاں)

تصویر جو منظر سے نکالی نہیں جاتی
اس واسطے ہی آنکھ سے لالی نہیں جاتی

میں کیوں نہ اسے آنکھ کا سرمہ ہی بنا لوں
وہ خاک جو پیروں سے اچھالی نہیں جاتی

اب شہر میں وہ تیز ہوائیں ہیں کہ ہم سے
گرتی ہوئی دیوار سنبھالی نہیں جاتی

یک طرفہ محبت میں ہے یک طرفہ ملامت
تہمت یہ کسی اور پہ ڈالی نہیں جاتی

کچھ دست_عنایت میں کمی آئی ہے ورنہ
ہم جیسوں کی جھولی کبھی خالی نہیں جاتی

میں خود پہ لگے داغ بھلا کیسے مٹاؤں
پانی سے مری خاک کھنگالی نہیں جاتی

مٹی کے تو اپنے ہی خدوخال ہیں سارے
صورت کسی سانچے سے نکالی نہیں جاتی

احسان ذرا سوچ سمجھ کر اسے لانا
اولاد کسی اور کی پالی نہیں جاتی

○

رئیس صدیقی

(بھوپال)

سیاہ رات میں، جگنو کو ساتھ رکھتے ہیں
سفر میں ہم، تری خوشبو کو ساتھ رکھتے ہیں

تمام عمر، ہے دُکھوں سے فرار، ناممکن
جو قہقہے ہیں، وہ آنسو کو ساتھ رکھتے ہیں

بدل دیا ہے سیاست نے ساری قدروں کو
شریف لوگ بھی، سادھو کو ساتھ رکھتے ہیں

بہادری کی روایت بدل دی دنیا نے
وہ سُورما ہیں جو ڈاکو کو ساتھ رکھتے ہیں

جسے زمانہ محبت کا نام دیتا ہے
رئیسؔ، ہم اُسی خوشبو کو ساتھ رکھتے ہیں

○

- ناول -

خاکِ شفا

پیرزادہ آلِ انوار

(ممبئی)

دہلی چھ کے اطراف میں لال کنوائیں کے دائیں جانب ذِگ ذیگ کی شکل میں ہوتا ہوا کوچہ دلدار خان جب اختتام کے قریب ہوتا ہے تو وہاں بیری کے گھنے درخت سے چند قدم کے فاصلے پر جونہی سرکاری نل کی ہودی کے چاروں اطراف جمی کیچڑ اور کائی سے بچتے بچاتے قاضی رفیع الدین کے مکتب کے قریب پہنچتے ہیں تو دالان میں قرآن پاک پڑھنے کی آوازیں نمایاں ہوتی ہیں۔ ہر بچے کی لَے اور لحن چند دنوں میں گزرنے والے راہ گیر کو مانوسیت میں جکڑ لیتی ہیں۔ درمیان، درمیان میں احمق اور نالائق کی اونچی آواز کے ساتھ قاضی رفیع الدین بید کی پتلی اور لمبی شڑک شڑک سے بچوں کو چوکنا رکھنے کی کوشش برابر جاری رکھتے ہیں۔ جونہی قضیان روشن آرا بیگم قاضی رفیع الدین کو ناشتہ کے لیے طلب کرتیں فوراً قرآن مجید کی لَے اور لحن کی جگہ پہلے سرگوشیوں کی بھِن بھِن ازاں بعد مباحثے، مذاکرے اور کبھی کبھی جنگ و جدل میں تبدیل ہوجاتی۔ چند قدم کے فاصلے پر نورو چائے والے کی دکان پر اسی قسم کی کیفیت دیکھنے کو ملتی۔

بلّن میاں اکھاڑے سے زور کر کے سیدھے نورمحمد عرف نورو چائے والے کی دکان پر، گرم گرم جلیبیوں اور کچوریوں کا دونا تھامے بلند آواز میں سلاوا لیکم کہتے ہوئے کرسی پر براجمان ہوجاتے۔ جیسے ہی بلّن میاں چارخانے کے تہبند کو سمیٹ کر کچوریوں اور جلیبیوں سے دو، دو ہاتھ کرنے پر آمادہ ہوتے ویسے ہی نورو چائے والا موٹی ملائی ڈال کر گرم گرم چائے کا گلاس بلّن میاں کے سامنے رکھتا اور دوسری سمت سے کُوں، کُوں کرتا کُتّے کا پلّا برآمد ہو کر بلّن میاں کی ٹانگوں کے درمیان کُوں، کُوں دھیمی آواز سے اپنی آمد کا اعلان کر دیتا۔ بلّن میاں چمچے کی مدد سے چائے کے اوپر سے ملائی اُتار کر اُس کے سامنے ڈالتے تو اُس کی کُوں، کُوں گلے سے نکلنے والے سریلے سُروں میں تبدیل ہوجاتی جس کے دوران بلّن میاں کی ٹانگوں کے بیچ گول دائرے میں ناچنا اُس کی خوشی کے کلائمکس کو ظاہر کرتا۔ اس دوران نورو چائے والا دودھ کی دیگچی کے بڑے چمچے پر ڈھیر ساری ملائی بلّن میاں کی چائے میں ڈالنے کی غرض سے لاتا مگر بلّن میاں نورو چائے والے کے ہاتھ سے چمچ لے کر جھٹ سے کُتّے کے پلّے کے سامنے ڈال دیتے۔

سامنے بیٹھے بنواری لال کو نورو چائے والے کے خلوص کے ساتھ یہ روّیہ برداشت نہ ہوتا۔

''ایک بات تو بتاؤ بلّن بھائی؟''

''دو پوچھو'' بلّن بھائی آدھی چائے سے بھرے گلاس کو میز پر رکھ کر ہاتھ جھاڑتے ہوئے جواب دینے کے لیے تیار ہوجاتے۔

''یہ جو آپ، سالوں سے اپنے حصے کی ملائی کُتّے کے پلّے کو کھلا رہے ہیں اس کا کیا فائدہ، ہے تو یہ اُتنا ہی مرگِلا جتنا پہلے تھا؟''

''ایک بات تم بھی بتاؤ بنواری لال، وزن کتنا ہے تمہارا؟''

''یہ ہی کوئی ستر، بہتر سیر ہوگا''

''پچھلے سال کتنا تھا؟''

''پچھلے سال (سوچتے ہوئے) پچھلے سال، لگ بھگ اتنا ہی ہونا چاہیے''

''اس کا مطلب ہے یا تو تمہاری لُوگائی تمہیں پورا راتب نہیں ڈال رہی یا نورا تمہاری ملائی میں ڈنڈی مار رہا ہے۔''

''بھئی کیا کہنے، کسم پروردگار کی، بلّن بھائی نے تو لام م لوہا کر دیا، راتب ڈال کر''

''بوہتا کھوش ہونے کی جرورت نہیں میاں، تم جتنے شیر ہو گھر میں، پورا محلّہ جانتا ہے۔'' عبدالشکور رکشے والے کے ٹھٹھول پر بنواری لال نے گھر میں شیر کا ٹانکا لگا کر سب کے سامنے شکور کی کر کری کر دی۔

چند قدم کے فاصلے پر فخری نائی کی دکان ہے جہاں روز صبح کے وقت میلے کا سماں ہوتا ہے۔ محلّے کی چٹ پٹی خبروں اور اخبار کی سنسنی سے فخری نائی کی دکان ایک طرح سے محلّے کی چوپال کا درجہ اختیار کر گئی ہے۔ پچھلے دنوں وجاہت علی مرزا کی بیٹی نازنین مرزا، نذیر بمبئی والا کے عشق میں گرفتار ہو کر گھر سے بھاگ گئی تو سب سے پہلے نواب بانکے مرزا کے ملازمِ خاص چھکّن میاں عرف پیاری جان نے کنی سنی میں بتلایا تھا کہ دو دن پہلے وجاہت مرزا کی بیٹی نازنین نذیر قوّال المعروف نذیر بمبئی والا کے ساتھ چمپت ہوگئی ہے۔ اُس دن سے چھکّن میاں عرف پیاری جان راتوں رات کوچہ دلدار خان کے علاوہ پاس پڑوس کے گلی کوچوں میں اس قدر راہم اور خاص ہوگئے تھے کہ کالے آدمی سے سیدھے منہ بات کرنے پر آمادہ نہ تھے۔

نذیر قوّال المعروف نذیر بمبئی والا پیشے کے اعتبار سے تو قوّال تھا مگر اُس کی شکل وشباہت قدبُت اور آواز کے ساتھ گانے کا انداز بھی نرالا تھا۔ وہ نہ تو عام قوّالوں کی طرح کلّے میں پان دبا کر ہونٹ لال رکھتا نہ سر پہ ٹوپی، جسم پہ اچکن اور پاجامہ زیب تن کرتا۔ نذیر بمبئی والا ہمیشہ موسم کے اعتبار سے مغربی لباس پہنا کرتا۔ گرمیوں میں شوخ وشنگ پینٹ بوشرٹ اور گلے میں سرخ رومال ہوتا اور سردیوں میں کالے رنگ کے گرم سوٹ پر، لال، نیلی یا پیلی قمیض کے ساتھ پھولدار ٹائی لگاتا۔ نذیر بمبئی والے کے ساز بھی پرانے قوّالوں کی طرح ڈھولک، مٹکا، ہارمونیم، دف اور سارنگی پر مشتمل نہ ہوتے۔ اُس کی قوّالی میں طبلہ، وائلن، گٹار اور ٹرمپٹ کلانٹ جیسے جدید ساز نمایاں تھے جن کی لَے پر نذیر قوّال کھڑے ہو کر

گاتا اور مجمع کو لُوٹنے کے ساتھ بہت سی کنواری دھڑکنوں کو بھی اُتھل پُتھل کر دیتا۔

اُن دنوں لتا منگیشکر کا گایا رمیش شاستری کا لکھا اور شنکر جے کشن کا دھنوں سے سجایا فلم برسات کا گیت ''ہوا میں اُڑتا جائے میرا لال دوپٹہ ململ کا'' مقبولِ عام تھا۔ جب بھی کوئی جوان لڑکا کھڑکی میں کھڑی کسی لڑکی کو دیکھتا تو خود بہ خود اُس کے لبوں پر ''ہوا میں اُڑتا جائے میرا لال دوپٹہ ململ کا'' آ جاتا۔ اگر لڑکی کے ساتھ اُس کی آشنائی ہوتی تو وہ کھڑکی کا پٹ یا پردہ ہٹا کر خوشی کا اظہار کرتی اگر صورتِ حال مختلف ہوتی تو کھڑکی میں لڑکی کی جگہ اُس کی ماں یا بھابھی کھڑی ہوتی تو وہ لڑکے کو صلواتیں سنانے سے کبھی نہ چوکتی۔ اُن دنوں ایک ہی جملہ عام تھا ''نگوڑا کہیں کا، گھر میں ماں بہن نہیں ہے'' لڑکا اگر نوآموز ہوتا تو مارے شرم کے پانی پانی ہو جاتا۔ پیشہ ور ہوتا تو ترکی بہ ترکی جواب دیتا ''ماں بہن تو ہیں، محبوبہ نہیں ہے۔''

نکڑ پہ پان کی دکان میں بیٹھے دلارے میاں کی رگِ ظرافت ایسے مواقعوں پر خوب جولانی دکھلاتی ہے۔ ''واہ واہ کیا کہنے، قربان جاؤں اپنے محبوب کے۔ میاں! گلوری کھائے بِنا عاشق بننا ایسے ہی ہے جیسے لہو لگا کر شہیدوں میں شمار ہو جانا۔''

''ناکام عاشق خالی جیب دکھلا کر مجبوری کا اظہار کرتا تو دلارے میاں ایک ہاتھ سے سر پر رکھی دُوپلّی اور دوسرے ہاتھ سے بہتی رال جو پان کی بہتات سے سفید کے بجائے سرخ ہوتی کو سنبھالتے ''میاں یہ دل والوں کے سودے ہیں''۔ ہم اتنے سخت دل نہیں کہ جواب میں کہہ دیں ''نقد بڑے شوق سے اُدھار اگلے چوک سے'' جب جی چاہے چُکا دینا۔ اسی بہانے آنا جانا لگا رہے گا۔ ہماری گلوری کبھی رائیگاں نہیں جاتی'' دلارے میاں نے پورے جسم کو استعمال میں لا کر اٹھلاتے ہوئے کہا۔

''یہ بات ہے تو لگائیے کرشماتی گلوری۔ دام بتلا دیجیے تو بہتر ہوگا۔ ہم کل ہی چکا دیں گے''

''واہ میاں واہ، آپ تو ہمارے اندازے سے بھی زیادہ چنٹ نکلے۔ میاں! یہاں دام نہیں، دل سے بھی کام چلتا ہے۔ ایک پیسے کی ایک گلوری دیتے ہیں ہم اور پیسہ بھی بڑا لیتے ہیں ایڈورڈ والا۔ خدا معلوم کل کلاں کو دلّی پہ کوئی اُفتاد آن پڑے تو جمع پونجی، سیدھے ڈھلیئے کے پاس لے جائیں گے۔ جی چاہا تو جام و سبو میں ڈھلوالیں گے وگرنہ آپ تو جانتے ہی ہیں تانبے سے کیا کچھ نہیں بنتا (دو انگلیوں سے نشانہ سادھتے ہوئے)

''جی جی وہ تو ٹھیک ہے مگر تمام دلّی میں دھیلے کی ایک گلوری ملتی ہے''

''جائیے جائیے میاں، گلوری اور آپ، ہونہہ، قبل اس کے ہم دال مصور کی شان میں گستاخی کریں آپ تشریف لے جائیے''

''ارے ارے آپ تو ناحق خفا ہو گئے!''

''ہم کون ہوتے ہیں خفا ہونے والے، ہمارا آپ کا رشتہ ہی کیا ہے! ہمیں شوق سے ماریئے، کالیے، نوچیئے، کھسوٹیئے مجال ہے جو اُف کر جائیں۔ گلوری کی بابت کچھ کہیے گا تو ہمیں تکلیف ہوگی۔'' (یہاں، یہاں، یہاں شوخی سے جسم کے مختلف حصوں کو ہاتھ سے نمایاں کرتے ہوئے)

دلارے میاں نے پان نکالا تو اُس پر کتھا چونا لگا دیکھ کر سامنے کھڑے گاہک نے سوال داغا۔

''تازہ پان کھلایئے نا، ہمارا مطلب ہے گلوری۔''

''واللہ ہمیں آپ سے اُنسیت نہ ہوتی تو ہم بلا کسی تکلف، حضرتِ بندر کی شان میں مشہور معروف گستاخی کرنے میں ذرا بھی تامل نہ کرتے۔ چک، ہمارا مطلب ہے سادے میاں، جس طرح عشق، محبت اور باہمی روایت کے کچھ اصول ہوتے ہیں اسی طرح گلوری کھانے کے بھی کچھ آداب ہیں۔ پان تازہ ہو پر اتنا نہیں کہ اُس میں خستگی نہ آئی ہو۔ چُونا کتھا بھی اتنا پُرانا ہونا چاہیے کہ ایک دوسرے میں جذب ہو جائیں جس طرح دو پیار کرنے والے، چلئے چھوڑیئے منہ آگے کیجیے''

''منہ آگے کیجیے مطلب!''

''اللہ ہم مطلبی وطلبی بالکل نہیں ہیں۔''

''یہ لیجیے کیا''

''ہائے اللہ ہم کہاں جائیں! پان ہاتھ میں نہیں، منہ میں دیا جاتا ہے، ہمارا مطلب ہے کِھلایا جاتا ہے۔''

''اوہ اچھا اچھا!'' (منہ کھولتے ہوئے)

کوچہ دلدار خان کا آخری پڑاؤ خلیفہ عبدالرشید پتنگ ساز کا اڈہ ہے۔ جنہیں نواب شمّن مرزا نے اپنے دولت خانے کے نچلے حصے میں ایک گوشۂ عافیت عطا کیا ہے جس میں خلیفہ عبدالرشید دن کے وقت پتنگ سازی کر کے گزر اوقات کرتے اور جب رات اپنے عروج کو پہنچتی تو دروازے بھیڑ کر آٹھ بائی دس کی کوٹھری کو اپنی خلوت بنا لیتے۔ بظاہر یہ بات دل کو لگتی ہے کہ خلیفہ عبدالرشید نوٹنکی میں ایک عرصہ تک طرح طرح کے سوانگ بھرتے اور رچاتے رہے مگر بائیسکوپ کی آمد نے خلیفہ عبدالرشید اور اُن کی طرز کے دیگر سوانگیوں کو اُسی طرح بے آسرا کر دیا جس طرح انگریز حکومت نے فارسی کے بجائے اردو کو سرکاری زبان بنا کر فارسی دانوں کو کیا تھا جس کے بعد اکثر پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے طرح طرح کے پیشوں سے وابستہ ہو گئے۔ جیسے فارسی کے ایک عالم فاضل استاد نوکری سے فراغت کے بعد تیل فروخت کرتے پائے گئے۔ اُن کے شاگرد رشید نے اس کا سبب دریافت کیا تو جواب میں اُستاد بے ساختہ بولے: بس میاں اب تو یہ ہی ٹھاٹ ہیں:

پڑھو فارسی، بیچو تیل

ہم مسلسل الف۔ ب کی گردان کے انداز میں عبدالرشید صاحب کے نام کے ساتھ خلیفہ کا لاحقہ لگا رہے ہیں جبکہ اُن کے سامنے کوئی شخص اس طرح کے عمل کا مرتکب ہو تو خلیفہ صاحب اُس کے ایسے لتے لیتے ہیں کہ سر پر پاؤں رکھ

کر بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نہیں بچتا۔

بقول خلیفہ صاحب اُن کا پورا نام مرزا عبدالرشید تاباں ہے۔ اسی بارعب نام سے قریب نصف صدی نوٹنکی کی دنیا میں اُن کا طوطی بولتا رہا۔ ویسے تو مرزا عبدالرشید صاحب اعلیٰ شعری ذوق کے مالک ہیں مگر درمیانِ گفتگو جب وہ اپنے اشعار سنا کر مشاعرے مارنے کی بڑ ہانکتے ہیں تو اکثر لوگ زبردستی کی جمائی ہچکی یا ڈکار لے کر دخل در معقولات کے مرتکب ہوتے ہیں جس پر مرزا عبدالرشید تاباں بُرا تو بہت مناتے ہیں مگر خود پر ضبط کرتے ہوئے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہیں۔

''ہاں تو ہم کیا کہہ رہے تھے''

اکثر بدذوق اس کے جواب میں بدتہذیبی کا مظاہرہ کرتے ہیں مثلاً اُن کے قریبی دوست مرزا سلامت علی بیگ ایسے موقعوں پر ہمیشہ ایک ہی جملہ دہراتے:

''گھونیاں چھیل رہے تھے''

کبھی تو رشید خان صاحب کا مارے غصّے کے رنگ سرخ ہو جاتا اور وہ منہ ہی منہ میں اول، فول بکنے لگتے اور کبھی مسکرا کر کہتے:

''چلیئے کچھ تو کر رہے تھے ہم'' آپ بتلایئے! کبوتر اُڑانے، شطرنج جمانے، کئی کئی دن اور رات چنڈوخانے میں گزارنے کے علاوہ اور کیا شغف فرماتے ہیں جناب؟

خلیفہ عبدالرشید کے جواب کا برا منانے کے بجائے مرزا سلامت علی ترکی بہ ترکی کہتے:

''میاں یہ رئیسوں کے اشغال ہیں۔ آپ کیا جانیں۔ ہمیں تو آپ کی ناقص اطلاع پر رنج ہو رہا ہے کہ آپ نے بیت بازی، بٹیر بازی، مرغ بازی، پتنگ بازی۔۔۔ بازی۔۔۔ بازی۔۔۔ چوسر اور شطرنج کی بازی وغیرہ کو سرے سے لائق توجہ نہ جانا۔ پھر کہتے ہیں، ہمیں خلیفہ نہ کہو، تو خلیفہ صاحب آپ ہی بتلایئے آپ کو خلیفہ نہ کہیں تو کیا کہیں، گھونیا کی جڑ!''

''اور اُس کے بارے کیا خیال ہے؟''

اُس کے کس کے، صاف صاف کہئے، پہیلی کیوں بجھا رہے ہیں؟

''ہمارا اشارہ حوالات کی اُس رات کی جانب ہے، جو آپ اور آپ کے ہمراہیوں نے قید خانے کے مچھروں کے ہمراہ بسر کری تھی؟''

''اماں جانے بھی دو خلیفہ (قدرے خفگی سے) کیوں گڑے مُردے اُکھاڑتے ہو۔ غلط فہمی میں دھر لیے گئے تھے۔ جیسے ہی داروغہ مستجاب خان کو ہمارے حسب نسب کا علم ہوا، فوراً منمناتے ہوئے گھر تک چھوڑنے آئے۔''

''جی جی، آپ کہتے ہیں تو مان لیتے ہیں'' (الفاظ چباتے ہوئے)

اصل میں تو یہ کوچۂ دلدار خان کی رونق اور شان تھی جو دوسرے، تیسرے اور کبھی چوتھے، پانچویں شخص کی آمد پر نیا رُخ نیا مزاج اختیار کر لیتی اور خلیفہ عبدالرشید کے اڈے کو گھمائے رکھتی۔

جونہی قاضی شہاب الدین پٹے دار، کالے بال اور سفید داڑھی میں چِک کے پیچھے سے نمودار ہوتے تو مرزا سلامت علی زور کی ہانک لگاتے:

''اخ خا، چودھویں کا چاند صبح صبح کیسے دکھائی دے گیا؟''

''اماں کیا بتلائیں، رات کو رام لیلا میدان میں نذیر بمبئی والے کی قوّالی سننے چلے گئے''

''آپ اور قوّالی، وہ بھی اس عمر میں'' (مرزا سلامت علی نے چٹکی لی)

''میاں! ہماری چھوڑیئے، ہم تو ابھی ساٹھے پاٹھے ہیں۔ رات کے میلے میں تو ایسے ایسے بزرگ پہنچے ہوئے تھے جنہیں ملک عدم کا مکیں ہونا چاہیے، بزرگ تو چھوڑیئے قبلہ! وہاں تو بنی ٹھنی پیشہ ور عورتوں کے علاوہ خواجہ سرا اور نئے نکور لونڈے بھی اپنے اپنے شکار کی تاک میں تھے!

''توبہ استغفار! قوّالی کی محفل میں اس قدر خرافات؟''

''اماں! قوّالی کی محفل نہیں، بارہ مصالحے کی چاٹ کہیے بارہ مصالحے کی چاٹ۔ خوانچہ فروشوں کے پَو بارہ ہو گئے۔ بریانی، کباب، قلفی، بوتل، برف کے گولے، چنا جور گرم، پاپڑ پکوڑے سموسے، چاٹ، دہی بڑے، کانجی کے بڑے، پان، بیڑی، سگریٹ کیا نہیں تھا وہاں؟ حتیٰ کہ مالش والوں کی بھی خوب چاندی ہو رہی تھی۔ قوّالی کے نام پر جو خرافات دیکھنے کو ملی، اُس کے بعد تو میاں ہم نے قوّالی تو قوّالی، عرس اور میلاد کی محفلوں سے بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے توبہ کر لی۔

''اور میاں، کیا نام تھا اُس قوّال کا، ہاں نذیر بمبئی والا، خدا لگتی کہیں تو وہ ہمیں قوّال کم اور مسخرہ زیادہ لگا۔ قوّالی نام ہے تہذیب و تمدن کا، صوفیا کرام سے عقیدت و احترام کا، اسی لیے سبھی نامور قوّال مشرقی لباس اور سر پہ ٹوپی زیب تن کرتے ہیں مگر واہ رے میری نوٹنکی نذیر بمبئی والے۔۔۔ میاں! کبھی کسی قوّال نے پینٹ بوشرٹ وہ بھی شوخ رنگ کی پہن کر قوّالی کی ہے؟ اُس پر طرّہ یہ کہ قمیض کی جیب میں جہازی سائز کا لال رومال ٹھونسا ہوا ہے جو ہر مکھڑے اور بند کے سم پر جیب سے نکال کر بار بار لہرایا جاتا وہ بھی بندروں کی طرح اُچھل کود کرتے ہوئے۔''

''اماں ان مکروہات کو ماریئے گولی۔ ہمیں آپ کلام کے بارے بتلایئے، کلام کے بارے۔ ہم بھی تو دیکھیں اس بانکے سجیلے نذیر بمبئی والے کا ذوق کس نوعیت کا ہے۔''

خلیفہ عبدالرشید کے اشتیاق پر قاضی صاحب قدرے اُکتاہٹ سے گویا ہوئے۔ صاحبزادے نے سب سے پہلے حضرت امیر خسرو کے کلام:

چھاپ تلک سب چھین لیو رے موسے نیناں ملا کے

جس قدر ہاہا، ہُو ہُو، ہے ہے کر کے سنایا اُس سے دل کو بہت رنج پہنچا۔ میاں کیا ہو گیا ہے؟ میر و غالب کی وراثت رکھنے والے اہلِ دلّی کو۔ اس قدر عامیانہ انداز پر واہ، واہ کے ڈونگر برسا رہے تھے اللہ توبہ، دل جل بھن کے کباب ہو گیا۔ اُس کے بعد اُس نا ہنجار نے اسداللہ غالب کی خوب خوب ریڑھ لگائی:

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخری اس درد کی دوا کیا ہے

یہ جو دل ہوتا ہے، بہت نازک بہت حسّاس ہوتا ہے
کبھی تیرے، کبھی میرے، کبھی اُس کے پاس ہوتا ہے

غالب کے ساتھ یہ بدتہذیبی ہمیں بہت گراں گزری۔اسی طرح داغ بھی اُس بدبخت کی دست برد سے محفوظ نہ رہ سکے۔

تمہارے خط میں نیا اک سلام کس کا تھا
نہ تھا رقیب تو آخر وہ نام کس کا تھا

آپ ہی سوچئے داغ جیسے اُستادشاعر کے ساتھ یہ ناروائی توبہ توبہ، ہرجانب اشارے کرکے:

سلام، سلام
اِدھر سلام
اِدھر سلام
اُدھر سلام
اُنہیں سلام، اِنہیں سلام

اور مرزا صاحب (مرزا سلامت علی کی جانب روئے سخن) اُس وقت تو وہ ناہنجار بالکل ہی سڑک چھاپ معلوم ہونے لگا جس وقت کسی دل جلے نے اپنے مکان کی چھت پر اونچی آواز میں گرامافون پر گیتادت کا گایا ہوا ساحر کا یہ گیت چلادیا:

تقدیر سے بگڑی ہوئی تقدیر بنالے
اپنے پہ بھروسہ ہے تو داؤ لگالے

گرامافون پر اونچی آواز میں ریکارڈ چلانے والے صاحب کا مقصد قوّالی میں خلل ڈالنے کے بجائے منچلے عاشقان کی حوصلہ افزائی کرنا تھا۔

مگر قوّال صاحب آپے سے باہر ہوگئے اور گرامافون بجانے والے کو ڈانٹ کر مخاطب کرنے لگے ''فلمی گانے سننے کا اتنا ہی شوق ہے تو اپنے گھر کے اندر سنو۔'' اس سے پہلے کہ خود ساختہ قوّال صاحب آپے سے مزید باہر ہوتے پچھلی صف میں ٹرمپٹ بجانے والے بزرگ نے اُن سے کانا پھوسی کی جس کے بعد اُنہوں نے وہی فلمی گیت اپنے انداز میں گانا شروع کردیا:

تقدیر بنانا کوئی آسان کام نہیں
بڑے بڑوں کی تقدیر بن کے بگڑ جاتی ہے
میرے مولا، میرے آقا کا کرم ہو جس پر
اُس کی منٹوں میں تقدیر سنور جاتی ہے

آہا تقدیر بنالے، اوہو تقدیر بنالے، اجی تقدیر بنالے، ہاں ہاں تقدیر بنالے۔توبہ استغفار کیا زمانہ آگیا۔نامعلوم یہ بے حیائی کہاں جاکر دم لے گی۔ یوں ہی تو عبرت مچھلی شہری نوحہ خوانی نہیں کررہے:

سنا ہے ڈوب گئی بے حسی کے دریا میں
وہ قوم جس کو جہاں کا امیر ہونا تھا

شاعر صاحب نے یقیناً اپنا فریضہ درست طور پر انجام دیا ہے مگر انگریزی زبان وثقافت کا اثر اس قدر جلد نہیں جانے والا۔(مرزا سلامت علی کی آواز گہری فکر میں ڈوبی ہوئی تھی)

''بھائی میاں! پانچ سو کے اندازوں کی جگہ پانچ ہزار کا مجمع اُمڈ آیا۔ مکانوں کی چھتوں، چھجّوں، کھڑکی، دروازوں پر بوڑھی، جوان، نوعمر، نوخیز حسینوں، مہ جبینوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے۔کوئی دل جلا نظروں کے تیر چلا رہا تھا، کوئی اشاروں میں معاملات نپٹا رہا تھا، کوئی بچوں کے ذریعہ زبانی اور تحریری نام وپیام بھیجنے میں مصروف تھا۔''

''نام و پیام کی بھی خوب کہی مرزا صاحب (خلیفہ عبدالرشید نے چٹخارا لیتے ہوئے) سنا ہے! وجاہت مرزا کی بیٹی نازنین نے اپنے خون سے خط لکھ کر نذیر بمبئی والے کو بھیجا تھا جسے پڑھ کر اُس کا دل پسیج گیا۔''

''رہنے دو میاں جتنے منہ اُتنی باتیں!''

''مثلاً! کتنے منہ اور کتنی باتیں'' (مرزا سلامت علی نے قدرے ناگواری سے گفتگو میں اپنا حصہ ڈالا)

''اماں! کہنے والے تو یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ وجاہت مرزا کی بیٹی نے گھر والوں کو دھوکہ دینے کے لیے نذیر بمبئی والے کو بطور ہتھیار استعمال کیا ہے۔بھاگی وہ اپنے آشنا کے ساتھ ہے۔''

''یہ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں؟'' (خلیفہ عبدالرشید کو مرزا سلامت نے براہِ راست مخاطب کیا)

''بخدا ہم نے تو یہ بھی سنا ہے کہ جس طرح کا خط وجاہت مرزا کی بیٹی نازنین مرزا نے نذیر بمبئی والے کو تحریر کیا تھا عین مین ایسا ہی ایک خط اُس کے تکیے کے نیچے سے برآمد ہوا ہے!''

''بھئی واہ کیا کہنے، کیا دور کی کوڑی لائے ہیں تلاش کے۔''

''لو بتلاؤ! ہمیں کیا ضرورت ہے کچھ تلاشنے کی، خود اُن کی ملازمہ نے نواب صاحب کی بیگم صاحبہ کو بتلایا ہے۔''

''نواب صاحب، کون سے نواب صاحب؟'' (مرزا سلامت علی کے کان کھڑے ہوئے)

''میاں! اپنے نواب شبّن اور کون سے نواب صاحب۔''

''آپ کو کیسے پتہ چلا؟ (قاضی شہاب الدین کے استفسار میں تفتیش کا انداز نمایاں تھا)

''لو یہ بھی خوب رہی!''

پوچھتے ہیں غالب کون ہے
تم ہی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

باقی صفحہ ۷۰ پر ملاحظہ کیجیے

برطانیہ سے جاپان

(سفر۔۔۔مشرق بعید کے)

یعقوب نظامی

قسط۔۔۔۶

ملائیشیا۔۔۔کوالالمپور

بیٹے خرم کے پاس خوشی خوشی وقت گزارنے کے بعد ہم 16 اگست 2017ء کو ملائشیاء کے دارلحکومت کوالالمپور Kuala Lumpur پہنچے۔ میرے ساتھ بیگم اور بیٹی نفیسہ بھی تھی۔ جہاز نے صبح سات بجے ہوچی منہ سٹی کے ہوائی اڈے سے اڑان بھری تو صبح کے چمکتے سورج کی روشنی میں ہر چیز چمک دمک رہی تھی۔ ابھی ہم نے فضائی آلودگی میں لپٹے ہوچی منہ سٹی پر مختصر سی نگاہ ڈالی تھی کہ جہاز شہر سے مضافات کے اوپر جا پہنچا جہاں حدنظر تک پانی سے لبالب بھرے کھیت نظر آنے لگے۔ غالباً یہ دھان کے کھیت تھے۔ اگرچہ یہ صبح کا عالم تھا لیکن اس کے باوجود کسانوں نے کھیتوں میں کام کا آغاز کردیا تھا۔ غالباً دوپہر کی دھوپ سے بچنے کی خاطر۔ ویت نام کے دہقانوں اور سرسبز کھیتوں سے نظریں ہٹیں تو دیکھا جہاز دریائے میکانگ کے اوپر محوِ پرواز تھا۔ فضا سے یوں نظر آرہا تھا جیسے سرخی مائل یہ دریا نہیں بلکہ سرخ سمندر ہے۔ یہ سچ بھی ہے دریا اسی مقام پر سمندر میں جاملتا ہے جس کی وجہ سے اس کا پھیلاؤ سمندر کی مانند تھا۔ دریا کا سرخ پانی سمندر میں ملنے کے باوجود بھی کچھ عرصہ اپنی رنگت برقرار رکھنے میں کامیاب رہا۔۔۔لیکن دیکھتے ہی دیکھتے سرخی مائل دریائی پانی نے نیلگوں سمندر میں ضم ہوکر اپنی ہستی کو آہستہ آہستہ فنا کرکے ایک نئی شکل اختیار کرلی تھی۔

ایک ایسی شکل جس میں وسعت بھی تھی اور ہیبت بھی۔۔۔زیادہ طاقت بھی تھی اور خلق خدا کے لئے فوائد بھی۔۔۔یوں دیکھتے ہی دیکھتے دریا نے اپنی ہستی فنا کرکے علاقائی سطح سے نکل کر بین الاقوامی حیثیت اختیار کرلی تھی۔ ہوچی منہ سے کوالالمپور تک کا سفر بڑا خوشگوار رہا۔ جہاز اتنا بڑا نہیں تھا اور نہ ہی وہ زیادہ بلندی پر محوِ پرواز تھا۔ اس لئے کھیت کھلیان، دریا اور نیلگوں سمندر نظر آتے رہے۔ سمندر عبور کیا تو ملائیشیاء کی حدود میں داخل ہوتے ہی سرسبز جنگلات، پہاڑ، ندی نالے اور آبشاریں نظر آنے لگیں۔ جہاز میں ہماری ملاقات ملائیشیاء کے کچھ طلبا سے ہوئی جو تحقیقی تعلیمی مشن پر ویت نام گئے ہوئے تھے۔ اُن سے بڑی دلچسپ گفتگو رہی۔ بچے ہونہار اور مستقبل پر گہری نظر رکھنے والے تھے۔ انھوں نے روس، امریکہ، برطانیہ اور دوسرے یورپی ممالک کے بارے میں بڑی پُرمغز باتیں کیں۔ مشرق وسطیٰ کے اسلامی ملکوں کے بارے میں بھی مدلل گفتگو کی۔ معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے کتابیں پڑھ کر امتحانات پاس کیے ہیں۔ جب میں ملائیشیا کے طلباء سے محوِ گفتگو تھا تب مجھے وطن عزیز کے وہ طلبا یاد آتے رہے جو سال بھر کتابوں کا منہ تک نہیں دیکھتے اور جب امتحان کی تاریخ مقرر ہوجاتی ہے تو پھر پاس ہونے کے جتن کرتے اور مختلف حربے استعمال کرتے ہیں۔۔۔جس میں سب سے زیادہ مشہور طریقہ امتحان کے نگران کو رشوت دے کر نقل کے ذریعے امتحان پاس کرنے کی کوشش یا پھر سفارش سے کام نکالنے کی جدوجہد کرتے ہیں۔۔۔کچھ یہی سبب ہے کہ ایسے لوگ امتحان پاس کرنے اور ڈگری لینے کے باجود جاہل ہی رہتے ہیں۔

عالمانہ گفتگو کے ساتھ ساتھ انھوں نے مجھے ملائیشیا کی سیاحت کے بارے میں کچھ مفید مشورے بھی دیئے۔ اور یہ بتا کر حیران کردیا کہ ملائشیا کے وزیر اعظم ڈاکٹر مہاتیر محمد کے دادا اسکندر کا تعلق بھارتی صوبہ کیرالہ سے تھا۔ جب برطانوی ملائیشیا پہنچے تو اپنے ساتھ برصغیر کے لوگوں کو بھی لے آئے۔ اُن لوگوں میں مہاتیر محمد کا دادا اسکندر بھی شامل تھا۔ اسکندر انگریزی تعلیم حاصل کرکے کیرالہ میں انگریزی کا معلم تعینات ہوا۔ اس دوران ایسٹ انڈیا کمپنی کے کرتے دھرتوں کو ملائیشیا میں انگریزی اساتذہ کی ضرورت آئی تو وہ اسکندر کو ملائیشیاء کے صوبہ کھڈ Kedah لے گئے جہاں کے شاہی محل میں انگریزی پڑھانے پر مامور کیا۔ بعد میں اسکندر اسی اسکول کے صدر معلم کے عہدہ تک پہنچے۔ اسی ٹاون میں ستی حوا نامی ایک ملائی خاتون بھی پڑھاتی تھی۔ دونوں کی ملاقات ہوئی اور پھر 1881ء میں اسکندر نے حوا سے شادی کرکے ملائیشیاء کو ہمیشہ کے لئے اپنا ملک بنالیا۔

ملائیشیا کے طلباء نے بتایا کہ کیرالہ کے اسی خانوادے میں محمد بن اسکندر کے ہاں 10 جولائی 1925ء کو مہاتر محمد نے جنم لیا۔ والدین نے زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا اور سنگاپور کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کی۔ اسی میڈیکل کالج میں زیرِ تعلیم ایک طالبہ سے آنکھ لڑی جو محبت میں بدلی اور پھر شادی کرلی۔ عملی زندگی کا آغاز شعبہ طب سے کیا۔ لیکن پھر ملکی صورت حال کو مخدوش پاکر سیاست میں قدم رکھا اور ماں کی اس نصیحت کو پلے باندھ کر اُس پر عمل کیا کہ۔۔۔

''رزق حلال کی برکت سے تم اپنی اور اپنی قوم کی تقدیر بدل سکتے ہو''

سیاسی میدان میں جدوجہد کے بعد آخر انھیں اللہ تعالیٰ نے قوم اور ملک کی خدمت کرنے کی خاطر اقتدار عطا کیا۔ مہاتر محمد 1981ء سے 2003ء تک بائیس سال تک مسند اقتدار میں رہے۔ اب دوبارہ ملکی حالات خراب ہونا شروع ہوچکے ہیں ایسے میں مہاتر محمد نے دوبارہ سیاست میں آنے کا اعلان کیا ہے تاکہ ملکی ترقی کو سہارا دیا جائے۔۔۔(یاد رہے اس سفر کے بعد جب میں واپس برطانیہ آیا تو کچھ عرصہ بعد 93 سالہ اس مردِ آہن مہاتر محمد نے 10 مئی 2018ء کا انتخاب جیت کر ایک بار پھر برسراقتدار آکر دنیا کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ دوسال کی حکومت کی اور یکم مارچ 2020ء میں عہدہ سے استعفیٰ دیا۔)

طلباء نے بات چیت کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے بتایا کہ۔۔۔مہاتر محمد نے ملائیشیا کو غربت سے نکال کر امیر ملکوں کی صف میں لاکھڑا کیا ہے۔ اس نے ملکی معیشت کو مضبوط کیا۔ اپنے دورِ حکومت میں ملائیشیاء کے لئے 2020ء کا تصور پیش کیا اور ساتھ ساتھ ملک میں مختلف پس منظر کے حامل لوگوں کے درمیان پائی

جانے والی خلیج کو کم کر کے لوگوں کو بھارتی، چینی یا ملائی کے تصور سے نکال کر انھیں ملائیشیائی تصور دیا۔ اس نے ملکی معیشت سات فیصد سالانہ کے حساب سے فروغ پانے کے اقدامات کیے۔ جس کے نتیجے میں ملائیشیا کی معیشت سالانہ نو فیصد بڑھی اور چند سالوں کے اندر اندر 1995ء تک ملائیشیا میں غربت کی سطح انتہائی کم ہو کر صرف نو فیصد رہ گئی تھی۔

معیشت کے ساتھ محمد مہاتر نے اسلامی تعلیمات کو فروغ دیا۔ خود انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے باجود مغربی دنیا سے متاثر نہیں۔۔۔ بلکہ ان کا کہنا ہے کہ۔۔۔ ''مشرق کی تہذیب جن اخلاقی اور روحانی اصولوں پر قائم ہے اہل مغرب اس سے واقف ہی نھیں۔ مشرق کی بنیادی اکائی خاندان کا کردار ہے جبکہ مغرب میں خاندانی شیرازہ بکھر چکا ہے۔''

اسی خاندانی اکائی کو تقویت دے کر مہاتر محمد نے ملائیشیا کی کایا پلٹ دی۔ ملک میں جہاں معاشی انقلاب آیا وہاں لوگ دین اسلام کے ساتھ زیادہ پیار ومحبت کے ساتھ جڑے اور اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہوئے۔ ملائیشیائی طلبا کی باتیں سنتے سنتے جہاز کوالالمپور کے ہوائی اڈے پر اُتر گیا۔ جہاز سے باہر نکلا تو سامنے ہوائی اڈہ کی عمارت تھی۔ یہ عمارت انتہائی شاندار اور پُر وقار تھی جو طلباء کی باتوں کو عملی لحاظ سے پیش کر رہی تھی۔ ہم ہوائی اڈے کی عمارت میں داخل ہوئے تو دیکھ کر حیران رہ گئے کہ یہ ایک کشادہ اور خوبصورت ہوائی اڈہ تھا۔ مسافر آ جا رہے تھے۔ ہوائی اڈہ پر رش سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ مشرق بعید کے مصروف ترین ہوائی اڈوں میں شامل ہے۔ ہماری طرح کے کچھ مسافر تو آرام سے چہل قدمی کر رہے تھے لیکن اکثریت اپنا دستی سامان اٹھائے تیز رفتاری میں قطاروں کو چیرتے ہوئے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھے۔

ممکن ہے انھیں اپنی منزل پر پہنچنے کے لئے دوسری فلائٹ تک پہنچنے کی جلدی تھی۔ یا پھر عادت سے مجبور سب سے آگے نکلنے کی کوشش۔ غالباً یہ دنیا کا واحد ہوائی اڈہ ہے جہاں مسافروں کے آنے جانے والے راستوں یعنی راہ داریوں کے درمیان شیشے کی دیواروں کے درمیان سرسبز ہرے بھرے پودے ہیں۔ میں نے پھول اور پودے دیکھے تو سوچنے لگا ملائیشیا کے لوگ فطرت سے پیار اور ماحول دوست انسان ہیں۔ جنھوں نے ہوائی اڈہ کی انتظار گاہوں اور راہ داریوں کے درمیان بھی پودے لگائے ہوئے ہیں۔ سرسبز درخت دیکھ کر ایک تو مسافروں کے چہروں پر تازگی آ جاتی ہے دوسرا درخت ماحول دوست ہوتے ہیں۔ دور جدید کی تمام سہولیات سے آراستہ اس ہوائی اڈے میں برقی زینے اور شاپنگ کا وسیع ایریا تھا۔ لوگوں کی اکثریت یہ سوچتی ہے کہ ہوائی اڈے سے خریداری سستی ہوتی ہے لیکن میں نے زندگی میں جتنے بھی سفر کیے کسی بھی ہوائی اڈہ پر سستی چیزیں نہیں دیکھیں۔ بظاہر سستی نظر آنے والی چیزیں مارکیٹ سے مہنگی ہوتی ہیں۔

دنیا کے ہوائی اڈے تو فضائی سفری سہولیات کے لئے ہوتے ہیں لیکن اندر کی دنیا بیرون دنیا سے یقیناً مختلف ہوتی ہے۔ کوالالمپور کے ہوائی اڈے کی دکانیں بھی دنیا کے مہنگے ڈیزائنر اشیا سے بھری ہوئی تھیں جہاں مسافر خریداری میں مصروف دیکھے۔ ممکن ہے یہ سیاحت کے دوران اپنے چاہنے والوں کے لئے کوئی تحفہ نہ خرید پائے تو اب چلتے چلتے خرید رہے تھے۔ میں نے اس بات کو محسوس کیا کہ بین الاقوامی شہرت کی چیزوں کی قیمت دنیا میں یکساں ہیں۔۔۔ انھیں آپ جس ملک کے ہوائی اڈہ سے خریدیں وہی قیمت۔۔۔ بہرحال یہاں ایک چیز کا دھڑکا نہیں ہوتا کہ یہ اصل ہے یا نقل۔ دنیا کے بیشتر ترقی پذیر ممالک کے بازاروں میں اکثر دو نمبر کی چیز گاہک کو اوّل درجہ کی قیمت پر فروخت کی جاتی ہیں۔ بازار کی رونقیں دیکھتے جب امیگریشن کے کاونٹر پر گئے تو یہ سوچتے ہوئے کہ یہ اسلامی ملک ہے۔۔۔ میں نے امیگریشن آفیسر کو بڑے دھڑلے سے السلام علیکم کہا۔۔۔ لیکن آفیسر نے کوئی جواب نہیں دیا۔۔۔ سوچا ممکن ہے یہ تیسری دنیا کا کوئی مغرور افسر ہے لیکن ۔۔۔ جب میں نے اُس کے سینہ پر لگا نیم بیج دیکھا جس پر ۔۔۔رمیش۔۔۔ لکھا ہوا تھا۔ تب مجھے علم ہوا کہ اس نے سلام کا جواب کیوں نھیں دیا۔ چونکہ یہ مقامی ہندو تھا۔ جس نے ناک سکڑتے ہوئے میرے پاسپورٹ کو دیکھا اور نہ چاہتے ہوئے بھی مہر ثبت کر دی۔ چونکہ انکار وہ کر نہیں سکتا تھا۔

ہوائی اڈہ سے ٹیکسی بک کروائی جنھوں نے 118 ملائیشین رم RM (رنگٹ) لیے۔ یہ پیسے برطانوی بیس پونڈ اور پاکستانی ساڑھے تین ہزار روپے تھے۔ ہمارے لئے یہ بہت رعایت کا سودا تھا۔ چونکہ ہوائی اڈہ سے شہر 55 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اتنے سفر کے بیس پونڈ کچھ زیادہ نھیں تھے۔ اگر ہم یہ ٹیکسی باہر سے لیتے تو وہ ہم سے 75 رنگٹ لیتے جو قدرے رعایت تھی لیکن بعض اوقات باہر کھڑے ٹیکسی ڈرائیور سیّاحوں سے دھوکا بھی کر جاتے ہیں۔ دھوکے سے بچنے کی خاطر ہم نے تھوڑے زیادہ پیسے دیئے۔ آدم نامی ٹیکسی ڈرائیور مقامی مسلمان تھا۔ انتہائی اچھا انسان۔ تھوڑی انگریزی میں بات چیت کر سکتا تھا۔ ہوائی اڈے کو شہر کے ساتھ ایک خوبصورت موٹروے کے ذریعے منسلک کر دیا گیا ہے۔ کشادہ اور صاف ستھری سڑکیں۔ آدم ہمیں راستے میں آنے والی مشہور جگہوں کے بارے میں بتانے کی کوشش کرتا لیکن ناکام رہتا اُس کی وجہ زبان پر عبور نہ تھا۔ وہ بات کا آغاز تو انگریزی میں کرتا پھر ملائیشین میں بات شروع کر دیتا جو ہمارے سر کے اوپر سے گزر جاتی۔ ہم اُس کا دل رکھنے کی خاطر ہاں ہوں کرتے رہے۔

کوالالمپور میں ہمارا قیام سیٹن ہوٹل CITIN HOTEL میں تھا۔ یہ ہوٹل شہر کی جامع مسجد کے پہلو میں تھا جسے بک کروانے کی اصل وجہ یہ تھی کہ ہم مسلمانوں کی آبادی میں رہیں اور حلال کھانے بھی کھاتے رہیں۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ہمیں جب جامع مسجد کے علاقے میں پہنچایا تو مختلف بازاروں کے بار بار چکر لگا کر پھر وہاں آ جاتا۔ ہمیں تھوڑی تشویش ہوئی تو پوچھا یہ ماجرہ کیا ہے؟۔ جس پر اُس نے بتایا کہ آپ کا ہوٹل وہ سامنے ہے لیکن وہاں پر گاڑی لے جانے کے لئے کوئی راستہ نہیں۔۔۔ چونکہ ہوٹل مسجد کے پہلو میں ہے اور مسجد کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مسلمانوں نے مسجد کے سامنے والی سڑک پر سٹال لگا کر سڑک کو بند کیا ہوا ہے۔ اس لئے دو سو گز آپ کو چل کر ہوٹل پہنچنا ہوگا۔ ہم ٹیکسی سے اُترے تو ڈرائیور نے ہمارا سامان لیا اور شاپنگ سٹال کے بیچوں بیچ گزر کر ہوٹل میں پہنچایا۔

ہوٹل کے استقبالی عملہ نے مسکراتے ہوئے ہمیں خوش آمدید کہا اور کمرہ نمبر 713 الاٹ کیا۔ بیٹی نفیسہ کو بھی پہلو میں دوسرا کمرہ مل گیا۔ ہوٹل کا معیار اتنا اچھا نہیں تھا لیکن جب ہم نے اپنے کمرے جو ساتویں منزل پر تھا سے باہر دیکھا تو پورے شہر کو پاؤں میں پایا۔۔۔ یہ منظر دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ ہم ہوٹل بارہ بجے پہنچے تھے۔ سفری تھکاوٹ دور کرنے کی خاطر غسل کیا اور تروتازہ ہو کر باہر نکلے تاکہ دوپہر کا کھانا کھایا جائے۔ ہوٹل کے عملے نے مشورہ دیا کہ وہاں قریب ہی اے بی سی ABC نامی ریسٹورنٹ پر کھانا کھائیں اُن کا کھانا بہتر ہوتا ہے۔ ہم وہاں گئے تو دیکھا ریسٹورنٹ گاہکوں سے بھرا ہوا تھا جو اس بات کا ثبوت تھا کہ یہاں مزے دار کھانا ملتا ہے۔ ہم ایک میز پر بیٹھے۔ کھانے کے لئے پلاؤ، روٹی اور مچھلی کے سالن کا آرڈر دیا تو تھوڑی دیر میں ایک لڑکی نے کیلے کے پتے لا کر ہماری میز پر بچھانے شروع کر دیئے۔ ہم نے سوچا کہ ممکن ہے کیلے کے یہ پتے ٹیبل کلاتھ کی جگہ استعمال کیے جا رہے ہوں۔ لیکن جب اِدھر اُدھر دیکھا تو معلوم ہوا یہاں کھانا پلیٹ میں نہیں بلکہ کیلے کے پتوں پر رکھ کر دیا جاتا ہے۔

میں نے دیکھا۔۔۔ ویٹر گرما گرم کھانا لا کر کیلے کے پتوں پر رکھ دیتے جہاں سے لوگ اٹھا اٹھا کر بڑے مزے سے کھا رہے تھے۔ لوگ کھانا چمچ کی بجائے ہاتھوں سے کھا رہے تھے۔ ہم نے دیکھا ایک قسم کا گوشت پلاؤ کیلے کے پتوں میں گولے کی مانند دھاگوں میں لپٹا ہوا گاہکوں کو دیا جا رہا تھا۔۔۔ اس طرح نظر آتا تھا جیسے یہ ان پتوں میں ہی پکایا گیا ہے۔ لوگ دھاگا کھولتے تو اندر سے گرما گرم پلاؤ نکال کر کھاتے۔ ہمارے لئے یہ تھوڑا منفرد تھا اس لئے شمیم اور بیٹی نفیسہ نے انھیں کہا کہ ہم پلیٹ میں کھانا کھائیں گے۔ ہماری فرمائش پر ویٹر کو پہلے تو حیرت ہوئی لیکن پھر ہمارے لئے پلیٹ لے آیا۔ کھانا کھایا تو مزہ آ گیا۔ ہم نے 75 رنگٹ ادا کیے۔ جو ہمارے خیال میں قدرے مہنگا کھانا تھا۔ اور بعد میں ہمارا خدشہ درست ثابت ہوا جب ہم نے دوسرے ریسٹورنٹ سے کھانا کھانا شروع کیا تو اس کے کافی مناسب نرخ تھے۔

کھانے کے بعد ہم نے ویٹر سے کیلے کے پتوں میں کھانا پیش کرنے کا سبب پوچھا تو اُس نے بتایا:

''یہ جنوبی ہندوستان کے علاقے کیرالہ اور تامل ناڈو کا روایتی کھانا ہے جو چاول کری اور کیلے کے پتے کے نام سے مشہور ہے۔ سفید اُبلے ہوئے گرما گرم چاولوں کو پتوں کے اندر ڈال کر اُس میں سبزیاں، آلو، گوشت، قیمہ یا مرغی ڈال کر اوپر سے دھاگے سے مضبوط باندھ دیا جاتا ہے جو اُسی طرح گاہک کو پیش کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات اُبلے ہوئے چاولوں میں انڈے اور مچھلی بھی ڈالی جاتی ہے۔ ہم اپنے گھروں بلکہ محفلوں میں بھی اسی طرح کھانا پیش کرتے ہیں۔ اس کھانے کے آداب یہ ہیں کہ آپ کو ہاتھ سے کھانا پڑتا ہے۔ دوسرا کھانا کھانے کے بعد کیلے کے پتے کو اندر کی طرف دوھرا کر دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر کسی ماتم کے موقع پر یہ کھانا پیش کیا جائے تو پھر کیلے کے پتے کو باہر کی طرف دوہرا کرنا پڑتا ہے۔ جس کا مطلب ہے کھانے کو پسند کیا گیا ہے۔''

کوالالمپور میں آباد بھارتی مسلمانوں کی اکثریت جنوبی ہند سے ہے۔ ان لوگوں کے قد درمیانہ جبکہ شکل وشباہت بنگلہ دیش کے لوگوں سے ملتی جلتی ہے۔ لباس میں بھی کافی مطابقت ہے۔ جب میں گھوما پھرا تو معلوم ہوا شہر کے اس حصے میں لوگوں کی اکثریت جنوبی ہند یعنی تامل ناڈو سے نقل مکانی کر کے یہاں آ کر آباد ہوئی ہے۔ ان لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹ کم دیکھی اور نہ انھیں قہقہے لگاتے دیکھا۔ سیاحت ہمارا مشغلہ ہے۔ ہم دنیا کے جس ملک میں بھی گئے تو اپنا تعارف پاکستانی برٹش مسلم کی حیثیت سے کروایا تو مقامی لوگوں نے ہمیشہ خوشی کا اظہار کیا۔ لیکن یہاں ملائیشیا میں بھارتی مسلمانوں کو جب معلوم ہوتا کہ ہم پاکستانی ہیں تو اُن کے چہروں پر خوشی کی بجائے تفکر کے اثرات دیکھنے کو ملے۔ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ جب ایک مومن دوسرے مومن سے ملتا ہے تو اسلامی بھائی چارے کی بدولت جو خوشی پیدا ہوتی ہے وہ ان مسلمانوں میں ناپید دیکھی۔۔۔ مسرت کی بجائے ان میں ایک خاص قسم کی گھٹن اور روکھا پن چھلکتا تھا۔ یہ ڈرے ڈرے، سہمے ہوئے ایک انجانے خوف میں مبتلا نظر آئے۔ ہم سے آنکھیں ملانے کی بجائے آنکھیں چراتے تھے۔ ممکن ہے یہ لوگ ہندوؤں کے ڈر سے اپنی دلی کیفیت کو ظاہر نہ کرتے ہوں۔ پاکستانی مسلمانوں کا سن کر وہ گم سم ہو جاتے اور ہم سے بات چیت سے کتراتے محسوس ہوئے۔ لیکن بھارتی مسلمانوں کے برعکس جب ہم کسی مقامی ملائی مسلمان سے ملے تو انھوں نے انتہائی مسرت بھائی چارے اور عقیدت کا اظہار کیا۔

ہمارے ہوٹل کے اردگرد مختلف بازار تھے۔ یہ روایتی ایشیائی طرز کے بازار جہاں اسی طرح کی دکانیں تھیں۔ بازار میں گھومتے پھرتے مختلف مذاہب اور رنگ کے لوگ نظر آتے رہے۔ جہاں ''بسم اللہ ریسٹورنٹ'' تھا وہاں سے تھوڑی دور ''جے ہند'' نامی ریسٹورنٹ بھی تھا۔ دکانوں کے باہر نمائشی سامان لٹکا ہوا تھا۔ ہلّہ گلّا اونچی اونچی آواز میں باتیں، گاہک کو متوجہ کرنے کے لئے انھیں سامان دکھانے کے لئے اندر بلانے کے مختلف طریقے، خوانچے والے بھی سروں پر سامان اٹھائے فروخت کرتے نظر آئے۔ خرید وفروخت کا وہی انداز۔۔۔ قیمتوں پر تکرار۔ بازار میں سب کی سب دکانیں بھارتی نژاد مسلمانوں اور ہندوؤں کی تھی۔ چند دکانیں سکھوں کی بھی نظر آئیں۔ کوالالمپور میں بھارت کے لوگوں کی اکثریت شہر کے بریک فیلڈ Brickfield کے علاقہ میں رہتی ہے۔ جس طرح نام سے ظاہر ہے'' بریک Brick یعنی اینٹ اور فیلڈ Field کھیت''۔ یعنی وہ علاقہ جہاں اینٹوں کے بھٹے ہوں۔ یہ اب ''لٹل انڈیا'' کہلاتا ہے۔

یہ بڑا غربت کا زمانہ تھا۔ تارکین وطن تو تھے ہی غریب لیکن مقام لوگوں کا رہن سہن بھی اِسی طرح کا تھا۔ سنا ہے زمانہ قدیم کے کوالالمپور کے باسی مکانوں کی بجائے گھاس پھوس کی بنی جھونپڑیوں میں رہتے تھے۔ ان جھونپڑیوں میں سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ آگ لگنے کی صورت میں وہ آنکھ جھپکتے ہی خاکستر ہو جاتی تھیں۔ جب کوالالمپور پر انگریز قابض ہوئے تو انھوں نے لوگوں کو مشورہ دیا کہ لکڑی اور گھاس پھوس کی بجائے اینٹوں کے مکان تعمیر کریں چنانچہ

اینٹوں کا استعمال ہونے لگا۔ایسے میں شہر کے نواح میں جو کھلی جگہیں تھیں وہاں اینٹوں کے بھٹے لگائے گئے جن میں کام کرنے والوں کی اکثریت بھارت کے لوگوں کی تھی۔ یہ لوگ دن بھر اینٹیں بناتے اور شام کو وہاں قریب ہی اپنی جھونپڑیوں میں سو جاتے۔یوں ہی وقت کا پہیہ چلتا رہا۔شہر پھلتا پھولتا اُن بھٹوں بلکہ اُس سے بھی آگے نکل گیا۔مگر بھارتیوں کی وہ بستی اپنی جگہ قائم رہی۔اب تو جدید دور کے مطابق اس علاقہ میں پختہ گلیاں سڑکیں اور یہ شہر کا ایک بارونق علاقہ بن چکا ہے۔ بھارتی کھانے، بھارتی دکانیں اور بھارتی میوزک بلکہ فلمیں سب کچھ اس علاقے میں چلتا ہے۔

لیکن اس کا آغاز بھٹوں سے ہوا۔بھارت میں جب بدھ مت اور ہندوازم کا ٹکراؤ ہوا۔تو ہندوؤں نے دوسرے مذاہب کے لوگوں جن میں اکثریت بدھ تھی کو اس قدر تنگ کیا کہ یہ لوگ مشرق کی طرف نقل مکانی کرنے پر مجبور ہوئے۔مورخ کہتے ہیں کہ پہلی ہجرت اشوک کے دور حکومت میں ہوئی جب ہندوؤں کے ستائے ہوئے لوگ بھارت سے بنگلہ دیش اور وہاں سے تھائی لینڈ اور پھر ملائیشیاء اور انڈونیشیا پہنچے۔یہ لوگ جدھر بھی گئے ساتھ بدھ مت کی تعلیمات بھی لیتے گئے اسی سبب سے آج بھی ان علاقوں میں بھارت نواز بدھ مت سے وابستہ لوگوں کی واضح چھاپ نظر آتی ہے۔انیسویں صدی میں جب انگریزوں کو افرادی قوت کی ضرورت پڑی تو وہ بھارت کے لوگوں کو ملائیشیا لے آئے تھے جن کی نسلیں اب اس ملک میں مستقل آباد ہیں۔یہ دوسری نقل مکانی تھی۔

آخر میں جب اسی کی دھائی میں کمپیوٹر کا انقلاب برپا ہوا تو بھارتی سوفٹ ویئر انجینئر وں نے ملائیشیا، انڈونیشیاء اور مشرق بعید کے دوسرے ممالک کا رخ کیا۔نقل مکانی کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ ملائیشیا ایک کثیر الثقافتی اور کثیر الاذاہب ملک ہے۔جس میں مقامی ملائی لوگوں کے بعد سب سے زیادہ چینی اور پھر بھارتی ہیں۔ اس وقت کل آبادی کے سات فیصد بھارتی لوگ یہاں آباد ہیں۔ان میں اکثریت ہندوؤں کی ہے۔تھوڑے بھارتی مسلمان بھی ہیں لیکن وہ یہاں بھی ڈرے ڈرے اور سہمے سہمے سے نظر آئے۔ چونکہ بھارتی ہندو پروفیشنل کاموں میں بہت آگے ہیں۔ ملائیشیاء میں کام کرنے والے ڈاکٹروں میں 38 فیصد کا تعلق بھارت سے ہے۔بس یہی سمجھئے کہ بھارتیوں کا میڈیکل کے شعبہ میں مکمل کنٹرول ہے۔اسی طرح سوفٹ ویئر انجینئر نگ اور ادویات کی کمپنیوں سے بھارتیوں کی اکثریت وابستہ ہے۔ملائیشیا کے ہندو آسودہ حال بھی ہیں اور اپنے مذہبی فرائض ادا کرنے میں انھیں بالکل کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ملائشیاء میں اکثریت مسلمانوں کی ہے جنھوں نے کھلے دل کے ساتھ انھیں مذہبی آزادی دے رکھی ہے۔ملائیشیا کے مسلمان ہندوؤں کے ساتھ اُس طرح کی تنگ دلی کا مظاہرہ نہیں کرتے جس طرح بھارت کے ہندو کھلے عام مسلمانوں کے ساتھ کر رہے ہیں۔ بھارتی ہندوؤں کے مقابلے میں ملائی مسلمانوں کی دریا دلی کا ثبوت مجھے باتو نامی غار Batu Caves کی سیاحت کے بعد ہوا۔

☆

''ہزاروں شوہر''

پہلی گراما فون ریکارڈنگ کا اعزاز حاصل کرنے والی مشہور مغنیہ اور رقاصہ گوہر جان ایک مرتبہ الہ آباد گئیں جہاں وہ جانکی بائی کی مہمان بنیں۔انھوں نے اپنی میزبان سے کہا کہ وہ خان بہادر سید اکبر حسین (اکبر الہ آبادی) سے ملنا چاہتی ہیں۔ میزبان انھیں لے کر دوسرے ہی دن اکبر کے ہاں پہنچ گئیں۔تعارف کرواتے ہوئے جانکی بائی نے کہا کہ یہ کلکتہ کی مشہور مغنیہ گوہر جان ہیں۔آپ سے ملنے کا اشتیاق رکھتی ہیں۔

اکبر نے کہا ''زہے نصیب، ورنہ نہ میں امام، نہ خوش، نہ قطب اور نہ کوئی ولی جو قابلِ زیارت خیال کیا جاؤں، پہلے جج تھا، اب ریٹائر ہو کر صرف اکبر رہ گیا ہوں، حیراں ہوں کہ آپ کی خدمت میں کیا تحفہ پیش کروں؟۔''

گوہر جان نے کہا، ''کوئی شعر لکھ دیجیے کہ یادگار رہے۔''

اکبر نے ایک کاغذ لیا اور شعر لکھ کر گوہر جان کی طرف بڑھا دیا:

خوش نصیب آج بھلا کون ہے گوہر کے سوا
سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا

گوہر نے بڑے ادب سے برجستہ کہا:

یوں تو گوہر کو میسر ہیں ہزاروں شوہر
ہاں پسند اس کو نہیں ایک بھی اکبر کے سوا

اکبر کے لیے گوہر جان کی سخن فہمی اور سخن سازی تعجب کا باعث تھی جس کے سبب اکبر نے کچھ توقف سے بعد گوہر جان کو داد کے ساتھ دعائیں بھی دل کھول کر دیں۔

○

خانانِ خان، یوسف خانؔ

دلیپ کمار

مشیر طالب

(●)

وہ کہ اک جذبۂ حسین جیسا
ایک گلفام نازنیں جیسا
ایک فنکار دلنشیں جیسا
معجزے جیسا، اک نگیں جیسا

●

شاہ زادوں کا شاہزادہ وہ!
مہ جبینوں کا خواب زادہ وہ!
حسنِ فن کی بلندیوں کا ناز
بام و در فن پہ ایستادہ وہ!

●

نکھری شستہ روش پہ مستِ خرام
حسرتِ دید میں چھلکتے جام
حسن کے دل میں وصل کے پیغام
تھرتھراتے لبوں پہ اس کا نام

●

دل دھڑک اٹھیں ساری محفل کے
اس کے رستے میں قافلے دل کے
چلمنیں اس کو دیکھ کر اٹھ جائیں
پردے اٹھ جائیں چلتے محمل کے

●

حسنِ فن کے فلک سے اُترا وہ
فن کی ساری بصارتیں لے کر
ایک اوتار اک ولی کی طرح
ایک پیغامِ سوز فن لے کر

پنڈتِ فن بھی محوِ حیرت تھے
رمزکاری کو جو سمجھتے تھے
وہ بھی انگشت بدنداں ہوتے تھے
اُس کی طرزِ ادا پہ واری تھی

●

اس کے آگے تھے رنگ بے مایا
رنگ اس کا ہی سب نظر بھایا
کلیاں شرما کے پھول بننے لگیں
فخرِ گلشن ''گلاب'' شرمایا

●

فطرتِ زیست سے مرصع وہ
مسلکِ فن میں وہ حقیقت کار
اس نے فن کو دیئے نئے اسلوب
بخشا تہذیبِ فن کو اس نے وقار

●

رمز و ادراک کی اداکاری
اس نے دانشورانہ کی ساری
اس کا سب کچھ مدبرانہ تھا
درد و غم دکھ خوشی کے کُن کاری

●

اس نے جو بھی ادا کیا کردار
ایکٹنگ کا بنا وہی معیار
لہجہ و گفتگو کے مد و جذر
فن کے ٹھہرے وہی نئے معیار

شاعری جیسا اس کا ہر اسلوب
ایکٹنگ اس کی شعریت جیسی
ہر ادا اس کی نظمیائی غزل
مدھر سروں میں وہ بھیرویں جیسی

●

اک سحر اک طلسم اس کی ذات
اس کی برجستہ، برمحل ہر بات
اک شعور اک تمدنی مظہر
فکری تخلیق، اس کے احساسات

●

وہ کہ فنکاریت کا بابِ ادب
ایکٹنگ اس کی ایک فلمی ادب
وہ ادب ساز ایک فلمی ادیب
فلمی اُنساب میں وہ عالی نسب

●

روپ کا دیوتا کہیں اُس کو!
یا پیمبر بہ سوئے کُن کاری!
اک فقیہی دلیل اُس کی ذات!
بانیِ ہیکل اداکاری!

●

وہ کہ خانانِ خان، یوسف خانؔ
پردہ سیمی کا وہ دلیپ کمارؔ
بس اکیلا براجماں، طالبؔ
فلمی آکاش پہ وہ ماہِ شرار!

اس نے کہا

پروین شیر
(نیوجرسی)

نیند گہری تھی مگر سب
دوڑتے ہی جا رہے تھے
یک بیک نکلا وہ گہری دھند سے
کہنے لگا.....
" ہر ارادے میں تمہارے
کتنی شکنیں پڑ گئی ہیں
یہ نیا منظر بھی کتنا دیدنی ہے
میں ہی میں ہوں
ذرہ ذرہ تم میں ڈھلتا جا رہا ہوں
قطرہ قطرہ اب ہر اک آواز کو
میں پی رہا ہوں
اور جتنے خواب کے روشن دیے تھے
ان کی اک اک لو ء
نگلتا جا رہا ہوں
دھڑکنوں کے ہر ورق پر
خوف لکھتا جا رہا ہوں
اک مسلسل درد کے جالوں میں
الجھا دی ہے میں نے زندگانی
بارشوں کی زد میں آ کر
کون میری اس توانائی کو زائل کر سکے گا؟ "
چار سو آنکھوں کی ہر دہلیز پر
خوابوں کے رخشندہ چراغوں کی ہر اک لو
بجھ رہی ہے.....!

○

مسافرت

یوگیندر بہل تشنہ
(کینیڈا)

پھر اُنہی نا مختتم راستوں پہ گامزن
عُمر بے انجام ہے، از سرِ نو نغمہ زن
منزل سے اپنی بے خبر، آئے جائے لوٹ کر
طے کرنا ہے کسے، لینا کسے ہے فیصلہ
کب، کس موڑ پر رُکے، زندگی کا قافلہ
کب چلے، چل کر تھمے، سوچ میں ہوں مبتلا
ذہن و دل میں اُٹھا، دفعتاً اک خیال
بحرِ احساس میں ہوا، اجنبی سا ارتعاش
بے ہنگم سی اٹھی پھر، درونِ دل سے یہ صدا
تیرے بس میں کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں ترے ہاتھ
بہتا جا تشنہ تو، وقت کی موجوں کے ساتھ
تُو نے از خود ہی لکھی، زندگانی کی کتاب

برادرِ یوسف

اے برادرِ یوسف اے مرے دلیپ کمار
کر گیا کس قدر تو سب کی آنکھیں اشکبار
تیرے لیے دھڑکتے تھے فلم بینوں کے دل
تیرے دم سے تھا جہانِ رنگ و بو کا کاروبار

○

فلسطین

پرویز مظفر
(برمنگھم)

ہم کو نہیں دیکھنا
ہم کو چپ رہنا ہے
جو ظلم ہوتا ہے
جو ظلم ہو رہا ہے
زمانہ کھلی آنکھوں سے سو رہا ہے
سن رہا ہے بمباری کی آوازیں
وہ چیخیں زندہ لاشوں کی
وہ درد بھرے نغمات
اتنا ظلم اتنی دہشت
دیکھ کر بھی اٹھی نہیں کوی آواز
یہ بھی ہوی کوی بات
ک انسانوں کے اس بھرے جنگل میں
شاہد سب ہی
دہشت زدہ ہیں
ک ہم نے اگر کچھ دیکھ لیا
ہم کچھ بولے
ہم نے اگر لب کھولے
کسی نے کچھ پوچھ لیا
تو کیا بولیں گے
اس لیے بہتر ہے کہ چپ رہنا ہے
ک خدا تو ہے
وہ سب دیکھ رہا ہے
اس لیے
ظلم کی رسّی کو دراز ہونے دو
فلسطین کو خود ہی ازاد ہونے دو

بیس ڈالر

جاوید زیدی
(امریکہ)

سانس لینا بھی مرحلہ تھا جسے
اُس کو طاقت کے زور پر مارا
اُس کو بے وجہ، بے خطا مارا
رنگ تھا، نسل تھی یا ڈالر بیس
وجہِ تسمیہ تھے ڈالر بیس
ہاں، وہی نقلی نوٹ ڈالر بیس
جان سستی تھی چند سکوں سے
زیست ارزاں تھی کچھ اصولوں سے
کنارے فٹ پاتھ کے یہ منظر تھا
چیختے تھے، رَو رہے تھے لوگ
بے بس، انسان کھو رہے تھے لوگ
رحم کی اپیل کرتے تھے
شرم کی سبیل کرتے تھے
بے حیا محافظ کو رام کرتے تھے
جھک کر اُس کو سلام کرتے تھے
اپنے بھائی کو مرتے دیکھتے تھے
لحہ لحہ دم نکلتے دیکھتے تھے
سانس کی بھیک مانگتا تھا وہ
زندگی حق تھا جانتا تھا وہ
ماں کو اپنی پکارتا تھا وہ
بچوں کو یاد کر رہا تھا وہ
جینے کی فریاد کر رہا تھا وہ
شاوِن یوں گلا دباتا تھا
شِمر جیسے کہ گلا کاٹتا تھا
نسلِ انسانی کو سُولی پہ ٹانکتا تھا
جس کا نوکر تھا اُسی کو مارتا تھا
آج یہ فیصلہ عجیب ہوا
کالے، گورے ہیں خوش عوام مگن
ایسا لگتا ہے اب نیا ہے وطن

کسی بھی طرح ذلیل کیا جاسکتا ہے

نوید سروش
(بہرپور خاص)

کسی بھی دوست کو
کسی بھی طرح ذلیل کیا جاسکتا ہے

ذلیل کرنے کے لیے ضروری نہیں کہ
کسی دوست کی پوری بات سننے کے بعد
زبان کی غلطیاں گنوائی جائیں
بلکہ
درمیان سے بات کاٹ کر بھی
اُسے ذلیل کیا جاسکتا ہے

ذلیل کرنے کے لیے ضروری نہیں کہ
کسی دوست کو فون کرنے کا وعدہ کر کے
فون نہ کیا جائے
بلکہ
ملاقات ہونے پر
بھول جانے کا بہانہ کر کے بھی
اُسے ذلیل کیا جاسکتا ہے

ذلیل کرنے کے لیے ضروری نہیں کہ
کسی دوست کو اپنے گھر
کھانے کی دعوت دے کر
کھانے کے آداب سکھائے جائیں
بلکہ
اُس کے ساتھ کھانا نہ کھا کر بھی
اُسے ذلیل کیا جاسکتا ہے

ذلیل کرنے کے لیے ضروری نہیں کہ
کسی دوست کو
گھر میں موجود ہوتے ہوئے
اپنے نہ ہونے کا کہلوا دیا جائے
بلکہ
وقت دے کر
گھر پر نہ مل کر بھی
اُسے ذلیل کیا جاسکتا ہے

ذلیل کرنے کے لیے ضروری نہیں کہ
کسی دوست کو
خالی سڑک پر
پیدل چلتے دیکھ کر
گاڑی روک کر
پوچھا جائے
کہاں جاؤ گے
جواب ملنے پر کہا جائے
''معاف کیجیے گا
میں جلدی میں ہوں
ورنہ چھوڑ دیتا''
بلکہ
گاڑی روکے بغیر
سلام کا اشارہ کر کے بھی
اُسے ذلیل کیا جاسکتا ہے
کسی بھی دوست کو

کسی بھی طرح
ذلیل کیا جاسکتا ہے
مگر
ذلیل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ
پہلے آدمی خود ذلیل ہو

○

ناز بردارِ اُردو

پروفیسر طرزی
(دربھنگہ)

ہیں بڑے ناز بردارِ اُردو وہی
جن کو کہتے بھی ہیں سب اَجّے مالوی

جب ''الٰہ'' پائے ''آباد'' کا لاحقہ   ہے وطن بھی بلاشبہ وہ آپ کا
وہ جہاں کے تھے ''اکبرؔ'' تو ''امرود'' بھی   جنم استھل اجے کا ہے بیشک وہی
شمس رحمان شہرت جسے دے گئے   ہاں وہی شہر بیشک یہ ہے، مانئے
چھ نُومبر تو ارسٹھ ہی تھی عیسوی   ہے ولادت کی تاریخ اُن کی، یہی
جو اِلہ اور آباد سے ہے بنا   ہاں اُسی جامعہ سے ہے ایم۔اے۔کیا
عشقِ اردو کے ہیں ابتدا سے اسیر   عشق میں اپنے رکھتے نہیں یہ نظیر
مرحبا آپ نے پورا ڈی۔فِل کیا   آپ کے رہ نما تھے بھی جعفر رضا
کام نارنگ کی آئیں نیرنگیاں   مالوی پا گئے ہیں جو مہتابیاں
سرپرستی جو حاصل کی نارنگ کی   رنگ لاتی رہی اِن کی دانشوری
آپ سے دس کتابیں ہیں کُل آئیں بھی   علم و دانش کا ہیں جو خزانہ کوئی
یہ وہ دولت ہے جن سے وہ ہیں باوقار   کاوشیں آپ کی سب ہیں گوہر نثار
لائے اردو میں ہیں آپ ویدک ادب   دولتے چہ عجب، دولتے چہ غضب
نغمہ یزدانی اس کا ہی حصہ ہوا   ہاں وہ جزوِ نصاب ایک ہے بن گیا
این۔سی۔پی۔ یو ہی ایل کا ہوا فیصلہ   مرحبا اُس پہ بیشک عمل بھی ہوا
تیشہ بردارِ اُردو بنے مالوی   ایسی دانشوری کچھ ہے دکھلائی بھی
کام آیا ہے علمی جنوں آپ کا   وصلِ لیلیٰ مقدر جو ہے بن گیا
نسل سازی کا اِن کو فریضہ ملا   ایک کالج سے ہے آپ کا واسطہ
رشتہ ہے آپ کا اُردو تنقید سے   علم افزا مضامیں یہ ہیں لکھ گئے
معتبر ماہناموں میں ہیں جو چھپے   کتنے دو ماہی، سہ ماہی میں ہیں بھرے
آپ شامل ہیں بزمِ ادارت میں بھی   ہر قدم کام آئی ہے دانشوری
آپ کتنے اداروں سے ہیں بھی جُڑے   پایا دیوانگی سے، صلے بھی بڑے
بااثر اِن کی آوازِ ہوتی بڑی   علمی قامت درازی ہے وہ آپ کی
رشتہ رکھتے ہیں یہ غالبؔ و میرؔ سے   اِس لئے رکھتے غزلوں سے یہ سلسلے
ہے ''سخن بازناں'' کا بھی کچھ مشغلہ   ہے غزل گوئی سے رشتہ بھی آپ کا

نازبرداریٔ اُردو کام آئی بھی
عشقِ اُردو سے کچھ ایسی شہرت ملی

○

ہارمونز

تابش خانزادہ
(نیویارک)

۱۹۸۰ء کی دہائی میں جرنل آف فارمیسی میں ایک تحقیقی پیپر یا مقالہ چھپا جس کے نتیجے میں امریکہ میں ہارمونز (Hormones) کے استعمال نے ایک نئی کروٹ بدلی۔ مقالے کے مطابق ورزش اور پروٹین والی غذا کھانے کے ساتھ ساتھ اگر Testosterone جیسے ہارمونز استعمال کرنے سے انسانی جسم کے مسلز (Muscles) گھنے اور طاقتور ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہارمونز کے استعمال سے تھکاوٹ کم ہوتی ہے اور تھکاوٹ اگر ہو بھی تو جلد دُور ہو جاتی ہے۔ اس مقالے کے بعد اسی طرح کے کئی اور مقالے چھپے تو باڈی بلڈروں کی دنیا میں جیسے ایک قسم کا کہرام مچ گیا اور باڈی بلڈروں نے ہارمونز کو آبِ حیات تصور کرتے ہوئے دھڑا دھڑ اور بے دریغ استعمال کرنا شروع کر دیا۔ باڈی بلڈروں نے ہارمونز کے زور سے اپنی چھاتیوں کو بڑھانا شروع کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے باڈی بلڈروں کی چھاتیاں بڑی سے بڑی تر ہو کر بڑی ترین ہونے لگیں تو ان کی دیکھا دیکھی ہارمونز کا استعمال پروفیشنل کھلاڑیوں اور پھر سکول کے نوجوانوں میں کسی وبا کی طرح پھیل گیا۔ ہارمونز کے استعمال کا اقرار ریاست کیلی فورنیا کے سابق گورنر اور اپنے دور میں باڈی وڈ کے نامور اداکار آرنلڈ شوازنیگر نے بھی اپنے الیکشن کے دوران کیا تھا۔

قانونی اور غیر قانونی استعمال کے لیے ہارمونز گولیوں، مرہم اور انجکشن کی صورت میں دستیاب ہیں۔ ہارمونز کا ذریعہ استعمال خوراک کی طرح کھانے یا ان کی مالش کرنے یا ان کے انجکشن لگانے سے ہوتا ہے۔ ہارمونز کے بے دریغ استعمال سے چند سالوں کے اندر اندر اس کے استعمال کرنے والوں کے جسم میں دوررس بُرے نتائج ظاہر ہونا شروع ہو گئے جن سے لوگ پہلے بے خبر تھے اور جب بے خبروں کی آنکھیں کھلنا شروع ہوئیں تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ ہارمونز کے استعمال کے نتیجے سے پیدا ہونے والے طبی مسائل پر ۱۹۸۸ء میں ایک تحقیقی مقالہ چھپا جس میں ہارمونز کے استعمال کے غیر متوقع دُوررس نتائج سے پہلی بار پردہ ہٹایا۔ اس تحقیق کے مطابق ہارمونز کا بے جا اور بے بہا استعمال کرنے والے لوگوں کے گردے اور جگر وقت سے پہلے اور تیزی سے ناکارہ ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ ان لوگوں کے خون کا دباؤ بڑھ جاتا ہے اور یہ لوگ یرقان جیسے امراض کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان لوگوں کے جسم کے بال بے تحاشہ بڑھنے لگتے ہیں۔

مردوں کی نقل میں عورتوں نے بھی اپنی چھاتیاں بڑھانے کے لیے ان پلانٹس (Inplants for Breast Augmentation) کے مہنگے آپریشن کی بجائے ہارمونز کا سہارا لینا شروع کیا تو چند سالوں کے اندر اندر ان کی قدرتی طبی اور نسوانی ساخت بگڑنے لگی۔ مزید تحقیق کی روشنی میں عورتوں میں ہارمونز کے زیادہ استعمال سے چہروں پر داڑھی اور موچھوں کے سخت بال اُگنے لگ جاتے ہیں اور سر کے بال تیزی سے گرنے لگتے ہیں۔ انہیں ہر ماہ درد اور تکلیف دہ ماہواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان کی مردوں سے ہمبستری کی خواہش بڑھ جاتی ہے۔ ان کی آواز میں مردانگی کا عنصر نمایاں ہو جاتا ہے یعنی ان کی آواز سے نسوانیت ختم ہو کر ان کی آواز بھاری ہونے لگتی ہے۔ ان کی انڈوں کی تھیلی (Overy) سکڑنے لگتی ہے، بچہ دانی چھوٹی ہو جاتی ہے۔ ایسی عورتوں کا حمل جلدی گر جاتا ہے اور وہ مستقل طور پر بچے پیدا کرنے کے بالکل قابل نہیں رہتیں۔

ان مضر جسمانی خطرات کے پیشِ نظر ۱۹۹۱ء میں امریکی کانگریس نے بغیر کسی طبی وجہ کے ہارمونز کا استعمال غیر قانونی قرار دیا۔ ۲۰۰۳ء میں ایک قانون کے تحت سکولوں کے نوجوانوں، پروفیشنل کھلاڑیوں اور سرکاری ملازمین کے جسم میں ہارمونز کی موجودگی کو ٹیسٹ کرنے کا قانوس پاس ہوا۔ ڈرگ انفورسمنٹ کی ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق ہائی سکول کے ۵ سے ۱۰ فیصد بچے ہارمونز استعمال کر چکے ہیں جن میں ۵ فی صد اس کے استعمال کو برا نہیں سمجھتے۔ امریکہ اور کینیڈا میں بہت سے ڈاکٹروں کو بغیر کسی وجہ کے اپنے مریضوں کو ہارمونز لکھ کر دینے کی وجہ سے اپنا لائسنس کھونا پڑا۔ اولمپک کے کھلاڑیوں کو کھیل سے پہلے غیر قانونی منشیات کی طرح غیر قانونی ہارمونز کے استعمال کے لیے بھی ٹیسٹ کیا جاتا ہے اور جسم سے غیر قانونی منشیات یا ہارمونز پائے جانے کی پاداش میں ایسے کھلاڑیوں کو نااہل قرار دیا جاتا ہے۔

غیر قانونی ہونے کے باوجود امریکہ میں ہارمونز کا استعمال عام ہے۔ بہت سے ہارمونز غیر قانونی طور پر ورزش کے کلبوں میں در پردہ بِک رہے ہیں اور نوجوان بچے نا سمجھی میں ان کا استعمال کر رہے ہیں۔ امریکی حکومت کے ایک اعلامیے کے مطابق والدین کو نوجوان بچوں میں پھیلی ہوئی اس وبا سے خبردار کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ وہ اپنے ایسے نوجوان بچوں پر، جو کسی ورزش کلب کے مستقل ممبر ہیں پر نظر رکھیں کیونکہ غیر قانونی طور پر ہارمونز زیادہ تر ایسے کلبوں میں بکتے ہیں۔ اگر نوجوان بچے خواہ مخواہ مالش کرتے ہوئے پائے جائیں یا بے وجہ گولیاں کھاتے ہوئے پائے جائیں تو یہ نشانیاں ہارمونز کے استعمال کی ہیں۔ ہارمونز استعمال کرنے والے بچوں میں موڈ کی غیر ثباتی، لمبی اور پُرسکون نیند کا فقدان، بات بات پر اور بلاوجہ لڑنا جھگڑنا، اپنے آپ سے باتیں کرنا، اپنے آپ کو غیر فانی اور غیر معمولی طور پر طاقتور ترین سمجھنا، ہاتھوں کا بے وجہ کانپنا جیسی علامات پائی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر لیزانش کے ایک مقالے اگرچہ ہارمونز کا استعمال اچھا نہیں تو اتنا بُرا بھی نہیں۔ اس میں باقی نشہ آور چیزوں کی طرح جسم کو عادی کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔

باقی صفحہ ۱۰۵ پر ملاحظہ کیجیے

''عالم بدحواسی''

ڈاکٹر رئیس فاضل
(ایمسٹرڈیم)

1857ء کی جنگ آزادی کے بعد برصغیر کے معصوم، بے گناہ اور نہتے لوگوں پر فتح حاصل کرنے کے بعد اُن پر ظلم کے ایسے ایسے پہاڑ توڑے گئے جن کا بیان کسی بھی شخص کے لیے اُس کی دل اور دماغی کیفیت کو جھنجوڑ کر رکھ سکتا ہے۔ تفصیل میں نہ جایئے چیچک، ہیضہ، پلیگ، ٹی بی، یرقان، پولیو، کینسر جیسی مہلک بیماریاں 1920ء سے 2021ء تک محلے کے محلے اور گاؤں کے گاؤں نگل رہی ہیں۔ حیرت اس بات پر ہے کہ یہ سب کچھ اُن لوگوں اور ممالک کے ہاتھوں ہو رہا ہے جو خود کو مہذب کہلانے اور پس ماندہ ممالک کو جہالت، غریبی، بیماری اور بے روزگاری بانٹ کر طرح طرح کی قدغن لگاتے اور اُن کے حقوق کو سلب کر رہے ہیں۔ شکوک وشبہات اُس وقت بھی جنم لے رہے تھے جب علوم و فنون عام آدمی کی دسترس میں نہ تھے اور اضطراب آج بھی لوگوں کی نیندیں حرام کیے ہوئے ہے۔

Covid-19 کے آغاز سے چین کے شہر ووہان اور عالمی ادارہ صحت سے لے کر سابق امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے اعترافِ گناہ کے ساتھ بھرے مجمع میں یہ کہہ کر ماسک اُتار پھینکنا کہ'' یہ سب ڈرامہ ہے اور ہم نے مریضوں اور مرنے والوں کے تمام غلط اعداد وشمار پیش کیے۔''

اس پر مستزاد یہ کہ Covid-19 کی بابت طرح طرح کے دعویٰ، تھیوریز، ٹوٹکے اور علاج کی بابت عام آدمی کو گومگو کی کیفیت سے دانستہ یا غیر دانستہ طور پر دوچار کر کے صورت حال کو مشکوک سے مشکوک تر بنا دیا گیا ہے۔

کچھ ایسی ہی صورت حال ویکسین کی بابت بھی پائی جاتی ہے۔ ان پڑھ اور نیم خواندہ تو چھوڑیئے پڑھے لکھے باخبر لوگ بھی:

''نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن''

کی کیفیت سے دوچار ہیں۔ دیکھئے اس حوالے سے

PubMed Central® (PMC) is a free full-text archive of biomedical and life sciences journal literature at the U.S. National Institutes of Health's National Library of Medicine (NIH/NLM).

کس طرح کے ہولناک حقائق بیان کر رہا ہے:

اس ویکسین کو بچپن میں لگنے والے حفاظتی ٹیکوں جیسا اور یہ سمجھنا کہ یہ زندگی بھر کے لئے وائرس سے حفاظت دیتی ہے، کم علمی ہے۔ معلوم رہے بچپن میں لگنے والی ویکسینز کی حقیقت بھی خطرناک ہے، بچوں میں کینسر اور آٹزم جیسی بیماریوں کی آسمان کو چھوتی شرح کی وجہ سے مغربی دنیا میں ان کے خلاف بغاوت اور شعور اجاگر کرنے کی طرف رجحان بڑھ گیا ہے۔

لاک ڈاؤن اور خوف ہتھیار ہیں جن کو استعمال کر کے آپ سب کو معاشی اور نفسیاتی طور پر مجبور کیا جا رہا ہے کہ آپ خود اس زہر کو لگوانے کی خواہش کریں۔

یہ ایک ایسی بیماری جس سے دس لاکھ میں دس لوگ بھی نہیں مرتے اس کے لئے پوری دنیا کے سات ارب لوگوں کو ایسا ٹیکا لگایا جا رہا ہے جس کا اب تک جانوروں پر تجربہ ہی نہیں ہوا۔

ویکسین لگوانے والے افراد اور حکومت صرف اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ویکسین لگوانے کے بعد معمولی اثرات سامنے آتے ہیں اور بس، مگر اب تک اس خطرہ کا ذکر نہیں کیا جا رہا کہ اس ویکسین کی وجہ سے کچھ سالوں بعد انسانوں میں کس قسم کی بیماریاں جنم لے سکتی ہیں جس طرح کینسر اور ہیپاٹائٹس سی جیسی بیماریاں کئی برس انسانی جسم میں پلنے کے بعد اچانک ظاہر ہوتی ہیں۔

دنیا کے مستند سائنس دانوں اور ڈاکٹروں کی طویل فہرست ہے جو وارننگ دے رہے ہیں کہ زندگی بچانے کے نام پر لگنے والے اس ٹیکے کو ویکسین کا نام دینا ہی جرم ہے اور یہ ٹیکا خود کچھ عرصہ بعد جان لیوا ثابت ہوگا اور یہ تاریخ کا سب سے بڑا قتل عام اور دھوکا ہے جس میں چند کمپنیاں مالی مفاد کے لالچ میں کچھ خفیہ تنظیموں کے ہاتھ میں استعمال ہو کر دنیا کی آبادی کو کم کرنے کے خفیہ منصوبہ پر کام کر رہی ہیں۔

ہزاروں قابل وکیل اور طبی ماہرین مل کر عالمی عدالت انصاف میں ڈبلیو ایچ او اور اپنی حکومتوں کے خلاف انسانیت کے اس قتل اور تاریخ کے سب سے بڑے دھوکے کا مقدمہ درج کروا رہے ہیں۔

یہ دنیا میں اپنی نوعیت کا پہلا ٹیکا ہے جو کسی کورونا وائرس کے لیے صرف چھ ماہ میں تیار کیا گیا ہے جبکہ آج سے پہلے کورونا وائرسز کی کوئی ویکسین کامیاب نہیں ہوئی اور جانوروں پر تجربات میں جانوروں کی موت ہی سامنے آئی۔

اب سوال یہ ہے کہ اس قدر ہنگامی بنیادوں پر بغیر جانوروں پر ٹیسٹ کئے اس کو انسانوں کے لئے منظور کرنے اور جہاں دوسری تمام ویکسینز کو تیار کرنے میں بیس سے تیس سال لگے وہاں تاریخ کی پہلی کورونا ویکسین چھ ماہ میں تیار کرنے کے پیچھے کیا راز ہے؟

کیا واقعی عالم انسانیت اس قسم کی وبا کا شکار ہے جس قسم کی وبا سے شروع میں میڈیا کے ذریعے ڈرایا گیا اور کھڑے کھڑے لوگوں کو گرتے اور ہسپتالوں کو بھرتے دکھایا گیا؟

پاکستان میں ہر سال دو لاکھ لوگ دل کی بیماریوں، ڈیڈھ لاکھ

ہیپاٹائٹس، پینسٹھ ہزار ٹی بی، ایک لاکھ پچیس ہزار کینسر سے اور حتٰی کہ پچیس ہزار لوگ ٹریفک حادثات میں مرتے ہیں جبکہ کورونا سے اب تک سولہ ہزار اموات ہوئی ہیں اور ان میں بھی زیادہ تر وہ ہیں جو 70 سال سے زیادہ عمر اور پہلے سے مہلک بیماریوں میں مبتلا تھے۔

کیا وبا میں اموات دوسری بیماریوں کے مقابلے میں اتنی کم ہوتی ہیں؟ یہ کیسی وبا ہے جس میں 99.99% لوگ بخار کے بعد ٹھیک ہو جاتے ہیں؟

دنیا بھر میں ویکسین لگنے کے بعد شدید خطرناک مسائل اور اموات سامنے آئی ہیں ان کا ذکر یا اس ویکسین کی حقیقت کے بارے میں کسی سائنسدان یا ڈاکٹر کی رائے کو کسی بھی میڈیا اور سوشل میڈیا پر مکمل سینسر کیوں کیا جا رہا ہے؟

درج زیل صرف UK میں کورونا کے سائیڈ افیکٹس کا شکار ہونے والوں کا ڈیٹا ہے جس میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے.

اس دورِ فتن میں ایسی حکومتوں پر مکمل بھروسہ کرنا اور عقل اور تحقیق سے کام نہ لینا حماقت ہو گی، غریب ملکوں کی حکومتیں عالمی مالیاتی اداروں کی مقروض اور ان کے احکامات پر عمل کرنے پر مجبور ہیں اور ترقیافتہ ممالک کی حکومتیں ویسی ہی عرصے سے دجالی نظام کے تابع ہیں اور اسی لیے ان ممالک میں ہر سال نزلہ زکام تک کی ویکسین لگائی جاتی ہے اور نزلہ کی ویکسین کے باوجود ہر سال وہاں ہزاروں لوگ نزلہ زکام سے موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ویکسین سے بانجھ پن کی افواہیں صرف افواہیں نہیں، اس سے خبردار کرنے والے عام لوگ نہیں بلکہ خود ڈاکٹر ہیں۔ اور قانونی درخواست دائر کی گئی ہے کہ ویکسینیشن فوری طور پر روکی جائے جب تک اس سائنسی نقطے کہ وضاحت نہیں ہوتی جس کے مطابق ان ویکسینز کی وجہ سے انسانوں کے بانجھ ہونے کا بیحد خطرہ موجود ہے۔

اس فراڈ کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ ڈبلیو ایچ او کے مطابق بغیر علامات کے ایک شخص وائرس زدہ ہو سکتا ہے اور پھیلا سکتا ہے جس کی وجہ سے تمام صحتمند لوگوں کے ٹیسٹ اور ماسک پر زور دیا جاتا ہے مگر ویکسین لگانے سے قبل وائرس یا اینٹی باڈیز کا ٹیسٹ کیوں نہیں کیا جاتا کہ اگر وائرس یا اینٹی باڈیز ہوں تو ویکسین نہ لگوائے؟

مسلسل ماسک لگانے سے آپ کے جسم میں آکسیجن کی کمی واقع ہوتی ہے اور اپنا کاربن ڈائی آکسائڈ واپس اندر کھینچتے رہنے سے پھیپھڑوں کے کینسر کا خطرہ جنم لیتا ہے۔ اور ماسک کی وجہ سے بیکٹیریا کا شکار ہو کر آپ بیکٹیریل نمونیا کا شکار ہوتے ہیں۔

جدید سائینسی تحقیق کے مطابق ماسک کے استعمال کا سرے سے کوئی فایدہ نہیں البتہ نقصان زیادہ ہے۔

ہینڈ سینیٹائیزر پر بھی زرا ریسرچ کر لیں، کورونا سے پہلے تک اس کے استعمال کو فائدے سے زیادہ نقصان دہ قرار دیا جا رہا تھا۔ اس میں موجود کیمیکلز neurotoxic صفات کے حامل ہیں اور جلد میں جذب ہو کر خون میں شامل ہوتے ہیں اور انسان کی دماغی صحت پر منفی اثرات مرتب کرتے ہیں۔

اگر آپ حقیقت کی تلاش کے لیے سنجیدہ ہوں تو اس سے کہیں زیادہ حقائق موجود ہیں اور اگر آپ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے ویکسین لگوانا پسند کریں تو آپ کا نصیب۔

آپ کی آسانی کے لیے اہم سائنسی تحقیق اور دنیا بھر سے ویکسین کے بارے سچائی اور معلومات کے لئے چند ویبسائٹ درج ہیں، خود تحقیق کریں، خود کو اور اپنے پیاروں کو بچائیں۔

www.Thehighwire.com

www.Lockdownskeptics.org

www.Brandnewtube.com

www.drtenpenny.com

www.Dolorescahill.com

www.Nomorefakenews.com

- بقیہ -

ہارمونز

لیکن اس کے استعمال سے پیدا شدہ جسمانی اثرات مستقل ہیں اس لیے والدین کو اپنے بچوں سے اس سلسلے میں کھل کر بات کرنی چاہیے۔ چونکہ ہارمونز کا استعمال باقی نشہ آور چیزوں کی طرح زیادہ پرانا نہیں ہے اس لیے اس کے اثرات کی وجہ سے پیدا شدہ طبی بیماریوں کی دیر پائی کے بارے میں مزید تحقیقات ہو رہی ہیں جس کے واضح نتائج سامنے آنے میں دیر لگے گی۔ ایک بات واضح ہے کہ جو مادہ انسانی جسم میں ایک دو سالوں کے اندر اتنی ہلچل مچا سکتا ہے اس سے اچھائی کی امید کرنا عبس ہے۔ والدین کی مدد کے لیے www.dea.gov سے مزید معلومات موجود ہیں۔ اگر کسی والدین کو اس سلسلے میں مزید بات کرنا ہو تو راقم بھی ای میل کے ذریعے رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے۔

tabishkhanzada@msn.com

اچھوتا موضوع انوکھا ناول

ڈاکٹر رؤف خیر
(حیدرآباد، دکن)

ڈاکٹر عبدالصمد کی کسی بھی کتاب، کسی افسانے، کسی ناول یا کسی بھی تحریر کے ساتھ 'ڈاکٹر' لکھا ہوا نہیں ہوتا حالاں کہ آپ ایم اے، پی ایچ ڈی ہیں اور ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہونے کے باوجود اپنے تعارف میں صرف پیشہ درس وتدریس سے وابستہ لکھتے ہیں۔ مجھے اپنی ایک غزل کا شعر یاد آرہا ہے:

عطا ہوئی ہیں بڑی بے نیازیاں اس سے
جو وہ صمد ہے تو عبدالصمد تو ہم بھی ہیں

اللہ الصمد نے اپنے بندے عبدالصمد کو خوب نوازا ہے۔ فکشن کی دنیا میں یہ ایک باوقار نام ہے۔ عوام وخواص میں آپ کی پذیرائی ہوتی ہے اور سرکاری سطح پر ساہتیہ اکادمی، دہلی جیسے مستند ادارے کی طرف سے آپ کے ناول 'دوگز زمین' (مطبوعہ:۱۹۸۸ء) کو ۱۹۹۰ء میں ساہتیہ اکادمی انعام سے سرفراز فرما کر عزت افزائی کی گئی۔ اس کے علاوہ بھارتیہ بھاشا پریشد ایوارڈ ۱۹۹۸ء میں عطا ہوا اور اتر پردیش اور بہار اردو اکادمیوں نے بھی آپ کی کتابوں کو انعامات سے نوازا۔

۱۸ر جولائی ۱۹۵۲ء کو پیدا ہونے والے ڈاکٹر عبدالصمد کا قلم رواں دواں ہے۔ ہمارے علم کے مطابق انھوں نے مختلف موضوعات پر چند دلچسپ ناول لکھے۔ 'دوگز زمین' (ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ ۱۹۸۸ء) 'مہاتما' (۱۹۹۲ء) 'مہاساگر' (۱۹۹۶ء) 'دھمک' (۲۰۰۴ء) 'بکھرے اوراق' (۲۰۱۰ء) 'خوابوں کا سویرا' (۱۹۹۴ء) اور تازہ ترین ناول 'کشکول' (۲۰۲۱ء)۔ ان کے علاوہ 'شکست کی آواز' (۲۰۱۳ء) 'اجالوں کی سیاہی' (۲۰۱۵ء) اور ۲۰۱۱ء میں The Journey of a burning boat

ان ناولوں کے علاوہ آپ کے افسانوں کے مجموعے بھی اہل ذوق سے داد پاتے رہے ہیں۔

'بارہ رنگوں والا کمرہ' (۱۹۸۰ء) 'پس دیوار' (۱۹۸۳ء) 'سیاہ کاغذ کی دھجیاں' (۱۹۹۰ء) 'میوزیکل چیئر' (۱۹۹۶ء)، 'آگ کے اندر راکھ' (۲۰۰۰ء) بہ قلم خود ۲۰۰۶ء۔

فکشن کے علاوہ آپ نے سیاسی و قومی بصیرت بھی دیگر کتابوں میں پیش کی جیسے 'قومی تحریک اور ہندوستانی آئین' (۱۹۸۵ء) اور 'Muslim mind in India'(1995)۔

ان کے علاوہ ڈاکٹر عبدالصمد نے کچھ خاکے بھی لکھے جو 'دل میں رہے مقیم' کے نام سے ۲۰۱۴ء میں منظر عام پر آئے۔ ماہنامہ 'چہارسُو' راولپنڈی پاکستان کے شمارہ جولائی اگست ۲۰۱۶ء میں جناب گلزار جاوید نے ڈاکٹر عبدالصمد کا بھرپور گوشہ شائع کیا، جو تقریباً ساٹھ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

ڈاکٹر عبدالصمد کے ناول اور افسانوں کے مجموعے 'انتساب' کے فوری بعد شروع ہوجاتے ہیں اور جب کسی ناول یا افسانے کا اختتام عمل میں آتا ہے تو قاری ہکا بکا رہ جاتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالصمد کا تازہ ترین ناول 'کشکول' اپنے موضوع ہی سے چونکاتا ہے۔ 'قصہ چہار درویش' کسی پیر کامل کی بیماری کے دوران دل بہلانے کے لیے کہا گیا تھا اور اس کے کردار چہار درویش بجائے خود متمول و تونگر افراد رہے ہیں۔ اور یہ قصہ 'باغ و بہار' زبان و بیان کے جوہر دکھانے کے لیے گھڑا گیا ہے۔ دلی کی زبان اور دلی کے محاوروں کے جواب میں ایک اور داستان 'فسانہ عجائب' وجود میں آئی جس میں لکھنوی زبان کے چٹخارے پیش کیے گئے۔ 'کشکول' کے جو کردار ہیں وہ فی الواقعی بھکاری، معذور و مجبور لوگ ہیں۔ ان میں بعد میں مزدور بھی شامل ہوجاتے ہیں جو بھیک مانگنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ لاک ڈاؤن کے دوران ان بھیک منگوں پر کیا گزرتی ہے اس کی دل ہلا دینے والی روداد اس ناول 'کشکول' کی خصوصیت ہے۔

کورونا کی آفت نے رشتوں کے تقدس کو پامال کر دیا ہے۔ بیٹے بیمار باپ کی صورت دیکھنے کے روادار نہیں اور ماں باپ کی خدمت کے لیے نوکروں کا تقرر کر دیا جاتا ہے۔ دولت مند ٹھیکہ دار نے اپنے بچوں کے لیے دنیا بھر کی دولت مہیا کی، مگر وہی اولاد ایک نوکر شبراتی کو ان کی خدمت پر مامور کر کے بری الذمہ ہوجاتی ہے۔ پھر کورونا کے جراثیم سے بچنے کے نام پر اس کا آنا جانا بھی موقوف کر دیا جاتا ہے اور بے چارہ شبراتی محلے کی مسجد میں خدمتی کے فرائض انجام دینے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ یہ شبراتی برے وقتوں میں اپنے معذور، مجبور بھکاریوں کے لئے ہمدرد خیر خواہ کا رول بھی ادا کرتا ہے۔ دولت مند طبقے کے لوگ صدقہ وخیرات کے ذریعے لاک ڈاؤن میں ثواب بھی کمانا چاہتے ہیں۔ مگر خود آگے بڑھ کر نہیں بلکہ کسی ایجنٹ کے ذریعے۔ شبراتی ان کے لئے ایجنٹ کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ اس طرح وہ اس غریب برادری کے لیے مسیحا بھی ثابت ہوتا ہے جو ایک قبرستان میں پناہ گزیں ہے۔ بھکاری شبراتی کا کھلے دل سے استقبال کرتے ہیں۔ ناول نگار کا کمال یہ ہے کہ 'کشکول' میں عورتوں اور بچوں کی عدم موجودگی محسوس ہی نہیں ہوتی۔ ایک دولت مند بابو صاحب بھی صدقے کی دیگیں بھوکے بھکاریوں تک پہنچانے کے لیے شبراتی کی خدمات حاصل کرتے ہیں، بعد میں کچھ سوشل ورکر بھی شامل ہوجاتے ہیں۔ گورغریباں میں بھکاریوں، معذوروں کو چین سے رہنے بھی نہیں دیا جاتا اور سرکاری عملہ یہ سمجھتا ہے کہ ان کی وجہ سے جراثیم پھیل سکتے ہیں۔ لاک ڈاؤن کی وجہ سے بھکاری بھیک مانگنے کے لیے سڑکوں، محلوں میں جا بھی نہیں سکتے کہ سڑکیں گلیاں ویران اور گھروں کے دروازے اندر سے بند ہیں۔

ڈاکٹر عبدالصمد نے موجودہ مہاماری کی صورت حال بھکاریوں اور

معذوروں کے کرداروں کے ذریعے بڑے موثر انداز میں پیش کی ہے۔ دولت مندوں کے بچے اپنے ماں/باپ کے گزر جانے کے بعد ان کی موت مٹی کے سامان کے لیے بھی ایجنٹوں کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔ ایسے میں ایک بزرگ کے گزر جانے پر راتوں رات ان کے بچے شبراتی کے ذریعے اپنے باپ کی تدفین گورغریباں میں کرواتے ہیں اور تمام بھکاری اس تدفین میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ کچھ ہمدرد انسانوں نے اپنی ایمبولنس اور اپنا دفتر کھول رکھا ہے۔ ایسے ضرورت مند افراد کے رشتے داروں کی تجہیز و تکفین کے لیے باضابطہ سودے بازی کا رویہ اپنایا اور معقول رقم لے کر یہ خدمات انجام دیتے ہیں۔ جان جوکھم کا یہ کام ان کے لیے مالی فائدہ کے ساتھ ثواب دارین کا ذریعہ بھی ثابت ہوتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالصمد نے 'کشکول' میں نہایت سلیقے سے موجودہ قیامت خیز مہاماری میں رشتوں کی پامالی کو بھکاریوں کے کرداروں کے ذریعے پیش کیا ہے۔ غریب مزدور بھی بھکاریوں میں شامل ہوجاتے ہیں تو بیچارے اصلی معذور بھکاریوں کا حق مارا جاتا ہے۔ ان تمام بے یار و مددگار افراد کو سرکاری عملے کے ہاتھوں بھی پریشانیاں اٹھانی پڑتی ہیں۔ ایسی ناگفتہ بہ صورت حال کا ناول نگار نے کامیاب نقشہ کھینچا ہے۔ ڈاکٹر عبدالصمد نے غریبوں بھکاریوں، معذوروں اور مزدوروں کے مسائل کا پرنٹ میڈیا اور سوشل میڈیا کے ذریعہ بھرپور جائزہ لے کر انہیں ناول میں سمو دیا ہے۔ عبدالصمد کے ہاتھ میں سوشل میڈیا 'جامِ جم' سے کم نہ رہا جسے انہوں نے 'کشکول' کا روپ دے کر قارئین کے ہاتھوں میں تھما دیا۔

گورغریباں جیسے قبرستانوں پر بے حس دولت مندوں کے ناجائز قبضوں کے بعد بے سہارا پناہ گزینوں کو وہاں سے بے دخل کئے جانے کی روداد بھی ڈاکٹر عبدالصمد نے بیان کر کے گویا ایسے نام نہاد لیڈروں پر گہرا طنز کیا ہے جو اوقاف کی جائیدادیں حتیٰ کہ قبرستانوں پر بھی ناجائز قبضہ کرنے کو عار نہیں سمجھتے۔

اپنے اپنے گاؤں سے مجبور ہو کر شہروں کا رخ کرنے والے مزدور جب شہروں میں بھوکے مرنے لگے تو واپس اپنے گھروں کو لوٹنے لگے، مگر وہاں ان کے بھائی بندوں نے ان کے گھروں پر ناجائز قبضے کر لئے۔ دنیا کا خون ہی سفید ہو گیا۔ یہی ناول نگار نے دکھایا ہے۔ بے چاری کام والیاں برتن مانجھ کر دو وقت کی روٹی کا انتظام کر لیا کرتی تھیں، انہیں بھی گھروں میں قدم رکھنے سے روک دیا گیا کہ کہیں وہ اپنے ساتھ جراثیم نہ لائیں۔

ڈاکٹر عبدالصمد نے متضاد مناظر بھی 'کشکول' میں پیش کئے۔ جیسے ایک بڑے رئیس راشد صاحب کے بچوں نے مسجد کے موذن کو راشد صاحب کی تیمارداری کے لئے روزانہ پانچ سو روپیوں کے عوض مقرر کر دیا، اور پھر کھانا پینا الگ۔ بے چارا موذن اپنی جان کی پروا کئے بغیر راشد صاحب کی خدمت میں لگا ہوا ہے جو کورونا کے شکار آخری سانسیں لے رہے ہیں۔ وہ ان کے لئے دعائیں بھی کرتا ہے۔ ایسی بیماری سے جوجھتے ہوئے بھی وہ اپنے بچوں کی سلامتی کے لیے دعائیں کرتے ہیں کہ اللہ ان کے بچوں اور پوتوں کو ایسی بیماری سے محفوظ رکھے۔ وہ موذن سے کہتے ہیں کہ انہوں نے بچوں کو آرام و آسائش کی زندگی مہیا کرنے میں رات دن ایک کر دیئے تھے۔ جس کا صلہ ان کے بچوں نے یہ دیا کہ انھیں تنہا کر دیا۔

اس طرح کے واقعات بیان کر کے عبدالصمد نے دنیا کی بے ثباتی پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ایک طرف پڑھے لکھوں کی لاکھوں کی آمدنی جاتی رہی، مزدروں کی مزدوری کے لالے پڑ گئے، قبرستانوں پر ناجائز قبضے اور ان کو مسمار کر کے عمارتیں بنوانے کا نقشہ بھی ناول نگار نے کھینچا ہے۔ بھکاریوں کو یہ طمانیت ہے کہ دولت مند اپنے رشتے داروں کی تدفین میں ہمارے محتاج ہیں کہ ان کا کشکول ہمارے کشکول سے بھی بڑا ہے، مگر دکھائی نہیں دیتا۔

دل و دماغ کو متاثر کرنے والے کشکول کے ٹائٹل پر جو تصویر ہے وہ حیدرآباد کے ایک شاعر کی یاد دلاتی ہے جو ایک اتفاقی صورت ہے۔ کٹورے پر ایک مصرع بھی درج ہے جو باریک بیں کے لئے معنی خیز ہے۔ اس بے پناہ ناول 'کشکول' کے لئے ڈاکٹر عبدالصمد قابل مبارک باد ہیں۔ ادارہ کتاب دار بمبئی نے بڑے اہتمام سے بے عیب کمپوزنگ اور دل کش سرورق کے ساتھ اسے شائع کیا ہے۔

بڑھاپے کی اولاد

آسٹریلوی ریسرچرز نے اپنے تجربات سے ثابت کیا ہے کہ والد کی عمر اولاد کے دماغی اعصاب کی نشوونما پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ان بچوں کے سوچنے، سمجھنے، یاد رکھنے، توجہ مرکوز کرنے اور اعضا کو حرکت دینے سے متعلق مختلف جانچوں سے گزارا گیا۔ کوئز لینڈ یونیورسٹی کے ریسرچ کے نتائج مغربی معاشروں میں رہنے والے ان مردوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے جو تاخیر سے شادی کرتے اور باپ بننے پر اُس وقت آمادہ ہوتے ہیں جب وہ اپنی عمر کی چالیسویں دہائی میں داخل ہو جاتے ہیں اور جو لوگ اس سے زیادہ عمر میں شادی کریں تو نہ صرف اُن کے لیے بلکہ اُن کے ہونے والے بچوں کے لیے کئی طرح کے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ پہلے باپ کے مقابلے میں ماں کی عمر کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی لیکن جدید تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ باپ کی عمر بھی بہت اہمیت کے حامل ہے۔ ریسرچ کے سلسلے تینتیس ہزار بچوں کے آٹھ ماہ، چار سال اور سات سال کی عمر میں ذہانت کے کئی ٹیسٹ لینے کے بعد یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ ماں اور باپ کی عمر کے ساتھ ان کے سماجی و اقتصادی فرق کا بھی بچوں کی ذہنی نشوونما میں اہم کردار ہوتا ہے۔

''تیری غزلوں کا سکّہ''

تصورِ اقبال

(انگ)

''محبت عام کرنا چاہتا ہوں'' ڈاکٹر عمر قیاز قائل کا پہلا اردو شعری مجموعہ ہے جو خالصتاً غزلیات پر مشتمل ہے۔ ابتدا میں بارہ اہلِ علم و دانش و بینش کی بصیرت افروز آرا درج ہیں۔ حمد و نعت کے علاوہ ایک سو سینتیس (۱۳۷) غزلیات اور آخر میں تاثرات کے عنوان تلے مزید چار شخصیات کی آرا درج ہیں۔ پسِ ورق ڈاکٹر نذیر تبسم اور افتخار اویسی قابلِ قدر ہستیوں کی معتبر آرا نے اس مجموعۂ کلام کو اعتبار اور افتخار بخشا ہے جبکہ فلیپ اعتبار ساجد نے تحریر کیا ہے۔ اتنی زیادہ آرا کے ہوتے قائل کی شاعری کو احاطۂ تحریر میں لانا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے پھر بھی حق بہ حق دار کے مصداق اور قرض کی ادائیگی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے چند معروضات قلم بند کیے دیتا ہوں۔ ڈاکٹر عمر قیاز قائل اگرچہ ایک نوجوان سخن ور ہیں اور یہ ان کا نقشِ اول ہے لیکن شعری وابستگی اور اظہار کی بے ساختگی نے اس شاعر کے روشن مستقبل کی راہ ہموار کر دی ہے۔ اردو شاعری بالخصوص غزل یقیناً قائل کا شوق ہے لیکن میری ذاتی رائے میں یہ موصوف کا سفرِ حیات ہے۔ اس سفر میں قائل نے اپنے مشاہدات و تجربات اور محسوسات سے جو کچھ اخذ کیا اُسے اپنے تخلیقی عمل سے گزار کر سنجیدہ قارئین کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ کربِ ذات کے ساتھ ساتھ کربِ کائنات کا عکس قائل کی شاعری میں نمایاں طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ عصری حالات اور عمرانی موضوعات پر گہری نظر رکھتے ہوئے قائل نے زندہ شاعری تخلیق کی ہے۔ سخن شناس اور منتقد حضرات اس جواں فکر لیکن منفرد اور توانا آواز کا یقیناً پاس اور لحاظ کریں گے۔

''محبت عام کرنا چاہتا ہوں'' دعوتِ فکر دینے والے اور دل پر براہِ راست اثر کرنے والے اشعار سے عبارت ایک ایسا شعری مجموعہ ہے جس سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا چند مثالیں پیش کرتا ہوں:

میں جو اس بار ہواؤں کی حمایت کرتا
کون جلتی ہوئی شمعوں کی حفاظت کرتا
کرچی کرچی ہوئے آنکھوں میں سحر کے سپنے
شہرِ ظلمات سے کچھ ایسی سزائیں آئیں
ایسی آلودگی پھیلی ہے مرے شہروں میں
سانس لینا کبھی دشوار نہیں تھا اتنا
آ سکا دل میں اُترنے کا سلیقہ نہ ہمیں
ورنہ ہم بھی تو مسیحا رہے گلفام رہے
سال بھر اُس کی مشقت کا صلہ نانِ جویں
سوچتا رہتا ہے ہر وقت یہ دہقان مرا
یہ کون بھیج رہا ہے غضب ہواؤں میں
پرندے مرنے لگے سب کے سب ہواؤں میں
یہ زمانہ کسی پتھر کا زمانہ تو نہیں
اے خدا کوئی تو انسان دکھائی دیتا
اب ذرا دم لے خدا کے واسطے برقِ تپاں
چُن رہا ہوں تنکا تنکا آشیانے کے لیے

قائل کی غزلیہ شاعری پر گہری نظر ڈالی جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ احساسات و جذبات اور خیالات و تصورات کی لخت لخت کیفیت کو غزل کا روپ دینے کی بھرپور صلاحیت اور اہلیت رکھتے ہیں۔

غمِ دوراں کے ساتھ ساتھ غمِ جاناں ایسے موضوعات بھی قائل کی شاعری میں نمایاں جگہ حاصل کرتے ہیں۔ ہر دو موضوعات کو شدت احساس اور ندرتِ خاص کے ساتھ شعری قالب میں ڈھالا گیا ہے۔ دنیا کی بے ثباتی اور کج ادائی کو ظاہری اور باطنی آنکھ کھول کر دیکھا گیا ہے دورِ حاضر کی سماجی ناہمواریوں کو الفاظ کا جامہ پہنا کر صداقت شعاری اور فرض شناسی کا ثبوت بطورِ خاص پیش کیا گیا ہے گویا انسانی بے بسی اور زمانے کی سفاکی کو انتہائی خوبصورتی اور مہارت سے غزل آشنا کیا گیا ہے۔ سلاست اور روانی کے ساتھ شعریت، مقصدیت اور موسیقیت نے قائل کی شاعری کو اعتبار بخشا ہے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ وہ فرد کی بات نہیں کرتے بلکہ معاشرے کو اپنا ہم نوا بناتے ہیں یعنی کُل کی نمائندگی ان کی شاعری کا اختصاص اور طرۂ امتیاز ہے۔

جمالیاتی حس نے قائل کی غزل کو جہاں حُسن عطا کیا ہے وہیں اسے مزید باوقار بھی بنا دیا ہے یہ اشعار دیکھیے:

بہت دن ہو گئے ہیں شہر میں دیکھا نہیں قائل
دُکھی آواز میں خوشیوں کے جو نغمے سناتا تھا
تتلیوں کی شہر میں پہلے ہوا ایسی نہ تھی
حالتِ گلشن کبھی میرے خدا ایسی نہ تھی
اجنبیت کُو بہ کُو پھیلی ہے سارے شہر میں
اس سے پہلے شہر کی تیرے فضا ایسی نہ تھی
وجہ تسکین ہیں یہی خواب نہ چھینے جائیں
ہم سے جینے کے یہ اسباب نہ چھینے جائیں
میری حیات میں یہ یادگار باقی ہے
کہ تُو نہیں ہے مگر تیرا پیار باقی ہے
ہوائے کرب تُو مجھ کو مٹا نہ پائے گی
میں اپنے عہد کے مزدور کا فسانہ ہوں
کل اچانک مل گیا تھا دل دُکھانے کے لیے
دے گیا پھر اک نشانی یاد آنے کے لیے
یوں اُترتا ہے مرے خواب میں تعبیر کا عکس

جیسے ٹوٹے ہوئے آئینے میں تصویر کا عکس
تُو اپنی سوچ سے مجھ کو جھٹک نہ پائے گا
میں تیرے دل کے نہیں رُوح کے گمان میں ہوں
نہایت مطمئن لگتا تھا وہ یادوں کی محفل میں
کوئی احساسِ محرومی مگر اُس کو ستاتا تھا

الفاظ کا چناؤ، تراکیب کا خوبصورت اور برمحل استعمال اور سے سے بڑھ کر ردیف وقوافی کا حسین امتزاج قائل کی غزل میں مزید دلکشی اور رعنائی پیدا کر دیتا ہے۔ افکار کی سادگی، سلاست وروانی، شستہ بیانی، غنائیت ولطافت، شعر کا حسن اور لطف دوبالا کر رہا ہے۔ بے شبہ قائل نوجوان نسل کا نمائندہ شاعر اور اپنے ہم عصروں کا امام بن کر سامنے آیا ہے۔ ایک ہونہار اور حساس شاعری شعوری اور لاشعوری طور پر جدت اور روایت کو یکجا کر کے تصور اور اظہار بیان کے مراحل بآسانی طے کر لیتا ہے۔ تصنع اور بناوٹ سے یکسر پاک کلام دل پر براہِ راست دستک دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اپنے مخصوص لب ولہجے اور اسلوب کی بدولت قائل آنے والے دور کا ایک کامیاب اور معقول غزل گو ہے۔

غزل رنگ ملاحظہ ہو۔

تروتازہ مہکتا دلنشیں انداز تھا جس کا
اُسی کو ڈھونڈتا ہوں زندگی اعجاز تھا جس کا
چمن میں چارسو خوشبو اُسی کے دم قدم سے تھی
بہاریں معترف جس کی چمن دمساز تھا جس کا
گلہ قائل کریں کیا اُس سے اپنی نامُرادی کا
اُسی سنگیت میں ڈھلنا تھا اُس نے ساز تھا جس کا
نہ جانے آج تلک کیسے امتحان میں ہُوں
میں ایک تیر کی صورت کسی کمان میں ہُوں
زمانے بھر کی بلاؤں کا مجھ کو خوف نہیں
مرے خُدا میں ترے عشق کی امان میں ہُوں
کہاں کہاں سے وہ قائل مجھے مٹائے گا
میں حرف حرف عیاں جس کی داستان میں ہُوں
دل سمندر تھا مگر غم بھی ہوا جیسا تھا
جو بھی لحہ تھا میسر وہ سزا جیسا تھا
اُس کی سانسوں کی حرارت سے خبر ملتی تھی
میرے ماحول میں وہ شخص صدا جیسا تھا
ڈھانپ رکھا تھا سرِ شہر برہنہ اُس نے
جسم سے لپٹا ہوا کوئی قبا جیسا تھا

القصہ ''محبت عام کرنا چاہتا ہوں'' اردو غزلیہ شاعری میں ایک خوبصورت اور باوقار اضافہ ہے۔ ایک شعر قائل صاحب کی نذر:

ہم بھی قائل ہوئے اے عمر دیکھ لے
تیری غزلوں کا سکہ ہمیشہ چلے

Khusro Bagh

On June 7th, 1857 A.D. Maulvi Liaquat Ali, an Indian revolutionary from Allahabad (Prayagraj) liberated Allahabad from the British forces. Liaquat Ali, regarded as one of the earliest leaders in the revolt against the British in 1857 uprising, captured the historic Khusro Bagh (Built in 1599) in Allahabad and declared the independence of India where Khusro Bagh became the headquarters of the Indian revolutionaries under Maulvi Liaquat Ali who took charge as the Governor of liberated Allahabad (7 - 16 June, 1857). However, the uprising was suppressed and Khusro Bagh was retaken by the British within a few days of intense struggle.Maulvi Liaquat Ali escaped from Allahabad after the British forces regained control of Allahabad city and was caught after 14 years in 1871 at Byculla railway station in Mumbai - sentenced to life imprisonment but died in captivity in Rangoon on 17 May 1892.Allahabad museum showcases Maulvi's original dress (Kurta-Pyjama) and his sword in its freedom struggle gallery.

جن کے سینوں میں آگ جلتی ہے

کامل احمر
(نیویارک)

کیا آپ کسی ایسے انسان کو جانتے ہیں جو لڑکپن سے فنون لطیفہ سے لے کر سیاست اور سماجی تحریکوں کا حصہ رہا ہو جس نے دوسروں کے حقوق کے لیے سرعام بھوک ہڑتال کی ہو۔ کالج کی سرگرمیوں میں جیتتا رہا ہو۔ غریب و امیر سے کندھا ملا کر چلا ہو، شاعری میں نظم کے شعبے میں تسلسل سے آمریت پر کاری ضربیں ماری ہوں۔ اور پاداش میں تعلیمی اداروں میں اس پر پابندی لگا دی گئی ہو۔ اور وہ اسی آمریت کے زمانے میں ایک دبنگ طالبعلم لیڈر اور شعلہ بیاں مقرر کی حیثیت سے حیدر آباد کے سینٹرل جیل میں فیض احمد فیض سے ملنے گیا ہو۔ یہ بات کسی کو شاید معلوم نہ ہو لیکن میں اس کے ساتھ تھا۔ جب اس نے چھوٹا سا خیمہ لگا کر سندھی زبان کے لیے بھوک ہڑتال کی تھی۔ ''فیض احمد فیض نے کہا تھا'' شکریہ تم ملنے آئے میں تمہاری شاعری پڑھتا رہا ہوں اور نام بھی سن چکا ہوں۔ بعد میں فیض احمد فیض نے اس کی شاعری پر یہ الفاظ ڈالے تھے۔ ''شرر کی شاعری میں زندگی اور سماج ہیت و ترتیب ایک نئے فکری آہنگ کے ساتھ اُبھری ہے۔'' جی ہاں! اس شخص کا نام یونس شرر ہے۔ وہ ہم سب سے جدا ہو کر ڈھیر ساری یادیں چھوڑ گیا ہے۔ وہ ایک ہی سوچ رکھتا تھا۔ ظلم اور سامراج کے خلاف ساٹھ کی دہائی نے ہمیں سندھ سے دو دیوہیکل ارادوں کے پکے، اپنی سوچ اور فکر کو اپنے خون میں لے کر چلتے تھے۔ دوسرا شخص جام ساقی تھا جو ہاری (کسان) تحریک کا لیڈر تھا اور آخری وقت تک اینٹوں کے بوسیدہ گھر میں رہتا تھا شرر اور ساقی دونوں میرے ہم عصر مالی طور پر کنگال اور بھوک و پیال میں ڈوبے اپنی منزل کی طرف سرکرداں تھے۔ کیا دونوں کو منزل مل گئی جواب ہاں بھی ہے اور نہ بھی چی گوارا جو ڈاکٹر تھا اور مالدار گھرانے کا فرزند تھا اور ایک دن جب وہ اپنے دوست کے ساتھ موٹر سائیکل پر ساؤتھ امریکہ کے غریب ملکوں کی سیر کو نکلا تو اوپسی میں وہ گوریلا لیڈر بن چکا۔ بھوک اور افلاس اور بیماری سے مرتے بچوں کو دیکھ کر اس نے سامراج کے خلاف آواز اٹھائی۔ مارا گیا لیکن زندہ رہ گیا ہمیشہ کے لیے۔ یہ تھی اس کی منزل اور اس کا نام ہی سامراج کے ماتھے پر شرم اور بے حسی کا عکس تھا۔ یونس شرر کے لیے کہوں گا جو فیض احمد فیض نے کہا تھا جن سے وہ حد درجہ متاثر تھا:

مقامِ فیض کوئی راہ میں جچا نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

طالب علمی کے زمانے میں اس نے مباحثوں میں اپنے کالج کے لیے شعلہ بیاں تقاریر کر کے ٹرافیوں کی لائن لگا دی۔ شرر کا ہم عصر قمر علی عباسی تھا اور دونوں کی ٹیم سندھ سے باہر کسی بھی مقابلے میں مخالفوں کے دل و دماغ پر تہلکہ مچا دیتی تھی۔ پھر یونیورسٹی میں دوسرے سال میں شرر کو تحریک کے بانی کی حیثیت سے خمیازہ بھگتنا پڑا لیکن وہ یہاں سے نکل کر کراچی جا پہنچا اور کراچی یونیورسٹی میں اپنی وجاہت اور گفتگو اور شاعری سے سب کی پسند بن بیٹھا۔ سٹوڈنٹ یونین کا انتخاب لڑا اور جنرل سیکرٹری بن بیٹھا۔ اس عہدہ کا فائدہ اٹھا کر اس نے لاتعداد طلبا کو فیض پہنچایا جو فیس دینے کے قابل نہ تھے۔ کراچی میں میری ملاقات ہوئی تو ماضی کا شرر بدلا نہ تھا۔ وہ ہی بے چینی وہ ہی جستجو وہ ہی ہنگامہ خیز زندگی جو لوگ اس دور میں اس کے ساتھ تھے وہ اس وقت کی طالب علمانہ زندگی کو بھولے نہ ہونگے اس کی گواہی صبیحہ صبا اور طاہرہ حسین ہیں۔ شرر نے شاعری کے میدان کو اپنایا تو نام پیدا کیا۔ شاعری میں فیض کا رنگ تھا لیکن احساسات شرر کے اپنے تھے اور ان میں اُمیدیں پنہاں تھیں۔

فصل کھیتوں میں اُگے جسم نہ بیچے جائیں
راکھ کھلیان سے اُٹھے تو وہ گندم بن جائے

اور پھر بڑے اعتماد سے اس نے مٹھی ہوا میں لہرا کر کہا تھا:

ہم سے کھیتوں کھیتوں سونا
ہم سے دریا دریا چاندی
اپنے ہاتھ اٹھیں تو طوفاں
اپنے ہاتھ اٹھیں تو چاندی

اسے خود پر اعتماد تھا، اپنی جدوجہد پر اعتماد تھا اور نوجوانوں پر بھرپور اعتماد تھا کہ اس کی جلائی ہوئی شمع کا وہ پاس رکھیں گے۔ اسے نہیں معلوم کہ یہ در یہ آمریت پھیل رہی ہے۔ وہ زمین میں اپنے پنجے گاڑھ چکی ہے اور اس کے اس یقین کو پاش پاش کر کے دم لے گی۔

جن کے سینوں میں آگ جلتی ہے
زندگی ان کے ساتھ چلتی ہے

زندگی تو اس کے ساتھ چلی لیکن آمریت کے روپ میں سامراج ایسے جیالوں کے سامنے دیوار بن کر کھڑا رہا۔ نتیجے میں ۱۹۸۵ء میں پاکستان کو خیرباد کہہ کر خالی جیب اور بے سروسامان امریکہ میں آ بسا اپنے تین بیٹوں اور اہلیہ کے ساتھ اگلے بیس سال میں اس نے وہ کام کیے کہ لگا وہ کسی جرم کی سزا کاٹ رہا ہو۔ وہ ایک دانشور، رہنما، شاعر، تدریس کے پیشے سے تعلق رکھتا تھا۔ مجھے اس نے اپنی یہاں کی شروع کی زندگی بتائی جب وہ مجھے پندرہ سال پہلے ملا۔ ہم دونوں دوبارہ پارے کی طرح جڑ گئے۔ علمی، ادبی مذاکروں اور دوسری سماجی، معاشرتی تنظیموں میں اپنی پہچان کا دوبارہ اجراء کیا۔ ایک بار پھر سے اجنبی دیس میں اپنے اردگرد ادیب، شاعر اور مختلف تنظیموں کے کارکنان کا دل بن گیا۔ حلقہ ارباب ذوق کی سرپرستی میں کئی بڑے بڑے پروگرام ہوئے۔ وہ بغیر تھکان اور وقفے سے پاکستانی ماحول میں اپنے تئیں کنکریاں پھینک پھینک کر لہریں پیدا کرتا رہتا تھا۔ میرے ساتھ گزرے وقت کو وہ تیرا دوسرا انجم، کا نام دیتا تھا۔ کبھی میں تھک جاتا تو

کہتا ''پیارے جدوجہد کرتے رہو سوچ کو تقویت ملتی ہے۔'' لوگوں کے اردگرد رہو، انسانوں کو جاننا سیکھو گے۔ ہجوم میں تمہارا ہم خیال ملے گا اور مشیر طالب اس بات کا ثبوت تھا۔ ہم دونوں تین ماہ پہلے تک اس سے ملتے تھے پھر اچانک مشیر طالب ہم سے بچھڑ گیا۔ اور میرا جانا رک گیا شرر کی راتیں اور دن ہسپتال کی نذر ہو گئیں۔ یکے بعد دیگرے وہ جان لیوا بیماریوں سے لڑتے لڑتے خاموش ہو گیا۔ میرے لیے وہ تین ماہ پہلے ہی دور کا چکا تھا۔ میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس نے اپنی جدوجہد میں اپنے بچوں اور بیگم کو بھی نظر انداز کیا وہ اپنی روش بدل نہیں سکتا تھا۔ وہ سفر جو اس نے چالیس سال پہلے شروع کیا تھا جاری رکھنا چاہتا تھا اس کے چاہنے والوں کا ہجوم پاکستان، ہندوستان، کناڈا، شمالی امریکہ میں جگہ جگہ تھا۔ آج کے دور میں جہاں مشہور شخصیات کسی تقریب میں آنے کا معاوضہ طلب کرتی ہیں۔ شرر نے اپنی جیب کو خالی رکھا اور ڈھیروں یادیں دے کر چلا گیا۔

اس کی شاعری اس کی خدمات کے صلے ہیں۔ گلزار جاوید نے اپنے ماہنامہ ''چہارسو'' جو راولپنڈی سے شائع ہوتا ہے میں شرر کے نام ایک شمارہ وقف کر کے خراج تحسین پیش کیا ہے۔ ان ساٹھ سالوں میں شرر صرف بیس سال تک گمنام رہا اس کے بعد وہ ہی شب و روز جب ان کی شہریت کا نیویارک میں مقیم پروفیسر ڈاکٹر غیاث الدین فاروقی کو علم ہوا تو انہوں نے ایک ضخیم کتاب شرر اور ان کی زندگی سے جڑے دوسرے کارناموں اور فنونِ لطیفہ سے متعلق ترتیب دی۔ ''صلیب اور سائبان۔ پروفیسر سید یونس شرر'' جس کی تقریب نیویارک کی ادبی فضا میں ہمیشہ یاد رہے گی۔

کراچی کی تہلکہ آمیز زندگی میں وہ بینظیر بھٹو کے دست راست تھے۔ انہیں کچی آبادی کے رہائش پذیر عوام کا شروع سے ہی خیال تھا اور اس میں انہیں کامیابی ملی اور نام کمایا۔ شاعری کے میدان میں ان کا زیادہ کام نظم کے میدان میں ہے جن میں ''صلیب اور سائبان، میں اکیلا تو نہیں، ڈسٹ بن، کارڈیوگرام، کہانی بے خواب راتوں کی، نوشتہ دیوار، دیوار گریہ اور قیمت شگفت'' شاہکار نظمیں ہیں جن پر فیض احمد فیض، ڈاکٹر ابواللیث کیفی اعظمی، جمیل الدین عالی، مشفق خواجہ، حمایت علی شاعر اور محسن بھوپالی ایسے بڑے نقاد، دانشور اور شعراء کے بے لاگ تبصرے ہیں۔

ان کی جملہ خوبیوں کا جائزہ لکھنے کے لیے سینکڑوں صفحات درکار ہیں لیکن جگہ کی قلت مجبوری بنی ہے کہ یونس شرر کا یہ شعر جو انہوں نے اسکول کے زمانے میں کہا تھا رقم کرتے ہیں:

رہیں گے ایسے ہی موت وحیات کے چرچے
کبھی قضا نے کبھی زندگی نے لوٹ لیا

- بقیہ -

ایک پلیٹ بریانی اور ایک کپ کافی

گئی۔ ملاقات کی ابتدا اُسی سرسری انداز میں ہوئی جیسے وہ ملتے آتے تھے مگر رفتہ رفتہ اُن کے ہاتھوں نے ایک دوسرے کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اُس دن جب وہ جدا ہوئے تو اُن کے درمیان پرانی دوری تو ختم نہ ہوئی تھی لیکن کچھ کچھ قربت کا احساس دونوں میں جاگا تھا۔ مرد نے اُس رات پہلی بار نئے سوٹ میں اپنی سلفی عورت کو بھیجی اور عورت نے بھی خوشی کا اظہار کیا۔ اصل میں وہ دن مرد کی سالگرہ کا دن تھا اور اُس کی زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اس نے اپنی سالگرہ اپنی پسند کی عورت کے ساتھ منائی ہو۔

دوسرے یا تیسرے دن کی بات ہے کہ فون پر بات کرتے ہوئے عورت نے کہا کہ وہ تو آنا نہیں چاہتی تھی مگر مرد کے اصرار پر مجبوراً چلی آئی۔ مرد کے دل میں بنا گھروندا ٹوٹ گیا وہ جیسے تعلق کا اظہار سمجھا تھا وہ اپنائیت نہیں مجبوری تھی۔ مجبوری کے تعلق یا رشتے سے اُسے زندگی میں سب سے زیادہ نفرت نہیں رہی تھی۔ اُس نے اپنی حیثیت کے باوجود کبھی کسی کی مجبوری سے فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔ اُسے لگا کہ جس تعلق اور جذبے کو وہ اپنی زندگی کے لیے سب سے اہم اور خوبصورت سمجھتا تھا وہ تو صرف ایک مجبوری تھی ایک سراب تھا۔

میل ملاقات کا سلسلہ جاری رہا۔ مرد یہ فیصلہ کرنے کے باوجود کہ اُسے اس بے معنی تعلق کو ختم کر دینا چاہیے۔ مگر مرد خود کو عورت سے ملنے سے نہ روک سکا۔ عورت نے کئی بار کہا کہ وہ اپنی مرضی سے آئی تھی اور مجبور کرنے کی بات تو اُس نے صرف اپنے دل کو سمجھانے کے لیے کی تھی۔ مگر وہ جو ایک پھانس مرد کے دل میں چبھ گئی تھی نہ نکل سکی، وہ ملتے رہے۔ اُسی پلیٹ اور ایک کپ کافی کے لیے تعلق کو نبھاتے رہے۔

ایک صدی کا قصّہ

کامنی کوشل

دیپک کنول (ممبئی)

جوانی میں ہر کسی سے کوئی نہ کوئی بھول چوک ہو ہی جاتی ہے۔وہ چاہے مرد ہو یا عورت۔ یہ عمر کچھ ایسی پھسلن بھری ہوتی ہے کہ انسان کتنا بھی سنبھل سنبھل کر کیوں نہ چلے کہیں نہ کہیں اُس کا پاؤں پھسل ہی جاتا ہے۔یہی کچھ بمبئی نگری کی ایک مشہور ہیروئن کے ساتھ ہوا جو کہ شادی شدہ تھی ،اُس کا دل ایک نوجوان ہیرو کو دیکھ کے پھسل گیا۔اس ہیروئن کا بھائی فوجی تھا۔جب اُسے اس معاشقے کی بھنک لگی تو اُس کا خون کھول اُٹھا۔اُس نے اپنے ریوالور میں گولیاں بھریں اور وہ بہن کے فلمی سیٹ پر پہنچ گیا۔اُس نے پورے یونٹ کے سامنے اپنی بہن پر ریوالور لہرایا اور اُسے خبردار کیا کہ اگر آج کے بعد اُس نے غلطی سے بھی اس ہیرو سے ملنے کی کوشش کی تو وہ اُسے مار ڈالے گا۔اُس کے بعد اُس نے ہیرو کی طرف اپنا ریوالور گھمایا اور اُسے بھی تنبیہ کی کہ اگر آج کے بعد اُس نے اُس کی بہن کی طرف دیکھا بھی تو وہ اُسے گولی مار دے گا۔سیٹ پر جتنے بھی لوگ تھے سب دم بخود تھے۔اس سنکی فوجی کے تیور دیکھ کر ہر ایک کا خون سوکھ گیا تھا۔وہ نوجوان ہیرو بھی کافی دہشت زدہ تھا۔نتیجہ یہ نکلا کہ اُس ہیرو نے اپنی پریمکا سے دور رہنے میں ہی اپنی بھلائی سمجھی اور اس طرح اس پریم کہانی کا انت ہوا۔

یہ پریم کہانی دلیپ کمار اور کامنی کوشل کی ہے۔کامنی کوشل جس کا اصلی نام اوما کشپ تھا جو 16 جنوری 1927 کو پروفیسر شورام کشپ کے گھر لاہور میں پیدا ہوئی ۔ پروفیسر کشپ یونیورسٹی آف پنجاب اور گورمنٹ کالج لاہور میں بوٹنی کے جانے مانے پروفیسر تھے۔پروفیسر کشپ کو بابائے بوٹینی ہند کہا جاتا ہے۔اُنہوں نے چھ طرح کے پودوں کے بیج ایجاد کئے۔اتنا ہی نہیں۔اُنہوں نے اس موضوع پر پچاس کے قریب کتابیں لکھیں۔وہ تب چھ سال کی تھی جب اُس کے باپ کا انتقال ہوا۔

پروفیسر کے چھ بچے تھے۔دو بیٹے اور چار بیٹیاں۔کامنی کوشل سب سے چھوٹی تھی۔اُس نے اپنی ابتدائی پڑھائی لاہور میں ہی پوری کی۔اُس کے بعد اُس نے کناراڈ کالج لاہور میں داخلہ لیا جہاں اُس نے انگریزی لٹریچر میں بی آنرس کی ڈگری حاصل کی۔وہ بچپن میں لاہور ریڈیو میں اوما کے نام سے بچوں کے پروگرام میں حصہ لیتی تھی۔کالج کے دنوں میں اُس نے کئی ڈراموں میں حصہ لیا۔وہ اشوک کمار کی زبردست مداح تھی۔اپنے ایک انٹرویو میں اُس نے کہا کہ وہ ایک امدادی پروگرام کی تیاریاں کر رہے تھے جس میں اشوک کمار اور لیلا چٹنس مہمان خصوصی کے طور پر شرکت کرنے والے تھے۔جب پروگرام ختم ہوا تو کالج کے لڑکے اور لڑکیاں اشوک کمار سے ملنے پہنچ گئے۔کامنی کوشل بھی پہنچ گئی۔اشوک کمار لڑکوں سے باتیں کرنے لگے جب کہ کامنی کوشل اُس کے پیچھے کھڑی ہو کر اُس کے بال کھینچنے لگی۔

چیتن آنند کی بیوی اوما آنند کامنی کوشل کے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی۔چیتن آنند جو کہ ڈون اسکول میں پڑھاتا تھا، وہ اپنی نوکری چھوڑ کر بمبئی پہنچ گیا اور اپنی پہلی فلم ''نیچا نگر'' کی تیاریوں میں مشغول ہو گیا۔اس فلم کی موسیقی کا ذمہ روی شنکر کو سونپا گیا جو کہ نیا تھا۔زہرہ سہگل کو بھی اس فلم میں شامل کیا گیا۔وہ بھی نئی تھی۔چیتن آنند کو ایک نئی لڑکی کی تلاش تھی۔اوما آنند نے کامنی کوشل کی سفارش کی۔چیتن آنند کامنی کوشل کے بھائی کو اچھی طرح جانتا تھا اس لئے وہ اُس کی معرفت کامنی کوشل تک پہنچ گیا۔کامنی کوشل اُن دنوں لاہور کے کنارڈ وومن کالج میں پڑھائی کرتی تھی۔جب چیتن آنند نے اُسے فلم میں کام کرنے کی پیشکش کی تو اُس نے یہ پیشکش ٹھکرا دی۔اُس نے سنا تھا کہ فلم نگری لڑکیوں کے لئے اچھی جگہ نہیں ہے۔چیتن آنند کامنی کوشل کے انکار سے بڑا مایوس ہوا۔چونکہ کامنی کوشل کا بڑا بھائی اُس کا دوست تھا اُس نے اُس سے دوبارہ رجوع کیا۔بھائی نے کامنی کو سمجھایا کہ وہ اپنے فیصلے پر دوبارہ غور کرے۔بھائی کے سمجھانے پر اُس نے اس فلم میں کام کرنے کے لئے رضامندی ظاہر کی۔چونکہ اس فلم میں اُس کی بیوی اوما آنند بھی کام کر رہی تھی اس لئے چیتن آنند کو دو دو اوماؤں کے نام فلم میں دینا کچھ عجیب سا لگا اس لئے اُس نے فلم مکمل ہونے پر کامنی کوشل سے کہا کہ وہ فلم میں اُسے ایک نئے نام سے متعارف کرنا چاہتا ہے۔کامنی کوشل اس شرط پر راضی ہو گئی کہ اُس کا نام ''کے'' سے شروع ہونا چاہیے۔کے سے لگاؤ کی وجہ اُس کی دو ننھی منی بھانجیاں تھیں جن کا نام کم کم اور کویتا تھا۔چیتن آنند نے اُس کی شرط مان لی اور اس طرح اوما کشپ کامنی کوشل بن گئی۔وہ اس فلم کی شوٹنگ کے لئے لاہور سے بمبئی آتی تھی اور پھر لاہور واپس لوٹ جاتی تھی۔یہ فلم 1946 میں ریلیز ہوئی۔

''نیچا نگر'' کی انٹرنیشنل کامیابی کے باوجود کامنی کوشل کا آگے فلمیں کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔اس سے پہلے کہ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچتی قسمت نے اُس کے ساتھ ایسا کھیل کھیلا جس نے اُس کی زندگی میں طوفان بپا کر دیا۔اُس کی بڑی بہن اوشا جس کی شادی بمبئی پوسٹ ٹرسٹ کے چیف انجینیر برہم ایس سود کے ساتھ ہوئی تھی، ایک کار حادثے میں اُس کی موت ہوئی اور وہ اپنے پیچھے تین اور دو سال کی دو شیر خوار بچیاں کم کم اور کویتا چھوڑ کے چلی گئی۔ کہتے ہیں کہ ماں کے بعد موسی سب سے زیادہ قریب ہوتی ہے۔دو معصوم بچیوں کی زندگی کا سوال تھا اسلئے گھر والوں نے کامنی کوشل سے کہا کہ وہ ان بچیوں کی ذمہ داری قبول کر لے۔کامنی کوشل کنواری تھی اور برہم سود عمر میں اُس سے بڑا تھا تاہم اُس نے گھر والوں کو مایوس نہیں کیا اور وہ اپنی بھانجیوں کی خاطر اس قربانی کے لئے تیار ہوئی۔برہم ایس سود کے ساتھ اُس کی شادی ہوئی اور وہ شادی کے بعد بمبئی

میں رہنے لگی۔سودصاحب کو نیوی کی طرف سے ایک بہت بڑا بنگلہ ملا تھا جس میں وہ اپنے شوہر اور بچیوں کے ساتھ رہنے لگی۔دوشیر خوار بچیوں کو سنبھالنے کے لئے اُس کی ماں بھی اُس کے ساتھ رہنے لگی جو کہ سماجی اصولوں کے منافی تھا کیونکہ کوئی بھی ساس اپنے داماد کے گھر میں رہنا پسند نہیں کرے گی مگر بچیوں کی خاطر اُس نے سارے اصول اور آدرش طاق نسیاں پر رکھ دئے اور وہ برسوں اپنی بیٹی کے ساتھ رہی۔

اُس کے پاس فلموں کی آفرس آرہی تھی مگر وہ کام کرنے کے لئے راضی نہیں تھی۔ایک دن اُس نے اپنے شوہر سے پوچھا کہ کیا وہ فلموں میں کام کر سکتی ہے تو اُس نے اُسے کھلی چھوٹ دے دی۔کامنی کوشل نے کئی فلمیں سائن کیں۔پہلی فلم تھی ''جیل یاترا'' تھی جسے گجانند جاگیر دار ڈائرکٹ کررہے تھے۔ اس کے مدمقابل راج کپور تھا جو اپنے آپ کو دیسی ٹھرا کہتا تھا۔یہ فلم اُس نے 1946 میں سائن کی تھی۔ساتھ ہی اُس نے دواور فلمیں بھی سائن کیں۔1947 میں اُس کی تین فلمیں ریلیز ہوئیں۔''جیل یاترا''''دو بھائی''اور''ضدی''۔''دو بھائی''میں وہ الہاس کے ساتھ تھی۔اس فلم کا سنگیت ایس ڈی برمن نے ترتیب دیا تھا۔اس فلم میں برمن دا نے پہلی بار گیتادت سے ایک گانا گوایا تھا میرا سندر سپنا ٹوٹ گیا، جو کہ بے حد مقبول ہوا تھا۔''جیل یاترا'' کی شوٹنگ کے دوران وہ راج کپور کے ساتھ اسقدر گھل مل گئی کہ اُس نے اُسے اپنی آنے والی فلم ''آگ'' کے لئے سائن کیا۔یہ راج کپور کی ذاتی فلم تھی۔تیسری فلم ''ضدی''تھی جس میں اُس کا ہیرو دیوآنند تھا۔یہ کامنی کوشل کی شروعات تھی۔

فلم ''ضدی'' کا ہدایت کار شاہد لطیف تھا اور رائٹر عصمت چغتائی۔یہ بمبئی ٹاکیز کی فلم تھی جس کے روح رواں ششادھر مکھرجی تھے جو کہ اشوک کمار کے بہنوئی تھے۔یہ وہی مکھرجی تھے جنہوں نے لتا منگیشکر کی آواز کو کامنی کوشل کے لئے غیر موزوں پایا تھا۔اُس نے ماسٹر غلام حیدر سے کہا تھا کہ اس کی آواز پتلی ہے اور یہ آواز نہیں چلے گی۔ماسٹر غلام حیدر نے اُس وقت بڑے اعتماد سے کہا تھا کہ مکھرجی صاحب یہ آواز چلے گی ہی نہیں بلکہ دوڑے گی اور سب پرڈیوسر اس کے پیچھے دوڑیں گے۔ماسٹر غلام حیدر کی یہ پیشن گوئی حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی۔یہ وہی کامنی کوشل تھی جس کے لئے لتا منگیشکر نے ''ضدی'' میں چھ گانے گائے۔کامنی کوشل پہلی ہیروئن تھی جس کے لئے لتا منگیشکر نے پلے بیک کیا تھا۔

1948 سے اُس کا سنہری دور شروع ہوا۔اس سال اُس کی پانچ فلمیں ریلیز ہوئیں۔فلمیں تھیں ''شہید''''پگرے''''ندیا کے پار''''شاعر''اور ''شبنم''۔مزے کی بات یہ ہے کہ ان پانچ فلموں میں تین کا ہیرو دلیپ کمار تھا۔ دلیپ کمار اُس وقت بلندیوں پر تھا۔''پگرے'' کی کاسٹ میں کامنی کوشل کے علاوہ امر، رام اوتار گوپ اور ششی کلا کام کررہے تھے جب کہ ''شاعر'' میں دیوآنند کے ساتھ ثریا اور کامنی کوشل تھی۔دیوآنند کے ساتھ یہ اُس کی دوسری فلم تھی۔اس سے پہلے وہ فلم ''ضدی'' میں اُس کے ساتھ کام کر چکی تھی۔دیوآنند اور ثریا ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو چکے تھے۔وہ پاس ہو کر بھی دور ہوتے تھے کیونکہ سیٹ پر ثریا کی نانی ملک الموت کی طرح کھڑی رہتی تھی۔کامنی کوشل ان دونوں کے لئے پوسٹ مین کا کام کرتی تھی۔وہ ثریا کے محبت نامے دیوآنند تک پہنچاتی تھی اور دیوآنند کے ثریا تک۔اُسے ہمیشہ اس بات کا افسوس رہا کہ دیوآنند اور ثریا ایک نہ ہو سکے۔

دلیپ کمار کے ساتھ وہ پہلی بار فلستان کی فلم ''شہید'' میں کام کررہی تھی۔شوٹنگ کے دوران وہ دلیپ کمار کی اور کھنچتی چلی گئی۔دلیپ کمار کی مدماتی آنکھوں میں جو جادو تھا وہ اُس جادو سے بچ نہ سکی اور دونوں ایک دوسرے کے عشق میں مبتلا ہو گئے۔کامنی کوشل شادی شدہ تھی۔وہ دو بیٹیوں کی ماں تھی۔ان سب چیزوں کے باوجود وہ اپنے دل پر قابو نہ پا سکی۔''شہید'' کی شوٹنگ میں اُن کا پیار پروان چڑھتا گیا۔فلم ریلیز ہوئی تو اس نے کامیابی کے ڈنکے بجادئے۔ایک فلم کی شوٹنگ ختم نہیں ہوتی تھی کہ دوسری فلم کی شوٹنگ شروع ہوتی تھی۔یہ دوسری فلم تھی ''ندیا کے پار''۔وہاں سے چھٹی ہوتی تھی تو تیسری فلم ''شبنم'' کے سیٹ پر ملاقات ہوتی تھی۔دونوں ایک دوسرے کے اس حد تک قریب آگئے جیسے ایک جان دو قالب۔یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا۔دیوانگی کا یہ عالم تھا کہ جب کامنی کوشل جے پی ارورا کی فلم ''پگرے'' کی شوٹنگ میں مصروف ہوتی تھی تو دلیپ کمار اُس سے ملنے کے لئے اُس کے سیٹ پر پہنچ جایا کرتا تھا۔اس فلم کے پرڈیوسر پی این ارورا نے اس بات کی تصدیق کی کہ دلیپ کمار کامنی کوشل سے ملنے کے لئے ہر روز اُس کی فلم کے سیٹ پر پہنچ جایا کرتا تھا۔اپنے زمانے کی مشہور کتھک ڈانسر کا کہنا تھا کہ وہ اُن کی محبت کی راز دار تھی اور اُنہیں تھوڑا وقت ساتھ بتانے کے لئے لوکل ٹرین کے فسٹ کلاس ڈبے میں دھکیل دیتی تھی۔

اس سے پہلے کہ بیل منڈھے چڑھتی، کامنی کوشل کے بڑے بھائی تک کہیں سے یہ خبر پہنچ گئی۔وہ فوجی آدمی تھا۔یہ خبر سن کر اُس کا خون کھول اُٹھا۔ اُس نے اپنا ریوالور لوڈ کیا اور وہ ریوالور جیب میں ڈال کر سیٹ پر پہنچ گیا جہاں دلیپ کمار اور کامنی کوشل فلم ''آرزو'' کی شوٹنگ کررہے تھے۔جب کامنی کوشل کے بھائی نے ریوالور اپنی بہن کی طرف لہرایا تو سیٹ پر کہرام مچ گیا۔ہر کوئی اپنی جان بچانے کے لئے ادھر اُدھر بھاگنے لگا۔کامنی کوشل کے بھائی نے اپنی بہن کو دھمکاتے ہوئے کہا کہ اگر اُسنے اپنی مریادا کی ریکھا پار کرنے کی کوشش کی تو وہ اُسے جان سے مار ڈالے گا۔اُس کے بعد اُس نے دلیپ کمار کی طرف ریوالور گھماتے ہوئے کہا کہ اگر اُس نے دوبارہ اُس کی بہن سے پیار کی پینگیں بڑھانے کی کوشش کی تو وہ اُسے گولی مار دے گا۔دلیپ کمار اتنا ڈر گیا کہ اُس نے پیچھے ہٹنا ہی مناسب سمجھا۔مشہور ادیبہ عصمت چغتائی نے بھی اُسے سمجھایا کہ وہ اس سر پھرے کی بات کو سنجیدگی سے لے۔یہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔فلم ''آرزو'' عصمت چغتائی کے شوہر شاہد لطیف ڈائرکٹ کررہے تھے جب کہ عصمت چغتائی اس فلم کی رائٹر تھیں۔چونکہ فلم ادھوری تھی اسلئے اسے پورا کرنا کامنی کوشل کی ذمہ داری

تھی۔اب وہ سیٹ پر آتی تھی تو اُس کا بھائی سیٹ پر موجود رہتا تھا۔کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ کامنی کوشل کے بھائی کی دھمکی کا کامنی کوشل پر زیادہ اثر نہ ہوا اور وہ برابر دلیپ کمار سے ملتی رہی۔ایک دن کامنی کوشل کے بھائی نے خود کو گولی مار کر خودکشی کرنے کی کوشش کی۔تقدیر سے وہ بچ تو گیا مگر کامنی کوشل اس قدر دہل گئی کہ اُس نے دلیپ کمار سے قطع تعلق کر دیا۔

ایک دن دلیپ کمار نے شاہد لطیف سے کہا کہ وہ کوئی ایسی سبیل نکالے کہ وہ کامنی کوشل سے اکیلے میں بات کر سکے۔اُس کے بھائی کے ہوتے ہوئے یہ ممکن نہیں تھا۔شاہد لطیف نے کافی مغز پچی کے بعد راستہ نکال دیا۔اُس نے ایک ایسا سین لکھوایا جو کہ ایک مینار پر شوٹ کرنا تھا جہاں پر صرف ہیرو ہیروئن ہی بیٹھ سکتے تھے۔اُس نے کیمرہ کرین پر رکھوالیا اور دن بھر کیمرہ مین دھوپ میں جھلستا رہا۔وہ گھنٹوں اکیلے رہے۔اُنہوں نے کیا کیا باتیں کیں، کیا کیا دکھڑے روئے یہ تو وہی جانتے ہیں۔بہرحال یہ اُن کی آخری ملاقات تھی۔آخری ملاقات کے ساتھ یہ اُن کی آخری فلم بھی تھی۔اُس کے بعد اُنہوں نے ساتھ میں کوئی فلم نہیں کی جب کہ اُن کی جوڑی کو فلم بینوں نے بے حد سراہا تھا۔یہ فلم 1950 میں ریلیز ہوئی اور کامیاب رہی۔کامنی کوشل نے ایک بار پھر اپنے پریوار کے لئے اپنے پیار کو قربان کیا۔

دلیپ کمار نے اپنی آپ بیتی میں اس بات کا اعتراف کیا کہ وہ کامنی کوشل سے پیار کرتا تھا اور اُس سے شادی کرنا چاہتا تھا مگر کامنی کوشل اس کے لئے راضی نہیں تھی۔اُس کا کہنا تھا کہ وہ شادی شدہ ہے اور دو بیٹیوں کی ماں ہے۔اگر اُس نے اُن بچیوں سے دغا کی تو وہ کبھی خوش نہیں رہ پائے گی۔وہ اپنی مری ہوئی بہن کے ساتھ وشواس گھات کرے گی۔کامنی کوشل نے بھی اس بات کو مانا کہ وہ دلیپ کمار کو پیار کرتی تھی۔وہ جب تک قریب رہے بہت خوش رہے۔جب وہ الگ ہوئے تو اُسکا دل ضرور ٹوٹا۔یہی تو زندگی ہے۔اُسکے شوہر کو بھی اس بات کا پتہ چل گیا تھا مگر اُس نے اُس کے جذبات کو سمجھا۔وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ اُس نے اُس کے ساتھ شادی کر کے ایک انسانی فریضہ نبھایا۔اس رشتے میں پیار کی آمیزش نہیں تھی بلکہ یہ ایک ایثار تھا، ایسے میں اگر اُس کا دل کہیں پھسلا تو یہ ایک فطری امر تھا۔اُس نے اُس واقعے کو دل و دماغ میں جگہ ہی نہیں دی۔وہ اپنی بیوی سے ایسے پیش آنے لگا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

کامنی کوشل جس نے دس سال کی عمر میں کٹھ پتلیوں کا تھیٹر بنایا تھا، قسمت کے ہاتھوں خود ایک کٹھ پتلی بن کر رہ گئی۔بیس سال کی عمر میں جب وہ فلمی پردہ نمودار ہوئی تھی اُس کی بہن کا انتقال ہوا۔اُس سے کہا گیا کہ وہ اپنے بہنوئی سے شادی کر لے۔اپنی دو بھانجیوں کی خاطر اُس نے اپنے دل میں پل رہے جوانی کے بے شمار خواب اپنے ہاتھوں روند ڈالے اور اپنی بھانجیوں کی بقا کی خاطر اُس نے اپنے آپ کو قربان کر ڈالا۔اُس نے ایک بار نہیں کئی بار قربانی دی۔جب اُس کا دل پھسلا اور وہ دلیپ کمار کے پیار میں مبتلا ہو گئی تو اُس کو ایک بار پھر اپنی محبت کا گلا گھونٹنا پڑا۔اپنے شوہر اور اپنی بھانجیوں کی خاطر۔

''آرزو'' فلم سے ریشمی آواز کے جادوگر طلعت محمود کا جنم ہوا۔اس فلم سے پہلے کامنی کوشل کی تین فلمیں ریلیز ہوئیں تھیں۔یہ فلمیں تھیں ''راکھی'' ''پارس'' اور ''نمونہ''۔''راکھی'' میں اُس کا ہیرو کرن دیوان تھا جب کہ فلم ''پارس'' میں امر اور رام اوتار کے علاوہ اُس کے ساتھ مدھو بالا بھی تھی۔''نمونہ'' میں اُس کا ہیرو دیو آنند تھا جب کہ کشور ساہو بھی ایک اہم کردار میں تھا۔یہ تینوں فلمیں 1949 میں ریلیز ہوئیں۔

کامنی کوشل کا شوہر بہت بڑے دل کا آدمی تھا۔اُس نے کبھی بھی اپنی بیوی پر کوئی پابندی عائد نہیں کی۔دلیپ کمار سے معاشقے کے باوجود اُسے کام کرنے سے روکا نہیں۔وہ ایک کامیاب اور باصلاحیت اداکارہ تھی۔وہ پہلی اداکارہ تھی جس نے انگریزی لٹریچر میں بے اے آنرس کیا تھا۔اُس نے بمبئی میں رہ کے بھارت ناٹیم سیکھا۔اُس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ فلم کے ٹائٹلز میں اُس کا نام ہیرو سے پہلے آتا تھا۔اُس نے فلم انڈسٹری کے تمام ٹاپ کے ہیروں کے ساتھ کام کیا۔دلیپ کمار راج کپور، دیو آنند، راج کمار اور اشوک کمار اُس کے چہیتے ہیرو رہے ہیں۔جس فلم نے اُسے بے پناہ مقبولیت اور عزت بخشی وہ تھی بمل رائے کی فلم ''بیراج بہو''۔یہ فلم شرت چندر چٹوپادھائے کے ناول پر مبنی تھی۔یہ وہی لیکھک تھا جس نے فلم ''دیوداس'' کی کہانی لکھی تھی۔جب بمل رائے نے کامنی کوشل کو ''براج بہو'' کے لئے سائن کیا تو اُس نے اُسے مشورہ دیا کہ وہ پہلے شرت چندر کا ناول پڑھے۔کامنی کوشل نے یہ ناول پڑھا۔اس فلم میں اُس کا کردار ایک سگھڑ بیوی کا تھا اور وہ اس کردار میں ایسے ڈوب گئی کہ اُسے یہ کردار ادا کرنے کے لئے بہترین اداکارہ کا فلم فیئر ایوارڈ ملا۔شوٹنگ کے دوراں وہ کئی بار جذبات سے اسقدر مغلوب ہوئی کہ وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکی اور وہ بچے کی مانند پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔اس فلم نے کناس میں گولڈن پام ایوارڈ جیت لیا۔یہ کامنی کوشل کی سب سے بہترین فلموں میں گنی جاتی ہے۔

کامنی کوشل نے بطور ہیروئن بہت ساری فلموں میں کام کیا جن میں ''جھانجھر'' (1953) ''آبرو'' (1956) ''بڑے سرکار'' (1957) ''جیلر'' (1958) ''نائٹ کلب'' (1958) اور پریم چند کی کہانی پر مبنی فلم ''گئو دان'' (1963) کاروباری اور اداکاری کے لحاظ سے اُس کی کامیاب ترین فلموں میں گنی جاتی ہیں۔''گئو دان'' کے بعد اُس نے پہلی بار فلم ''شہید'' میں کریکٹر رول ادا کیا جسے کافی سراہا گیا۔یہ منوج کمار تھا جس نے اُسے اس فلم میں اُس کی ماں کا رول ادا کرنے کے لئے مشکل سے راضی کر لیا۔وہ تب چالیس کی تھی جب منوج کمار اُس کے پاس یہ پیشکش لے کے آیا۔پہلے تو اُس نے یہ رول کرنے سے انکار کر دیا مگر منوج کمار نے ہار نہیں مانی اور وہ تب تک اُس کے پیچھے لگا رہا جب تک اُسنے حامی نہیں بھری۔فلم ریلیز کیا ہوئی کہ کامنی کوشل کے پاس درجنوں آفر آنے لگے۔وہ ہیروئن کے رول چھوڑ کر ماں اور بھابی کے کردار ادا

کرنے لگی۔اُس نے راجیش کھنہ کی ''دوراستے'' میں اُس کی بھابی کا رول ادا کیا جب کہ ''پریم نگر'' اور ''مہا چور'' میں وہ اُسکی ماں بنی۔ ''وارث'' ''وشواس'' ''یقین'' ''آدمی اور انسان'' ''اُپہار'' ''قید'' ''بھنور'' ''ٹانگے والا'' اور ''ہیرالال پنالال'' میں اُس کی سنجیدہ اداکاری کو خوب سراہا گیا۔اُس نے منوج کمار کی سات فلموں میں اُس کی ماں کے کردار ادا کئے۔ یہ فلمیں تھیں، ''شہید'' ''اُپکار'' ''پورب اور پچھم'' ''سنیاسی'' ''شور'' ''روٹی کپڑا اور مکان'' ''دس نمبری'' اور ''سنتوش''۔فلم ''انہونی'' میں اُس نے ایک منفی کردار اس خوبی سے ادا کیا کہ فلم بین اُسے اس روپ میں دیکھ کے دنگ رہ گئے۔

کامنی کوشل نے دور درشن نیشنل ٹیلی ویژن کے لئے کٹھ پتلیوں کا ایک شو پیش کیا جو ایک سال تک چلا جسے کافی سراہا گیا۔یہ بچوں کے لئے ہندی میں پہلا ایسا شو تھا جو بچوں میں کافی مقبول تھا۔اُس نے اطفال ادب پر بھی طبع آزمائی کی۔اُس کی کہانیاں بچوں کے مشہور ماہنامے ''پراگ'' میں مسلسل چھپتی رہیں۔ان کہانیوں کے تین کردار بنٹی چھوٹا بھائی اور موٹا بھائی جو کہ اُس نے اپنے بیٹوں اور بھتیجے پر مبنی تھے۔اُس نے دور درشن کے لئے ہی ایک اور سیریل بنایا جس کا نام ''چاند ستارے'' تھا۔اُس نے ایک فلم بھی بنائی جس کا نام ''میری پری'' تھا۔ کامنی کوشل نے ہندی پر ہی اکتفا نہیں کیا۔اُس نے برٹش ٹیلی ویژن سیریل "The jewal in the crown" میں بھی کام کیا جو کہ بہت ہی مقبول سیریل تھا۔کوشل نے سٹار پلس کے بہت ہی مقبول سیریل ''شنو کی شادی'' میں ایک اہم کردار ادا کیا۔اُس نے ادھیکاری برادرس کے سیریل ''وقت کی رفتار'' میں بھی کام کیا جو کہ دور درشن سے ٹیلی کاسٹ ہوا۔

کامنی کوشل اس وقت زندگی کے آخری پڑاو سے گزر رہی ہے۔ دلیپ کمار اُس سے چار سال بڑا ہے مگر اُس کی حالت ناگفتہ بے ہے۔چند سال پہلے جب کامنی کوشل دلیپ کمار سے ملی تو اُس نے کامنی کو پہچانا ہی نہیں۔اُس کے اس غیر متوقع برتاؤ سے کامنی کا دل ٹوٹ گیا۔بعد میں اُسے پتا چلا کہ دلیپ کمار الزائمر کے مرض میں مبتلا ہیں۔یہ جان کر کامنی کوشل کو بہت دکھ ہوا اور اُسے وہ دن یاد آئے جب وہ ایک دوسرے کے بنا ایک پل بھی رہ نہیں پاتے تھے۔

2013 کی فلم ''چنئی ایکسپریس'' میں وہ شاہ رخ خان کی دادی بنی تھی۔2019 کی کامیاب فلم ''کبیر سنگھ'' میں بھی وہ شاہد کپور کی دادی ماں بنی تھی۔سلمان خان کی فلم ''ہر دل جو پیار کرے گا'' میں بھی اُس نے ماں کا کردار نبھایا تھا۔''لگا چنری میں داغ'' میں اُس نے ابھیشک بچن اور کنال کپور کی دادی ماں کا رول بخوبی نبھایا۔

کامنی کوشل نے فلمسازی میں بھی ہاتھ آزمائے۔اُس نے دو فلمیں پرڈیوس کیں۔''پونم'' اور ''نائٹ کلب''۔''پونم'' میں اُس کا ہیرو اشوک کمار تھا جب کہ ہدایت کار ایم صادق تھا۔اسے موسیقی سے شنکر جے کشن نے سنوارا تھا۔ دوسری فلم ''نائٹ کلب'' تھی جسمیں اُس نے اشوک کمار کو ہی ترجیح دی تھی۔اس فلم کا ہدایت کار نریش سہگل تھا۔اسے مدن موہن نے اپنی میٹھی دھنوں سے آراستہ کیا تھا۔دونوں فلمیں باکس آفس پر کافی کامیاب رہی تھیں۔اشوک کمار اُس کا پسندیدہ ہیرو تھا۔ایک بار جب وہ بمبئی کے ایک اسپتال میں کسی مریض کو دیکھنے گئی تو اُسے پتا چلا کہ اشوک کمار بیمار ہے اور وہ اسی اسپتال میں زیر علاج ہے۔وہ جب اُس کے کمرے میں پہنچی تو وہاں ہلکا سا اندھیرا تھا۔وہ اُس کے سرہانے کے پاس بیٹھ گئی۔ زبان سے کچھ نہیں بولی بس اُسے دیکھ کر وہ مسکرائی۔چند مہینے بعد اشوک کمار کی بیٹی نے اُسے ایک کاغذ کا ٹکڑا دیا جس پر اشوک کمار نے اپنے ہاتھ سے ایک نوٹ لکھا تھا۔لکھا تھا کہ اُس دن جو تم نے مجھے ایک مسکراہٹ دی تھی اُس مسکراہٹ نے مجھے صحت یاب کر دیا۔

کامنی کوشل تریانوے سال کی ہو چکی ہے۔اُس نے تین بیٹوں کو جنم دیا جو خوشحال زندگی گزار رہے ہیں۔اُس کے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے۔اُس کا ایک بھرا پرا پریوار ہے۔کامنی کوشل نے کئی سارے ایوارڈس حاصل کئے۔وہ اتنی عمر رسیدہ ہونے کے باوجود آج بھی فعال ہے۔زندگی نے اُسے بہت کچھ دیا مگر اُس سے بہت کچھ چھین بھی لیا۔

Remembering

June 1, marks the first death anniversary of Asif Aslam Farrukhi. I was introduced to him in 1994 when we were mobilising resources for the provision of anti-tuberculosis drugs in the Tharparkar region.He was a known name in the realm of Urdu literature and I had read the works of the likes of Sajjad Zaheer and Qurratulain Hyder, which allowed our meeting to transform into friendship.He used to visit Tharparkar every year and facilitated a lot of public health initiatives.The literature festivals he organised with other individuals and institutions extended an opportunity for people like me to meet writers and friends on a periodic basis.Besides, Sheherzade and Dunyazad publications also generated new readers because of the contents he was able to generate as the editor. He had also translated the poetry of Shaikh Ayaz into English, which remains one of his many contributions to regional literature.Asif Aslam Farrukhi was the bridge between literary figures of different languages, and will always be rememberd with fondness

Dr KhataumalMithi, Tharparkar

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وجیہہ الوقار

(راولپنڈی)

برادرم گلزار جاوید صاحب، آداب وتسلیمات۔

تازہ شمارہ موصول ہوا۔'چہارسُو' کے قرطاس اعزاز کے لیے بصمیم قلب آپ کا شکر گزار ہوں۔آپ کی محبتوں اور نوازشوں کا مقروض ہوں۔اس مخصوص شمارے سے مجھے ایک عالمی پہچان ملی ہے۔ہندوپاک کے علاوہ اردو کی نئی بستیوں سے بھی مبارک بادی کے پیغامات موصول ہورہے ہیں۔مجھ سے میری تخلیقات ارسال کرنے کی بھی فرمائشیں کی جارہی ہیں۔یہ سب کچھ برادرم گلزار جاوید صاحب کی بدولت ممکن ہو پایا ہے۔ظاہر ہے یہ سب میرے لیے بڑی اعزاز کی بات ہے۔

رسالے کی پیش کش کے ضمن میں عرض ہے کہ بقول مرزا حامد بیگ (محولہ ٹیلی فونک گفتگو) رسالہ بتدریج خوب سے خوب تر کی جانب تیزی سے گامزن ہے۔سرورق کے رنگوں میں خوشنما اضافہ ہوا ہے۔ظاہر ہے کہ اس کا سہرا'چہارسُو' کی پوری ٹیم کے سر جاتا ہے۔جس میں بینا جاوید، فاری شاہ، محمد انعام الحق، عروب شاہد اور آمنہ علی کی محنت شاقہ بھی شامل ہے۔یہ شمارہ ان معنوں میں بھی خاص ہے کہ کووڈ-19 کے دشوار گزار لمحات میں بھی اس کے مشمولات ایک اعلیٰ معیار کی کسوٹی سے گزر کر ہم تک پہنچے ہیں۔افسانے، نظمیں، مضامین، غزلیں، رپورتاژ اور سفرنامے ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔جی چاہتا ہے کہ سبھی کے امتیازی اوصاف پر بات کی جائے لیکن موقع ومحل کی مناسبت سے چند ایک تخلیقات پر اظہار خیال کرنے کی کوشش کروں گا۔اگر کوئی نام چھوٹ جائے تو اس کے لیے پیشگی معذرت خواہ ہوں۔

گلزار جاوید کے افسانے 'بچو سیٹھ کی باڑی' سے بات شروع کی جائے تو اس کا سب سے نمایاں وصف اس کی پلاٹ سازی ہے جو کہ ایک بڑے کینوس پر تعمیر کیا گیا ہے جس میں اس خوبصورتی کے ساتھ زمان ومکان کی آمیزش کی گئی ہے کہ ہندوستان، پاکستان، اودھ کی تہذیب اور مہاجنی شہر ممبئی کے ناگ پاڑہ اور نیویارک جیسے انتہائی ترقی یافتہ شہر کی طرز حیات اور معاشیات بلکہ معاشقات کو بھی انھوں نے اپنے انتہائی موثر نرینہ بیانیہ کے ذریعہ پیش کر دیا ہے۔اس کا سب سے خوب صورت پہلو یہ ہے کہ افسانے کے ہیرو کے اندر کے انسان کو گلزار جاوید صاحب نے مرنے نہیں دیا جس کی وجہ سے وہ اُس اخلاقی طمانچہ کی ضرب کاری کو کبھی فراموش نہیں کر پاتا ہے اور عمر کے آخری برسوں میں اس بات کی کسک اس کے دل کو کچوکے لگاتی رہتی ہے۔اس افسانے میں ایک ناولٹ کی تمام تر لوازمات موجود ہیں۔لہٰذا، اسے کچھ اور وسعت دے دی جائے تو ایک ناولٹ میں بآسانی تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

دوسرا افسانہ جو مجھے بے حد پسند آیا، وہ ڈاکٹر شکیل احمد خان کا 'عید قرباں سے پہلے' ہے جس میں 13 برس کی ماروی کے اپنے بھائی کے علاج کے لیے ایثار وقربانی پیش کرنے کے سنجیدہ اور عملی جذبے کو سلام بلکہ سارے ہی تھر باسیوں کو میرا سلام کہ وہاں کی عورتیں آج بھی ماروی کی طرح اپنی قربانیاں دینے سے کبھی پیچھے نہیں ہٹتی ہیں۔لیکن مہاجنی اور تیز رفتار شہر کراچی، ان کے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک کرنے میں ایک سیکنڈ کی بھی دیری نہیں کرتا۔سخت جان نائیکہ زینت اُس کی یعنی ماروی کی بہن اور باپ کی ملتمس نظروں کے سامنے جانوروں کی طرح ہاتھوں سے ٹٹول کر اس 13 برس کی بچی کے سڈول پن کا اندازہ لگاتی ہے اور بلوغت سے متعلق اس کے باپ سے جانکاری حاصل کرتی ہے۔جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دولت کے لالچ میں انسان کس حد تک اخلاق سوز حرکتیں کرنے پر مجبور ہوسکتا ہے۔افسانہ نگار نے نائیکہ کے ساتھ قدرت کا انصاف دِکھا کر اس کی زیر علاج بیٹی کی پستانوں میں سرطان بتا کر نائیکہ کو اس کے کیفر کردار تک پہنچانے میں بڑی ہنرمندی اور ذہانت سے کام لیا ہے جو کہ ہم سب کی نظر میں بھی ایک انصاف پسندانہ عمل ٹھہرتا ہے۔

تین افسانے ایسے ہیں جن کے افسانہ نگار ریٹائرمنٹ کے بعد کی روزمرہ کی زندگی کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔یہ محض اتفاق ہوسکتا ہے۔ان میں اصغر ندیم کا 'نوحہ'، رینو بہل کا 'مگر حقیقت ہے!' اور معین الدین عثمانی کا 'ہائے رے یہ مجبوریاں' شامل ہیں۔انسان جو تمام عمر اپنی ناتمام حسرتوں کی پرورش کرتا رہتا ہے وہ حسرتیں کس طرح ریٹائرمنٹ کے بعد جلوہ افروز ہوتی ہیں اور ان کا کہیں 'نوحہ' کیا جاتا ہے، کہیں 'جشن' منایا جاتا ہے اور کہیں دست تأسف مَلنا پڑتا ہے۔ان افسانوں میں موضوعات کو بڑی چابک دستی سے اور تجرباتِ زمانہ کے تلخ حقائق کی بنیاد پر پیش کیا گیا۔رینو بہل نے جس طرح سے بڑھاپے کی تنہائی کے غم کو غلط کرنے کی ترکیب نکالی ہے وہ ہمارے موجودہ سماج کے تناظر میں واقعی ایک انقلابی قدم ہے۔انھوں نے یہ پیغام دیا ہے کہ بچے اگر ماں باپ کی پروا نہیں کرتے اور اپنی زندگی میں مصروف ہوجاتے ہیں تو سنگل پیرینٹ کو بھی یہ حق بنتا ہے کہ وہ Live-in Relation میں زندگی کے بقیہ ایام خوشی خوشی گزاریں۔ان سبھی سینئر افسانہ نگاروں کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر قمر جمالی کا افسانہ 'اضطراب' میرے نزدیک اس لیے غیر معمولی ہے کہ اس میں نسائی رویے کے تحت انسان کے نفسیاتی اور عمرانیاتی مسائل کو بڑی فن کاری سے پیش کیا گیا ہے۔اس میں ذہنی قوتِ پرواز قابل تحسین ہے اور جس طرح کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے، وہ موضوع کے تقاضے کو صد فی صد مطمئن کرتا ہے۔قمر جمالی صاحبہ کو تہنیت پیش کرتا ہوں۔

طاہرہ اقبال نے 'تلاش ابھی ناتمام ہے' میں عشق کی فلسفیانہ جہت پر مختلف واقعات اور حادثات کے ذریعے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور اس عشق

ناتمام کے مختلف النوع بھید کو بڑے موثر ڈھنگ سے طشت از بام کرنے کی بہترین سعی کی ہے۔

فرخندہ شمیم کا 'ماسک' ہمارے معاصر سماج کی عکاسی کرتا ہوا بڑا ہی اسمارٹ افسانہ ہے۔ارشد منیم گاؤں اور قصبوں کی زندگی کی بہترین عکاسی کرتے ہیں۔'الوداع' ایسے ہی ماحول سے جنمے ماں بیٹی کے فطری رشتے پر مبنی موضوع پر لکھا گیا ایک عمدہ افسانہ ہے اور آخر میں محمد علیم اسماعیل کے افسانچے بھی متاثر کرتے ہیں۔

'دُنیا میرے آگے' میں شامل مضامین 'خطرناک کھلونے' اور 'ڈیوڈ میتھیوز، دونوں ہی گراں قدر مضامین ہیں جو اپنے اندر بہت سے حقائق سمیٹے ہوئے ہیں۔تابش خانزادہ اور اشفاق حسین میرے نزدیک بہت ہی محترم المقام ہیں۔پروفیسر میتھیوز کی اردو دانی ہمارے لیے نہ صرف قابل تحسین ہے بلکہ قابل رشک بھی ہے۔

خلیل جبران کی نظم 'جنازے کے جلوس' سے ہمیں عبرت حاصل کرنی چاہیے جسے فیض احمد فیض نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی اردو میں ترجمہ کیا ہوگا۔امجد اسلام امجد کی نظم 'محبت' نے کورونا کے خوف کو کچھ دیر کے لیے زائل کر دیا۔'غریب نامہ' اور 'صورت عیسیٰ'، 'کورونا کرس'، اور 'عید مبارک' وغیرہ بہت متاثر کرتی ہیں۔اُنھیں پڑھ کر لطف اندوز ہونے کا موقع ملا۔

غزلیات کے ضمن میں طائرانہ نگاہ میں جو غزلیں بہت پسند آئیں ان میں سے چند اشعار پیش کیے دیتا ہوں: کلیوں کا تبسم ہو، کہ تم ہو، کہ صبا ہو / اس رات کے سناٹے میں، کوئی تو صدا ہو (پنڈت ہری چند اختر)، مال وزر کے کسی انبار سے کیا لینا ہے / عشق کو گرمیٔ بازار سے کیا لینا ہے (اعتبار ساجد)، میکدے میں نشاطِ رنگ کے بعد / رقصِ آزردگان بھی ہوتا ہے (واصف حسین واصف، امریکہ)، میری بستی کے سبھی لوگوں کو جانے کیا ہوا / دیکھتے رہتے ہیں سارے بولتا کوئی نہیں، ذہن میں پسرا ہوا ہے ریگستان سا / آج کل برسات میں بھی بھیگتا کوئی نہیں (مادھو کوشک، زیرک پور)، صرف کہنے کو رہ گیا ہوں میں / مجھ میں ہو اِس قدر زیادہ تم (خورشید طلب، جمشید پور)۔ان کے علاوہ، کئی اہم شعرا کی غزلیں اس شمارے کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہی ہیں جو یقیناً قابلِ صد داد و تحسین ہیں مگر طوالت کے خدشے سے ان پر اظہارِ خیال ممکن نہیں، تاہم تہہ دل سے انھیں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

اس شمارے میں بہت سارے مواد بکس کے ذریعے بھی جا بجا ہائی لائیٹ کر کے پیش کیے گئے ہیں۔وہ معلومات کے کیپسول معلوم ہوتے ہیں۔گلزار جاوید صاحب کا یہ طریق کار قابل تقلید ہے، جس میں شاید صفحات کی قلت کی وجہ سے مضمون کے جواہر ریزے پیش کر دیئے گئے ہیں جس سے قارئین کے قیمتی وقت کی بھی حفاظت ہوتی ہے۔یعنی آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام والی بات ہوگئی۔

'چہارسُو' کے اس پلیٹ فارم سے استفادہ کرتے ہوئے میں اپنے تمام محسنین کو بصمیمِ قلب ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں جن کی محبت اور نوازش میرے ساتھ نہ ہوتیں تو شاید مجھے دُنیا بھر سے ایسی التفات بھری پذیرائی نہ ملتی۔اس شمارے میں جن معزز ادبا اور ناقدین کی بیش بہا آرا، کسی ناگزیر اسباب کی بنا پر شامل اشاعت نہیں ہو سکی ہیں، میں ان کا بھی صدق دلی سے سپاس گزار ہوں۔میں ایسے سبھی مضامین کو یکجا کر کے عنقریب ایک کتابی شکل میں منظر عام پر لانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

'چہارسُو' کے سب سے زیادہ دل چسپ کالم 'براہِ راست' اور 'رس رابطے' ہیں، جن کا ہم سبھی کو بے صبری سے انتظار رہتا ہے۔

'براہ راست' میں صاحب قرطاسِ اعزاز اور مدیر مسؤل گلزار جاوید کے مابین انتہائی دل چسپ اور معلوماتی گفتگو ہوتی ہے جب کہ 'رس رابطے' میں کھلی چھوٹ ہوتی ہے اور دل کھول کر مصنفین اور قلم کار اپنے احباب اور قارئین پر اپنے انداز سے رسالے کے باریک بین مطالعے سے واقف کراتے ہیں اور پھر اپنے معیاری تبادلۂ خیال کے ذریعے ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں بھی ساتھ نبھاتے ہیں۔اس بار بھی خطوط کا سلسلہ بہت شگفتہ اور دلچسپ رہا ہے۔

مجھے یہ دونوں ہی کالم اس بار بھی بہت پسند آئے۔گرچہ کالم اوّل میں اپنا مقدمہ میں نے خود لڑا ہے اور مجھے اس میں کہاں تک کامیابی ملی ہے، اس کا فیصلہ 'چہارسُو' کے معزز قارئین پر چھوڑتا ہوں۔

پرویز شہریار (دہلی)

گلزار جاوید صاحب، سلام ودعا۔

عرصۂ دراز سے چہارسو سے فیض یاب اور لطف اندوز ہونے کا موقع میسر ہے۔البتہ پرنٹڈ کاپی سے پڑھنے کی جو سہولت اور مزا تھا وہ اب نہیں ہے۔ایک اور وجہ ارذل العمر بھی ہے۔

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ
اب عناصر میں اعتدال کہاں!

سچ تو یہ ہے کہ اب اوّل سے آخر تک حرف بہ حرف پڑھنے کی سکت نہیں رہی لیکن

''چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی''

جی یہی چاہتا ہے کہ ہر تحریر پڑھی جائے مگر ہائے یہ ذہنی وجسمانی بڑھتی ہوئی نقاہت!

اب معمول یہ ہے کہ سب سے پہلے ''براہِ راست'' پڑھتا ہوں پھر صاحب قرطاسِ اعزاز کی تحریر اور اُن کے بارے میں لکھے گئے سب نہیں چنیدہ مضمون۔ناول افسانے سے دلچسپی بہت کم ہوگئی ہے۔شاید دل کی وہ امنگ اور ترنگ نہیں رہی اس لیے افسانے سارے کے سارے اب پڑھنے ممکن نہیں رہے۔البتہ جس شمارے میں آپ کا افسانہ ہوتا ہے تو ''براہِ راست'' سے بھی پہلے وہ پڑھتا ہوں۔جولائی۔اگست کے شمارے میں آپ کا افسانہ ''بچّو سیٹھ کی باڑی'' حسبِ معمول اچھوتا اور منفرد ہے۔غالب نے کہا تھا:

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

غالب سے معذرت کے ساتھ عرض کروں گا:

ہیں اور بھی افسانہ نگار اچھے بہت اچھے
گلزار کا افسانہ مگر سب سے جدا ہے

اللہ رب العزت تادیر آپ کو سلامت رکھے اور آپ اسی طرح اردو ادب کی آبیاری کرتے رہیں۔اس موقع پر اپنے ایک قطعے کا یہ مصرعہ یاد آرہا ہے:

''میں قدر شناس ہوں آپ کا کہ ادب کے آپ ہیں کوہ کن''

حافظ محمد احمد (راولپنڈی)

گلزار صاحب، السلام علیکم۔

چہارسو کا تازہ شمارہ بنام پرویز شہریار نظر نواز ہوا۔پہلی بات یہ کہ اسکی موجودہ شکل کہ ہر صفحے پر رنگوں کی قوس قزح نکھری ہے بہت دل کو لبھاتی ہے، پھر یہ کہ حسب دستور اسکا مواد اس قدر زخیم ہوتا ہے کہ کس کس مضمون یا تخلیق کو پڑھا جائے۔شروع ہی میں ڈاکٹر احمد علی برقی کا منظوم تہنیت ہی اپنی جانب کھینچ لیتا ہے پھر انعام الحق کا ''ستاروں پہ کمند'' پر نظر ڈالنے سے دیکھ کر اندازہ ہوجاتا ہے کہ اردو کے ادبی میدان میں انہوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں وہ ان کو اس میدان کا شہسوار کہلانے میں حق بجانب ہیں۔نہ صرف انہوں نے تخلیقی ادب میں زور آزمائی کی ہے بلکہ علمی میدان میں بھی دہلی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی ہے۔منٹو بیدی اور عصمت پر انکی تحقیق یقیناً قابل تعریف ہے۔براہ راست میں آپکے سولات اور انکے جوابات بہت دلچسپ اور مناسب تھے۔اسی باب میں نوری، نغمہ اور شاہدہ کا ذکر شگفتگی شامل کردیتا ہے۔

فاطمہ تبسم کا مضمون ''چشم حیراں'' چونکا دیتا ہے۔پرویز شہریار کی تخلیقات پر منظر کلیم، ڈاکٹر اختر آزاد اور ڈاکٹر سید احمد قادری کے مضامین متاثر کرتے ہیں۔دیگر مشمولات میں ''ماورائے ازدواج'' میں حقانی القاسمی'' نے بہت دلیر موضوع کو چھیڑا ہے۔اس شمارے میں شہریار صاحب پر لکھے گئے مضامین میں کچھ ایسے بھی نام ہیں جو پہلے سے مشہور ہیں جیسے مشرف عالم ذوقی اور شموئیل احمد، انکی موجودگی میں مجھے اب ان کے فن پر مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

افسانوں میں طاہرہ اقبال، رینو بہل اور فرخندہ شمیم کے نام خود ہی اس بات کی ضمانت ہیں کہ یہ اعلیٰ معیار کی تخلیقات ہیں۔انہی میں ''عید قرباں سے پہلے'' ڈاکٹر شکیل احمد خان کا عصمت فروشی کے پس منظر میں جو افسانہ ہے اسے کئی دفعہ پڑھا اور ہر دفعہ اس غلیظ اور قبیہ مگر قدیم ترین پیشہ کو پڑھتے ہوئے لرز لرز اٹھا چہارسو اپنے دامن میں انتہائی چونکا دینے اور سوچ کو چیلنج دینے والا مواد لئے رکھتا ہے اب اگر اس مرحلے پر آپکے افسانے بچو سیٹھ کی باڑی کا خاص طور پر ذکر نہ کیا جائے تو یہ ناانصافی ہوگی۔بمبئی کی فلمی صنعت کے پس منظر میں منٹو، کرشن چندر اور سعید امرت نے بھی افسانے لکھے ہیں۔آپ نے اس ماحول کا ایسا نقشہ کھینچا اور وہاں کے نچلے طبقے کی جس زبان کا ذکر کیا ہے یعنی کرداروں سے جو زبان بلوائی ہے اس نے مجھے ایسی گرفت میں لیا کہ اس افسانے کو میں ایک ہی نشست میں ختم کئے بغیر نہ رہ سکا۔

شاعری کے حصے کو کم کم پڑھتا ہوں مگر ڈاکٹر ریاض، نسیم سحر، نوید سروش، فیصل عظیم، یوگندر بہل تشنہ اور امجد اسلام امجد سب ہی معتبر نام ہیں۔یہاں میں یہ لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ کئی ماہ بعد اپنے بڑے بھائی سمان ڈاکٹر یوگندر بہل کا نام دیکھ کر میری روح سرشار ہوگئی۔وہ محبت کا ایسا دریا ہے کہ ہر ایک کو شاداب کرتا ہے، میں تو انکی محبت میں شرابور ہوں اللہ ان کو لمبی عمر عطا کرے آمین

رامانند ساگر مانے ہوئے پروڈیوسر اور ڈائریکٹر ہیں۔مقام حیرت ہے کہ بمبئی کی فلمی دنیا میں اس کے قیام سے لیکر آج تک پنجاب کا عمومی اور لاہور کا کس قدر خصوصی کردار ہے۔گیت نگاروں میں ساحر، پریم دھون، راجندر کرشن اور شلندر، راجہ مہدی علی خان، موسیقاروں میں غلام حیدر (نوشاد کے استاد) او پی نیر، خیام، گلوکاروں میں محمد رفیع، شمشاد بیگم، زہرہ بائی امبالے والی، مہندر کپور، ثریا، کامنی کوشل، گیتا بالی، بی آر چوپڑا، کاردار، ایم صادق، دیو آنند اور کتنے ہی۔ میرا اپنا ارادہ ہے کہ اس پر ایک علیحدہ مضمون لکھوں۔

مجھے مشہور شعروں کے خالقین کا حصہ بہت پسند آیا کہ میں بھی انکی تلاش میں رہتا ہوں سوال یہ ہے کہ اس کی صحت کی کیا دلیل ہے۔تابش نے ہمیشہ مقصدی چیزیں لکھی ہیں انکا ''خطرناک کھلونے'' آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہے۔

فیروز عالم (کیلی فورنیا)

میرے گلزار، خوش رہو۔

تازہ چہارسو ملا ایک طرح سے نئی زندگی ملی۔اصولی طور پر صاحب قرطاس اعزاز سے گفتگو کا آغاز ہونا چاہیے مگر میری مجبوری یا خوشی کا عالم یہ ہے کہ میں سب سے پہلے ''بچو سیٹھ کی باڑی'' پر گفتگو کرنا چاہوں گا۔ہمیشہ کی مانند اس بار بھی ترتیب میں تمہارا نام دیکھ کر بے دلی سے کہانی پڑھنا شروع کی مگر جوں جوں آگے بڑھتا گیا رگوں میں دوڑتے خون کی روانی جولانی میں تبدیل ہوتی گئی۔اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ بیماری کے تین سے چار ماہ کے دوران میں دلی اور دماغی طور پر زندگی سے قطعی مایوس ہوچکا تھا مگر تمہاری اس کہانی نے میرا ہاتھ پکڑ کر زندگی کی جانب پھر سے کھینچ لیا ہے۔تم کہانی نہیں لکھتے، ڈرامہ بھی نہیں لکھتے مگر دونوں کا آپس میں اس طرح امتزاج پیدا کرتے ہو کہ پڑھنے والا بچوں کی مانند تمہاری انگلی تھام کر تمہارے قدم سے قدم ملانے پر مجبور ہوجاتا ہے۔خوش رہو آباد رہو اور اسی طرح زندگی سے بھرپور کہانیاں لکھتے رہو۔

پرویز شہریار میرے برخورداروں کی مانند ہے میں بہار سے دہلی میں اُن کی آمد، اٹھان اور اڑان کا چشم دید رہا ہوں۔نہایت نرم خو، مہذب اور ادب و آداب رکھنے والے اس نوجوان میں قدرت نے کچھ ایسی آگ بھر دی ہے جو بھڑکنے کے بجائے سلگ بھی رہی ہے اور پرویز شہریار کو سلگا بھی رہی ہے۔مجھے امید ہے کہ پرویز شہریار کا سفر ابھی اپنے پڑاؤ سے بہت دور ہے اور منزل پر پہنچتے پہنچتے پرویز شہریار کی جھولی اس قدر بار آور ہوجائے گی کہ پڑھنے والے کو خوشی کے ساتھ ورطۂ حیرت میں مبتلا کردے گی۔

افسانے اس بار بہت عمدہ ہیں۔اصغر ندیم سید نے کہانی نہیں لکھی بلکہ حالات کا پوسٹ مارٹم کیا ہے مگر آج کا بے حس معاشرہ اس کا کوئی اثر لے گا یا

اس سے کچھ سبق حاصل کرے گا اس کے بارے کچھ کہنا بہت مشکل ہے۔ طاہرہ اقبال کا وہی اٹھکیلیاں کرتا تیکھا انداز کہانی میں ایسے چرکے لگاتا ہے کہ الامان الحفیظ۔ ''مگر حقیقت ہے'' لکھنے میں رینو بہل نے کچھ دیر کر دی۔ اگر یہی افسانہ وہ ایک دہائی یا اس سے ذرا پہلے لکھتی تو شاید ایک اور کہانی وجود میں آ جاتی مگر مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ زبان و بیان پر بہت زیادہ قدرت نہ رکھنے کے باوجود اس لڑکی نے اردو ادب کو نیا اسلوب اور بہت سی نئی کہانیاں دی ہیں اور آئندہ بھی میں اُس کے قلم سے بہت سے توقعات لگائے بیٹھا ہوں۔

شاعری کے بارے میں کیا کہوں سوائے اس کے کہ چہارسو کا یہ حصہ بھی بہت جاندار ہے اور تمام شعراء خاص طور سے اعتبار ساجد، جاوید زیدی، آفتاب مضطر، انور زاہدی اور ڈاکٹر ریاض احمد کو میری جانب سے مبارکباد پیش کر دیجیے۔

دیپک کنول، تابش خانزادہ اور یعقوب نظامی نے خوب میلہ لگایا ہوا ہے جس کے سبب چہارسو پڑھنے والوں کو اُس کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔

یوگیندر بہل تشنہ (کینیڈا)

گلزار صاحب، السلام علیکم۔

چہارسو کا تازہ ترین شمارہ "پرویز شہریار نمبر" نظر سے گزرا - اس سے پہلے والا شمارہ "محمد حمید شاہد نمبر" بھی دیکھا تھا مگر کچھ ایسی مصروفیات میں گھرا ہوا تھا کہ اپنی رائے نہیں بھیج سکا تھا - آپ کی یہ کاوش قابل ستائش ہے کہ آپ ہندو پاکستان دونوں طرف کے ادیبوں پر خاص نمبر نکال کر دونوں ممالک کے قلمکاروں کو ایک دوسرے سے متعارف کرا رہے ہیں - پرویز شہریار کو میں نے نہیں پڑھا تھا اور نہ ہی ان سے کبھی ملاقات ہوئی ہے - لیکن چہارسو کے توسط سے میں انہیں یوں جان گیا جیسے برسوں کی ملاقات ہو - رسالے میں شایع شدہ ایک تصویر میں وہ ڈاکٹر ستیہ پال آنند اور جناب ابوالحسن نغمی کے ساتھ نظر آئے - میں نغمی صاحب کے پروگراموں میں اکثر و بیشتر جینیا جاتا رہتا ہوں اور ان دونوں بزرگوں سے ملاقات بھی ہوتی ہے - کاش کبھی ایسا ہو کہ میں جاؤں اور وہ آئیں -

پرویز شہریار ایک تجربہ کار اور نباض ادیب معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے افسانے آج کل کے حالات کی عکاسی کرتے ہیں۔ خاص نمبر میں شائع شدہ افسانہ ''دس سروں والا بجوکا'' بہت پسند آیا۔ دونوں افسانچے بھی زندگی سے بھرپور ہیں۔ پرویز شہریار کی کتابوں ''بڑے شہر کا خواب'' اور ''شجر ممنوعہ کی چاہ میں'' کے مطلق ناقدوں کی آرا پڑھنے کے بعد ان کتابوں کو پڑھنے کا اشتیاق بڑھ گیا ہے۔

جمیل عثمان (کیلی فورنیا)

محترم گلزار جاوید صاحب، سلام مسنون

چہارسو کا پرویز شہریار نمبر ملا۔ شکریہ۔ اِن دنوں جبکہ ادیبوں کی دنیا میں بھی موت کا خوف پسرا ہوا ہے، آپ 'چہارسُو' کے منفرد گوشوں کے ذریعے ادب کی دنیا میں زندگی کی رمق بھر رہے ہیں۔ آپ کے انٹرویو کسی ادیب کی شخصیت کو ایک خوبصورت اور بامعنی اسکیچ کی طرح پیش کرتے ہیں۔ پرویز شہریار کا انٹرویو پڑھا - اچھا لگا۔ یقیناً آپ کے سولات کا بڑی خوبی سے جواب دیا گیا ہے۔ مشمولات میں شامل کن کن باتوں کا ذکر کروں۔ مجموعی طور پر یہ شمارہ بھی سابقہ شماروں کی طرح اہم، معیاری اور قابلِ مطالعہ ہے۔ 'چہارسو' میں مطبوعہ انٹرویو کا مجموعہ ''مقابل ہے آئینہ''، بے مثال ہے۔ اس میں شمولیت میرے لیے نعمت ہے۔ میں ان خوش نصیبوں میں سے ہوں جنھیں 'چہارسُو' نے اردو کی سرزمین پر عزت بخشی ہے۔

دعا ہے، اس معتبر رسالے کی خوبیوں بھری زندگی سلامت رہے۔

صادقہ نواب سحر (کھوپولی ممبئی، مہاراشٹر)

جناب گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

چہارسو کا تازہ شمارہ جولائی، اگست ۲۰۲۱ء ہاتھ میں ہے۔ آن لائن ہونے کی بنا پر خوبصورت رنگوں کی آمیزش سے اس کا انگ انگ دمکتا ہوا لگتا ہے۔ میں پہلے بھی معترف تھا اور حیران بھی کہ آپ بحرِ ادب کے کتنے بڑے غواص ہیں۔ آپ کی بینائی اور مہارت سے ششدر ہوں کہ ایسے آبدار موتی آپ کی نظر سے بچ نہیں پاتے۔ جناب پرویز شہریار صاحب ہندوستان کے ایک بڑے قلمکار اور جگمگاتے ستارے ہیں پر ان کا کام قلیل مطالعے کی بناء پر میری نگاہوں سے اوجھل تھا۔ جس خوبی سے آپ نے انہیں تفصیلاً متعارف کرایا ہے آپ ہی کا خاصہ ہے۔ چہارسو میں سب سے پہلے براہِ راست پڑھتا ہوں اور عش عش کر اُٹھتا ہوں۔ ''روبرو ہے آئینہ'' میں ایسے تمام انٹرویوز یکجا ہیں۔ یہ عمدہ کام ہے میں دلی طور پر معترف ہوں۔

پورے شمارے میں ہر ذرہ اپنی جگہ آفتاب ہے اور نگاہوں کو خیرہ کیے چلا جاتا ہے جس کے لیے آپ اور آپ کی معاونت کرنے والے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ میرے لیے فرداً فرداً تعریف باعث طوالت ہوگی۔

حصہ شعری ادب بہت خوب ہے۔ خلیل جبران کا فیضؔ صاحب کا ترجمہ پہلی بار نظروں سے گزرا ہے۔ امجد اسلام امجد صاحب کی نظم قندِ مکرر کے طور پر مزہ دے گئی۔ دیگر شعراء بھی خوب ہیں۔ اللہ کرے ان کا زورِ سخن اور زیادہ!

اس بار افسانوں میں خصوصاً جناب اصغر ندیم سید کا ''نوحہ'' ڈاکٹر شکیل احمد کا ''عید قرباں سے پہلے'' اور آپ کا تحریر کردہ ''بچّو سیٹھ کی باڑی'' بہت پسند آئے۔ جناب اصغر ندیم سید کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ ڈاکٹر شکیل احمد صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں۔ حوا کی بیٹیوں کے ساتھ آج بھی جو ہو رہا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ دولت کے بل بوتے پر نوخیز کلیوں کے سودے اب بھی جاری ہیں۔ نجانے انسانیت کب شرمائے گی۔ انجام دل دہلا دینے والا ہے۔ وسیع کینوس کے باوجود آپ کی گرفت بچّو سیٹھ کی باڑی پر قابل ستائش ہے۔ کہانی قدرے طویل ہونے کے باوجود قاری کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے اور اسے ختم کیے بغیر چین نہیں آتا۔ بہت دنوں کے بعد ایک اچھی کہانی پڑھنے کو ملی ہے۔ اللہ آپ اور آپ کے رفقاء کے حوصلوں کو سدا جوان رکھے تاکہ ہم سے لوگوں کی ادبی تشنگی کا سامان ہوتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالباری (کراچی)

برادرِمحترم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

تازہ چہارسو وہی آن بان اور سج دھج کے ساتھ موصول ہوا تو دل ودماغ کے غنچے لہلہا اُٹھے۔ شکریہ ادا کرنا تو بدذوقی کے زمرے میں شمار ہوگا البتہ آپ اور آپ کے رفقائے کار کی اعلیٰ ذوقی کو خراج نہ پیش کرنا صریحاً زیادتی ہو گی۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی آپ نے نہایت نابغہ روزگار محترم پرویز شہریار سے نہ صرف متعارف کرایا بلکہ اُن کی شخصیت کے ایسے گوشے بھی منظرِ عام پر لے آئے جو اس سے پہلے قاری کی نظر سے کسی قدر راوجھل تھے۔ ماشاءاللہ ڈاکٹر صاحب کا بہت وسیع اور دقیق کام ہے۔ آپ نے بھی عرق ریزی سے سوال نامہ ترتیب دیا جن کے جوابات کے ساتھ ڈاکٹر صاحب نے ایک مہذب اور مؤدب شخص کی طرح ہر وہ بات بتلا دی جو آپ دریافت کرنا چاہتے تھے۔ آپ کی محنت اور خلوص کا بہت شکریہ۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزا دے اور آپ کا مقام بلند کرے۔ آمین

پروفیسر وسیم احمد (اسلام آباد)

محترمی و مکرمی جاوید بھائی، السلام علیکم۔

چہارسو کا تازہ شمارہ شہریار پرویز نمبر باصرہ نواز ہوا۔ میں تو آپ کی تخلیقی صفات کے ساتھ ادارتی خوبیوں کی بھی دل سے قائل ہوں۔ اور چہارسو کو دل نشیں انداز میں آپ نے پیش کیا ہے اس میں شائع تخلیقات شخصیات کی خوشبو چہار سو بکھری ہوئی ہے۔ اس شمارے میں ہندوستان کے نوجوان افسانہ نگار پرویز شہریار کی زندگی اور ان کے فن کے رموز و نکات سے آپ نے روبرو کرایا۔ اس کے ساتھ یہ عہدِ حاضر اور بالخصوص اکیسویں صدی کے ایک حساس اور سرزمین پنجاب کی مردم خیز زمین مالیرکوٹلہ کے نوجوان ارشد منیم کی کہانی الوداع کا مطالعہ کیا ایک زمان و مکان کی قید سے آزاد رشتوں کی ڈور بندھی جذبات احساسات کے تانے بانے سے بنی ہوئی ایسی کہانی جو کبھی بھی پرانی نہیں ہوگی کیونکہ انسان زندگی، رشتے شادی بیاہ موت خوشی وغم حیات انسانی کے وہ عناصر ہیں جن سے فرار ممکن نہیں انسان کی زندگی کا محور ہیں۔ اس کہانی میں ماں کی جدائی کے غم کی جو تصویر ایک بیٹی کی شکل میں پیش کی گئی ہے قاری کے دل پر اثر کرتی ہے ارشد کے اکثر افسانے قاری کو رلا دیتے ہیں۔ بہت حقیقت کی سچی تصویر مگر افسانے کے فریم میں سجی ہوئی۔

ڈاکٹر کہکشاں عرفان (الہ آباد)

گلزار جاوید صاحب، تسلیمات۔

ڈاکٹر پرویز شہریار اور گلزار جاوید صاحبان کی پوری ٹیم کو اتنا وقیع اور بامعنی شمارے کی اشاعت پر دلی مبارک باد۔۔۔ ڈاکٹر پرویز شہریار نے تخلیقی ریاضت کی وجہ سے افسانہ اور نثری نظم کے میدان میں تخلیقی ثروت مندی اور فنی دسترس کا ثبوت دیا ہے۔۔ ان کی تخلیقی تحریریں برصغیر ہندو پاک کے علاوہ اردو کی مغربی بستیوں میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔۔ ان کے افسانے ہوں یا نظمیں دونوں میں زندگی سے براہ راست مکالمہ نظر آتا ہے۔۔ زندگی کی کربناکیوں اور دشواریوں کو انھوں نے فنی ہنرمندی کے ساتھ تخلیقی پیرہن عطا کیا ہے۔۔۔ ابھی حال فی الحال میں انگریزی نظموں کا ایک عالمی انتخاب منظرِ عام پر آیا تھا جس میں شہریار صاحب کی ایک نظم شامل تھی۔۔ چہارسو کے اس خصوصی شمارے کے لیے شہریار صاحب کو ایک بار پھر مبارک باد۔۔۔

سلمان عبدالصمد (دہلی)

محترمی گلزار جاوید، تسلیمات۔

ہر بار کی طرح اس بار بھی چہارسو کا تازہ شمارہ ملا تو طبیعت باغ باغ ہوگئی۔ شمارہ حسب سابق انتہائی خوبصورت اور دیدہ زیب ہے۔ ڈاکٹر پرویز شہریار صاحب سے تعارف بہت دلچسپ رہا اور ڈاکٹر صاحب کی تخلیقات کے علاوہ اُن کی بابت لکھے گئے مکالات میں بھی ڈاکٹر صاحب کی شخصیت وفن پر روشنی ڈالنے کے علاوہ بہت سے نئے معاملات کو آشکار کیا۔ اہلِ قلم نے افسانوں سے لے کر شاعری تک ہر صنف ادب میں رنگارنگ پھول نچھاور کیے۔ کرونا کے اس ماحول میں ادب کی خدمت کرنا بہت بڑی بات ہے۔ مبارک باد۔

یعقوب نظامی (بریڈفورڈ)

محترم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

''چہارسو'' شمارہ جولائی اگست ۲۰۲۱ء ڈاکٹر پرویز شہریار سے منسوب ہے جو افسانہ نگاری، شاعری، تحقیق و تنقید کے میدانوں میں گذشتہ تین دہائیوں سے مصروفِ عمل ہیں۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں مرد اور عورت کے درمیان جنسی تعلقات کی مختلف جہات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اس کے علاوہ سماجی ظلم وستم کے موضوعات پر بھی بڑے موثر انداز میں آواز بلند کی ہے۔ ''براہِ راست'' میں ان سے آپ کا مکالمہ نہایت دلچسپ، معلوماتی اور پڑھنے کی چیز ہے۔

شمارہ میں اچھے افسانے، مضامین اور شاعری شامل کی گئی ہے۔ آپ کا افسانہ ''منجُو سیٹھ کی باڑی'' بہت عمدہ اور دلچسپ تحریر ہے جو آخر تک قاری کو گرفت میں رکھتی ہے۔ کہانی غیر متوقع اور اچانک اختتام پذیر ہوتی ہے بلاشبہ کبھی کبھار ایسی صورت حال دیکھنے میں آتی ہے کہ ایک انسان کسی راہ پر چلتے چلتے اچانک اور غیر متوقع طور پر اپنا راستہ بدل لیتا ہے۔ رینو بہل کا افسانہ ''مگر حقیقت ہے'' بہت تلخ کہانی ہے جس میں بوڑھے والدین اولاد کی شادی کے کچھ عرصہ بعد بے رخی اور دل دکھانے والے رویہ کے باعث مجبوراً تنگ آ کر اپنا راستہ الگ کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کاش یہ خود غرض اولاد بوڑھے والدین کے احساسات کو محسوس کرتی اور اس آخری عمر میں ان کے احسانات کا بدلہ چکا سکتی۔ معین الدین عثمانی کا افسانہ ''ہائے رے یہ مجبوریاں'' ملازمت سے ریٹائر ہو جانے کے بعد لوگوں کو درپیش آنے والی صورت حال کا منظرنامہ ہے جبکہ اہلِ خانہ اور دفتر کے سابق ساتھی بھی اپنا رویہ تبدیل کر دیتے ہیں جس کی انہیں کبھی توقع نہیں ہوتی۔ ملازمت یا دیگر سیاسی عہدوں سے سبکدوش ہونے والوں کے لیے بہتر ہے کہ وہ پہلے سے اپنا ذہن بنالیں کہ وہ اختیارات کے حوالے سے پہلے جیسے نہیں رہے اور آئندہ کے لیے وقت گزارنے (Time Management) کا بہتر پروگرام بنالیں۔

''نوحہ'' اصغر ندیم سید کی عمدہ تحریر ہے جس میں موجودہ نظامِ تعلیم اور معاشرہ پر اس کے منفی اثرات پر بڑی خوبصورتی سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ قمر جمالی کا

افسانہ ''اضطراب'' پیار کے باہمی رشتہ کے حوالے سے شوہر اور بیوی کے جذباتی تعلق اور بچھڑنے کا دردناک منظرنامہ ہے جو دل اداس کر دیتا ہے۔ ''عید قربان سے پہلے'' ڈاکٹر شکیل احمد خان کا افسانہ غربت اور افلاس کے ہاتھوں مجبور لوگوں کی دکھوں بھری زندگی اور ظالم سماج کے ہاتھوں ان کی مجبوریوں کا ناجائزہ فائدہ اٹھانے کی دکھ بھری داستان ہے۔

شاعری میں عمدہ کلام شامل کیا گیا ہے۔ اس کامیاب کاوش کے نتیجہ میں ''چہارسو'' کے باقاعدہ اجراء پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر ریاض احمد (پشاور)

جناب گلزار جاوید، السلام علیکم۔

پرویز شہر یار نمبر پڑھا اور چہارسو کے مدیر اور معاون مدیران کو مبارکباد کہ حسب معمول مکمل پرچہ رنگ اور روشنی اور معلومات سے بھرا ہوا۔ گلزار شاعری سب سے پہلے پڑھی کہ اسی کے حوالے سے ہی ایک زندہ دل ادیب سے تعارف ہوا۔ ستاروں پہ کمند کے ذریعے ان کی تعلیم اور ادبی سرگرمیوں سے آگہی ہوئی اور پھر براہِ راست تو ہے ہی ان خوبصورت سوالوں کا سلسلہ جو کسی کی شخصیت سے براہِ راست آگہی پیدا کرتا ہے۔ بے حد عالم فاضل، پڑھے لکھے شائستہ انسان، بے حد منفرد تعارف کے ساتھ ان کی شخصیت سے آپ نے آگہی کرائی۔ شکریہ کہ ان اچھے افسانہ نگاروں سے یوں آگہی ہو جاتی ہے آپ کی وساطت سے۔ پرویز شہر یار کے دو افسانے پڑھے ''خاموش'' اور ''دس سروں والا بجوکا'' اعلیٰ اور معیاری افسانے۔ معاشرے کے ہر دور ہر ملک میں ہونے والے تعاصب کی خاموش تصویر نظر آئی اور ساتھ ہی بجوکا واقعی مسکرا رہا ہے کہ ہر جگہ یہی حالات ہیں۔

رینو بہل کا افسانہ ''مگر حقیقت ہے'' آج کے دور کی شرمناک حقیقت کی تصویر کی صورت میں خوبصورت افسانہ۔ ''عید قرباں سے پہلے'' ایک حساس جذباتی لڑکی کی کہانی پسند آئی۔ معین الدین عثمانی ''ہائے رے مجبوریاں'' بہت اچھا افسانہ۔ ایک حساس ریٹائرڈ شخص ایسا ہی ہو جاتا ہے خاص طور سے اگر گھر والے اس کے جذبات نہ سمجھیں۔ ارشد منیم کا ''الوداع'' بوڑھے محبت کرنے والوں کے جذبات اور ماں بیٹی کے رشتے کی ترجمانی بہت خوبصورتی سے کی۔ گلزار جاوید کا افسانہ ''منجو سیٹھ کی باڑی'' سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ وقت تو آگے بڑھ جاتا ہے لوگ غلطیاں کر کے بھی خوش رہتے ہیں اگر ترقی کے مواقع مل جائیں مگر قدرت کبھی ایسا وار کرتی ہے کہ ماضی آپ کی خودغرضی کا راز فاش کر کے آپ کو سونے نہیں دیتا۔ اسی کو شاید کہا جاتا ہے ''مکافاتِ عمل'' ان کے لکھنے کا انداز بے حد منفرد ہے۔ بہت اچھا افسانہ۔ اسی طرح لکھتے رہیے اور معاشرہ کے مجبور کردار بے نقاب کرتے رہیے۔ محمد علیم اسماعیل نے ''افسانچے'' بڑے دلچسپ لکھے ہیں چار جملوں میں پوری کہانی۔

ایک صدی کا قصہ ہمیشہ بے حد دلچسپ اور ہمارے جانے پہچانے لوگوں کی سچی زندگی پر ہوتا ہے اس لیے شروع سے آخر تک دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ افسانے یقیناً سب ہی اچھے ہوں گے ابھی تک اتنے ہی پڑھے اس لیے تبصرہ لکھ دیا۔

عبدالرحمٰن عبد کا Corona Curse پسند آیا۔ ''لوگ ہیں نا'' ہیما جین نے اچھا لکھا۔ رمضان کے مہینے کی خوبصورت تصویر نزہت شاہ اور اشہر اشرف نے پیش کی۔ واصف حسین واصف کی غزل پسند آئی۔ جتنا مواد آپ کے چہارسو میں ہوتا ہے اس پر لکھنے کے لیے کئی صفحات چاہیے اس لیے یہیں اکتفا کرتی ہوں تا کہ اوروں کو بھی جگہ ملے۔ شکریہ تمام لکھنے والوں کا اپنے قلم سے ہم کو معلومات فراہم کرتے ہیں۔

رعنا کوثر (نیویارک)

جناب گلزار جاوید، آداب۔

تازہ شمارہ بروقت نکالنے کے لیے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

پرویز شہر یار جتنے اچھے ادیب ہیں اُتنے ہی نفیس شخصیت کے مالک بھی۔ اُن کے افسانے، اُن کی نظمیں (اردو اور انگریزی) میں گاہے بہ گاہے پڑھنے کو ملتی رہتی ہیں۔ بدلتے حالات پر اُن کی پکڑ اچھی ہے جو اُن کے افسانوں میں دلچسپ انداز میں بیاں ہوتی ہے جو قاری کو لطف اندوز تو کرتی ہے ساتھ میں سوچنے کو مجبور بھی کرتی ہے۔ ''براہِ راست'' میں آپ کے سوالات حسب معمول انفرادی بھی تھے، تحقیقی بھی اور دلچسپ بھی۔ پرویز صاحب نے بھی جواب پوری دیانتداری سے دیے ہیں۔ سوالنامے میں پرویز صاحب کی پوری زندگی سمیٹ کر رکھ دی ہے۔

افسانوں کی بابت بات کریں تو اصغر ندیم سید کا ''نوحہ'' سرکاری نظام پر اچھا طنز ہے۔ تلاش ابھی نا تمام میں طاہرہ صاحبہ نے عشق کی اقسام اور اُس کے نفسیاتی پہلو پر اچھی کہانی لکھی ہے۔ عشق کی تلاش میں انسان کہاں کہاں سے گزرتا ہے۔ ڈاکٹر شکیل احمد کا ''عید قرباں سے پہلے'' دردناک حقیقت کی عکاسی کرتا ہے۔ غربت، والدین کی مجبوری اور لڑکیوں کی بے بسی کی کہانی دل کو رنجیدہ کر گئی۔ قمر جمالی صاحبہ کا افسانہ ''اضطراب'' شاید ہر اُس عورت کے جذبات کو بیاں کرتی ہے جو محبت کرنے والے شوہر کو کھو دیتی ہے۔ درد اور جذبات سے لبریز کہانی دل کو چھو گئی۔ فرخندہ شمیم کی کہانی ''ماسک'' کورونا کے حالات کی عکاسی کرتی ہے تو ارشد منیم کا ''الوداع'' والدین سے بچھڑنے کی تفصیل ہے۔ گلزار جاوید کی ''منجو سیٹھ کی باڑی'' اک الگ ہی طرز کی کہانی ہے۔ کہانی کو ایسے بیان کیا گیا ہے کہ قاری اُسے پڑھتا نہیں بلکہ آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ سپنوں کی نگری میں اپنے خوابوں کی تعبیر کے لیے نوجوانوں کو کن کن مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے اس کی عکاسی دلچسپ انداز میں کی ہے۔ کہانی کا اختتام دل کو چھو گیا۔ کہانی نے اپنے سحر میں جکڑ لیا۔

شاعری کی طرف آئیں تو امجد اسلام امجد کی نظم پڑھ کر طبیعت خوش ہو گئی۔ شاعری کا باقی حصہ بھی قابل ستائش ہے۔ یوگیندر بہل تشنہ، ڈاکٹر ریاض احمد، نوید سروش، تصور اقبال، نعیم کوثر نے تو حسب معمول اپنی حاضری بھر دی مگر پروین شیر کی غیر حاضری اچھی نہیں لگی۔ خلیل جبران کی ترجمہ کی گئی نظم بھی نایاب ہے۔

فلرز میں ''نیوتا، دوسری شادی، رمضان کا مہینہ'' دلچسپ ہیں تو غیر معروف شعراء کے معروف اشعار دلچسپ ہونے کے ساتھ نایاب بھی ہیں۔ غالب کے خط کا ذکر کرنا بھی لازمی ہے۔ فلرز آپ کہاں سے ڈھونڈ کر لاتے ہو؟

ایک صدی کا قصہ اور باقی کے کچھ مضامین کا مطالعہ ابھی جاری ہے۔ ایک اور کامیاب شمارہ نکالنے کے لیے بہت بہت مبارک۔ پرماتما آپ کو صحت اور ہمت عطا کرے اور آپ اسی طرح نایاب تحفے ہمیں دیتے رہیں۔

رینو بہل (چندی گڑھ)

محترم گلزار جاوید، آداب اور سلام۔

اس شمارے نے پرویز شہریار صاحب سے ملاقات کروائی جس کے لیے آپ کا شکریہ۔ ان کے مضمون اور ایک سوال کے جواب میں عصمت اور منٹو کے ہاں عورت کے تصوّر کا تقابل دلچسپ تھا۔ اس سے مجھے پروفیسر عمر میمن کا ایک لیکچر یاد آ گیا جو انھوں نے ٹورانٹو میں دیا تھا اور اس میں طوائف کے ساتھ تحریر میں اور تحریر سے باہر منٹو کے رویّے کا تقابل کرتے ہوئے کچھ چبھتی ہوئی باتیں کی تھیں جن میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ منٹو کے ہاں وہ عورت عموماً اپنے حال سے شاکی نظر نہیں آتی، یہا ایک اور فرق ہوسکتا ہے منٹو اور عصمت کی عورت میں۔ افسانے اس بار زیادہ اچھے لگے جیسے طاہرہ اقبال کا ''تلاش ابھی نا تمام ہے'' جس کا موضوع اگر منفرد نہیں تو بہت عام بھی نہیں تھا۔ رینو بہل کا ''مگر حقیقت ہے'' بے آرام کرتی ایسی کہانی ہے جس سے نظر بچانا ممکن نہیں۔ ڈاکٹر شکیل احمد خاں کا ''عید قرباں سے پہلے'' اور محمد علیم اسماعیل کا افسانچہ ''قاتل کون'' اچھا تھا۔ پنڈت ہری چند اختر اور اعتبار ساجد کی غزلیں کیا خوب ہیں، شاہین صاحب آفتاب مضطر، نوید سروش اور خورشید طلب کے اشعار اور ڈاکٹر انیس الرحمٰن کی ''جنگ مسلّط کیوں کرتے ہو'' اچھی نظم ہے۔ مگر یہ ہیما جین کی ایک تحریر نظم (شاعری) کے زمرے میں چھپ گئی جو محلِ نظر ہے۔ تابش خانزادہ کا ''خطرناک کھلونے'' بہت عمدہ اور معلوماتی مضمون ہے۔ پرتوِ اسد کے نام سے جو خط نما چھپا ہے، اسے بڑی مہارت سے کورونا سے جوڑا گیا ہے، اس کے مصنف جو بھی ہیں، انھیں داد۔ مجھے دعاؤں میں یاد رکھیے۔

فیصل عظیم (کینیڈا)

محترم گلزار جاوید، السلام علیکم۔

''چہارسو کا انتظار رہتا ہے اور اس انتظار نے کبھی مایوس نہیں کیا۔ ڈاکٹر پرویز شہریار کا گوشہ پڑھ کر لطف آ گیا۔ ''براہِ راست'' میں آپ کے انتہائی سنجیدہ سوالات اور پرویز صاحب کے صاف گوئی سے تفصیلی جوابات، تصوف، جنس، محبت، عصری سماج کے نباض، فکری معنویت وغیرہ پر کھل کر بحث، منٹو اور عصمت چغتائی سے متاثر ہیں اس لیے اُن کے اسلوب اور خاصی حد تک موضوعات میں بھی یہ بات نمایاں ہے۔ شموئل احمد کا مضمون ''پرویز شہریار کے افسانے'' اور ''پرویز شہریار کی کہانیوں'' مشرف عالم ذوقی دونوں لاجواب تحریریں ہیں جن سے پرویز صاحب کے افسانوں کی تفہیم پورے پس منظر کے ساتھ ہمارے سامنے آتی ہے۔ پرویز صاحب کی تخلیقات میں کلاسیک رچاؤ ہے وہ باخبر ادیب ہیں پڑھ کر مزا آ گیا ہے۔ ڈاکٹر سعادت سعید صاحب نے اُن کے فن پر خوب لکھا ہے۔ محمد انعام الحق نے سوانحی تعارف اور ادبی کارگزاری کو سلیقے سے ترتیب دیا ہے۔ ڈاکٹر سید احمد قادری نے افسانوں کے حوالوں کے ساتھ فکری تجزیہ کیا ہے۔ بہت خوب۔ زبردست گوشہ۔

اعتبار ساجد، نسیم سحر، اشرف جاوید، ڈاکٹر ریاض احمد، انیس الرحمان، ڈاکٹر عمر قیاز، تصور اقبال، تسنیم کوثر اور مسقط ندیم کی غزلوں کے اشعار میں ایک اپنائیت اور نیا پن ہے۔

اشفاق حسین نے مغرب میں اردو کے صادقِ عاشق ڈیوڈ میتھوز کی شخصیت اور زبان وادب کی خدمات کی جھلکیاں دکھائی ہیں۔ اردو زبان وادب کا ایک بڑا نقصان ہے۔ دیپک کنول نے اپنے خاص انداز سے رامانند ساگر کی زندگی میں کامیابیوں کی داستان بیان خوب کی ہے۔

محترمہ طاہرہ اقبال کا افسانہ ''تلاش ابھی نا تمام ہے'' ایک زبردست افسانہ ہے ایک مشکل موضوع پر تکنیکی اور فنّی طور پر مضبوط کہانی ہے۔ جس میں محبت، پسند، دوستی، شک، نظریات کو ہم آہنگی سے پیش کیا ہے۔ یہ خواتین کے حقوق کی بات کا زمانہ بلکہ فیشن ہے مگر اس افسانے میں ایک مضبوط کردار مرد کو پیش کیا ہے جو اپنی خانگی اور ازدواجی زندگی بچانے کے لیے ہر جتن کرتا ہے طاہرہ اقبال کا یہ بالکل منفرد افسانہ ہے۔ آپ کا ''بچّو سیٹھ کی باڑی'' کیا منفرد افسانہ ہے بیک وقت دو کہانیاں جن کی کیفیات ایک مگر ایک حقیقی اور ایک فلمی۔ آپ نے حالات اور ماحول کی خوب عکاسی کی ہے۔ ''ثمینہ'' کا کردار یاد رہ جانے والا ہے میں اس کردار کے دکھ کے ساتھ خاصی دیر رہا۔ رینو بہل کا افسانہ ''مگر حقیقت ہے'' اپنی گرفت میں لینے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے اُن کے ہاں کہانی موجود رہتی ہے۔ ارشد منیم کے افسانے نے بھی متاثر کیا۔ محمد علیم اسماعیل کے افسانچے معاشرے کی بے عملی پر گہرے طنز کرتے نظر آتے ہیں۔ ''پھول، پودے اور پانی'' خاموش اور رضا مندی سے گناہ۔ ''حل'' اور ''قاتل کون'' ایک لمحۂ فکریہ ہیں۔ ''خوشی اور غم'' میں اہلِ قلم کی منافقت پیش کی ہے۔

وجیہہ الوقار محنت اور سلیقے سے احباب سے محبت کے رابطے سجا رہے ہیں۔

نوید سروش (میرپور خاص)

''مجھ سے محبت ہے''

تم کہتے ہو تمہیں بارش بہت پسند ہے۔ مگر تم بارش میں چھتری لیے چلتے ہو۔ تم کہتے ہو تمہیں سورج سے محبت ہے مگر تم اسکی چمک میں سائے کی پناہ لیتے ہو۔ تم کہتے ہو تمہیں ہوا سے پیار ہے مگر جب وہ چلتی ہے تو تم کھڑکیاں بند کر لیتے ہو۔ اسی لیے میں خوفزدہ ہوں، ڈر جاتا ہوں جب تم کہتے ہو کہ تمہیں مُجھ سے محبت ہے۔

باب مارلے

...... شرابُور سائے ......

''شرابورسائے'' کا شاعرانتظار باقی وسیع کائنات میں پھیلے ہوئے دلفریب منظروں سے حسن ومحبت کا امرت رَس کشید کرنے والاقلم کار ہے۔اس کی شاعری کے نقشِ اوّل میں مناظرِ فطرت کی دل آویزی کے ساتھ ساتھ اس کا سماجی وتہذیبی شعور بھی بلندیوں پرنظر آتا ہے۔اس کے ہاں سب سے اہم خصوصیت ترسیلِ فکر کی خاطر معیارِفن کو پیشِ نظر رکھنا ہے۔اس کے کلام میں شوخی اور رجائیت کے مضامین بھی ملتے ہیں اور زمانۂ حال کے ایک متفکراور پریشان حال فرد کی مانند کسی حد تک یاسیت بھی۔باقی کی غزل لذّتِ احساس کے ساتھ مکمل جمالیاتی اوصاف کی آئینہ دار ہے اور اس میں تغزّل،ترنم،غنائیت کے علاوہ قلبی وذہنی آسودگی کا عنصر بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔

''شرابورسائے'' کے شاعر کی ڈکشن پر مکمل اور بھرپور گرفت ہے اور معانی کو من پسند طریقے سے برتنے کی مہارت اسے اپنے عہد کا ایک اہم غزل گوشاعر ثابت کررہی ہے۔

انتظار باقی کا کلام پڑھتے ہوئے ایک دل بہار سرشاری طاری ہوجاتی ہے اور یوں قاری اس کی شاعری کو ساحری ماننے پر تیار ہوجاتا ہے۔

مجھے قوی امید ہے کہ اہل ادب اس کتاب کوسراہنے میں پیش پیش ہوں گے۔

آپ کی ضیافت طبع کے لیے اُن کے کلام سے منتخب غزل:

اشک زنداں میں ہوتا ہے جو محصور میاں — جلنے لگتا ہے مرے قلب کا تنّور میاں
راز پا سکتا نہیں کوئی کبھی بھی میرا — میرے ہونے کی حقیقت ہے بہت دُور میاں
یہ جو پیڑوں پہ معلق ہے نجانے کیا ہے؟ — کوئی پتا ہے سرِ شاخ یا منصور میاں
دھوپ کا راج ہے اور جسم سلگتا ہے مرا — میرا سایہ ہے پسینے سے شرابور میاں
کوستے کیوں ہو بھلا پاؤں کے ان چھالوں کو — آبلہ پائی مسافت کا ہے دستور میاں
اک قدم تک بھی اُٹھا سکتا نہیں مرضی سے — میرا ہم زاد ہے نگرانی پہ مامور میاں
سہمی سہمی ہیں صدائیں بھی سبھی قدموں کی — بے زبانی ہے ترے شہر کا دستور میاں
دیکھ کر وقت کے چہرے پہ جمی شکنوں کو — آئنہ کرب کی شدت سے ہوا چُور میاں
پاؤں ٹکتے ہی نہیں ان کے زمیں پر باقی! — مل کے آئے ہیں کسی سے وہ سرِطور میاں

...... عطاالحق قاسمی

چہارسو
راولپنڈی
میرے افسانے
بہتے پانی
پہ تصویر
شاعری
صرف ایک آنسو!
معاشرے کی روداد
Jawahar Publications